جنٹل مین اللہ اللہ

اشفاق حسین

جنٹل مین اللہ اللہ!

کرنل اشفاق حسین

ادارہ مطبوعات سلیمانی

رحمان مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور ۵۴۰۰۰

فون: ۷۲۳۲۷۸۸

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر: عروہ وحید سلیمانی
طبع ہشتم: ۱۱۰۰ مئی ۲۰۰۱
مطبع: اے۔این۔اے پرنٹرز
قیمت: -/۱۲۰ روپے

ترتیب

دیباچہ 5
ذرا سعودی عرب تک 9
مالش۔بکرا۔یلا 17
حیرتوں کے باب 25
منزل ہائے فکر و شوق 44
فرصت کے مشغلے 55
بلاوے کی تدبیر 65
رب کا میلہ 85
جانب بطحا 112
نجران۔تاریخ کا بحران 122
فسانہ عاد و سبا 138
ربع الخالی۔سفر در سفر 156
ریاض اور درعیہ۔آل سعودی کے اہم سنگ میل 177
تیل کی کہانی 198
جگمگاتے شہر اور عبرت کی بستیاں 204

دیباچہ

"جنٹلمین اللہ اللہ" ایک طرح سے ہم نے کمرہ امتحان میں بیٹھ کر لکھی۔ جیسے کمرہ امتحان میں کوئی نگران باآواز بلند اعلان کرتا ہے "آدھا وقت گذر چکا ہے" ------- "آدھ گھنٹہ باقی ہے۔" ------- "دس منٹ رہ گئے ہیں۔" -------- "آخری پانچ منٹ" --------- "سٹاپ رائٹنگ" کچھ اسی طرح کی واردات ہمارے ساتھ ہوئی۔

کتاب لکھنے کا آغاز تو یوں ہوا کہ ماہنامہ "رابطہ" کے مدیر عبدالسلام سلامی بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ ہم سے کچھ نہ کچھ لکھوانے پر اصرار کرتے رہے۔ جب فرصت میسر آئی تو یہ سوچ کر کہ "رابطہ" زیادہ تر بیرون پاکستان پڑھا جاتا ہے' یہ فیصلہ کیا کہ بیرون ملک سفر کے تاثرات ہی قلمبند کئے جائیں کہ ان میں بہت سے افراد کو اپنے تجربات کی جھلک نظر آئے گی۔ ایک دو قسطیں ماہنامہ "رابطہ" میں شائع بھی ہوئیں لیکن پھر ان کی مجلس ادارت کسی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکی۔ یوں یہ رابطہ تو منقطع ہو گیا البتہ دوستوں اور قارئین کی طرف سے اصرار جاری رہا کہ یہ کتاب جلد از جلد مکمل کی جائے۔ لکھنے لکھانے کے لئے فرصت شرط اولین ہے جو گذشتہ برسوں میں بالکل مفقود رہی۔ تین سال پہلے ہم نے ایک ماہ کی چھٹی لی اور ان چھٹیوں میں پانچ چار باب لکھ ڈالے۔ اس کے بعد پھر یہ سلسلہ ادھورا پڑا رہا۔ دوستوں کی فرمائشیں طعنوں میں بدل گئیں۔

"آپ کرتے کیا رہتے ہیں۔ کتاب لکھیں"۔

ایک فہمائش بھرا سلسلہ خط و کتابت بھی سامنے آیا۔ ایک گمنام قاری کی طرف سے ایک خوبصورت کارڈ وصول ہوا "ہم کب تک آپ کی دستاویزی فلموں پر گذارا کرتے رہیں۔ آپ کے قارئین کا بھی آپ پر حق ہے۔ نئی کتاب لکھیں ورنہ...... خط لکھ لکھ کر آپ کا ناک میں دم کر دیں گے۔ اٹلی میں انعام حاصل کرنے پر مبارک"۔

انٹر سروسز پبلک ریلیشنز ڈائریکٹوریٹ میں رہتے ہوئے ہم نے مختلف دستاویزی فلموں کے سکرپٹ تحریر کئے تھے۔ یہ فلمیں ٹی وی پر دکھائی جاتی رہیں' ایسی ہی ایک فلم کو اٹلی میں

ہونے والے ایک بین الاقوامی میلے میں خصوصی انعام ملا جس کا چرچا اخبارات میں بھی ہوا۔ اس خط میں اسی طرف اشارہ ہے۔

پھر عید پر ایک اور کارڈ آیا۔ پھر وہی مطالبہ "کہاں ہے جی کتاب؟" لکھنے والے نے اپنا کوئی اتہ پتہ تحریر نہ کیا تھا ورنہ بتاتے کہ کتاب لکھنا چنے بھوننے کا عمل نہیں ہے کہ دہکتی بھٹی پر چڑھی کڑاہی کی گرم ریت میں کڑچھا ماریں۔ ریت کو الگ کریں اور چنے، چاہنے والوں کی جھولی میں ڈال دیں۔

انھی دنوں لاہور سے ایک خاتون آئیں، صغیرہ بانو شیریں۔ ان کا فون آیا۔

"مجھے عبدالوحید سلیمانی صاحب نے بھیجا ہے"۔

"پھر؟"۔

"کتاب کا مسودہ مکمل ہو گیا ہو تو مجھے دے دیں۔ سلیمانی صاحب نے منگوایا ہے"۔

"مکمل نہ ہوا ہو تو؟"۔

"میں کل تک اسلام آباد میں ہوں۔ مکمل کر دیں۔ میں ساتھ لے جاؤں گی"۔

ہم نے کہا "بی بی! اسلام آباد خوبصورت شہر ہے۔ اس کی آب و ہوا ذہنی صحت کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ آپ چار چھ مہینے تو رہیں۔" لیکن وہ دوسرے دن واقعی چلی گئیں۔

کچھ دنوں بعد عبدالوحید سلیمانی خود بھی راولپنڈی آدھمکے۔ انداز یہی تھا "سٹاپ رائٹنگ۔ پرچہ ہمارے حوالے کرو۔" بڑی مشکلوں سے انہیں سمجھا بجھا کر اس وعدے پر رخصت کیا کہ جلد از جلد کتاب مکمل کر دی جائے گی۔

ہماری پوسٹنگ بہاولپور ہو چکی تھی۔ جون کے آغاز میں یہاں پہنچے تو دوستوں اور خیر خواہوں کی فرمائشیں ہمارے تعاقب میں تھیں جن کے احترام میں خود پر یہ پابندی عائد کر لی کہ دفتر کے علاوہ ہم کہیں آئیں جائیں گے نہیں۔ زیادہ سے زیادہ میس جاتے یا ایک گھنٹے کے لئے جاگنگ اور ایکسر سائز کرتے ---- الحمد للہ کہ یہ پابندیاں رنگ لائیں۔ اور ہم یہ کتاب مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہمارا قطعاً ارادہ نہیں تھا کہ اس کتاب میں حج کے تاثرات بھی شامل کیے جائیں لیکن

ہمارے پبلشر سلیمانی صاحب اصرار کرتے رہے کہ حج کے تاثرات کے بغیر تو یہ سفرنامہ ادھورا رہے گا۔ حج کے دوران ہر انسان پر چند لمحات ایسے ضرور وارد ہوتے ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ یہی لمحات تو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ ہم ان لمحات کو اپنے اور خدا کے درمیان ہی رکھنا چاہتے تھے۔ فاش کرنے میں خدشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں خواہش نام و نمود انہیں ضائع نہ کر دے۔ انسان کمزور ہے اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا وہ کب خدا پرستی کی بات کرتے کرتے خود پرستی پر اتر آئے۔

ہم سلیمانی صاحب کو جانتے ہیں بزنس کے آدمی ہیں۔ ان کی یقیناً پورے خلوص سے یہ توقع ہو گی کہ اس تحریر کی اشاعت سے شاید کسی دل میں اللہ کی چاہت، قربت کی خواہش، حج کی تمنا جاگ اٹھے۔ ہزاروں قارئین میں سے ایک آدھ آدمی بھی ایسا نکل آیا تو ان کے تو وارے نیارے لیکن خطرہ تو ہمیں تھا۔ چند لمحوں کی تھوڑی سی پونجی۔ وہ بھی داؤ پر لگانی پڑ رہی تھی۔

اس ذہنی کشمکش کے ساتھ ایک دن ہم کرنل ابدال بیلا کی معیت میں جناب ممتاز مفتی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان سے پوچھا۔

"کوئی کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو۔ جب وہ خدا کے گھر جاتا ہے تو اسے عرفان کے چند لمحے میسر آتے ہیں نا"۔

"ہاں! یہ اعزاز صرف گنہ گاروں کے لئے ہی رکھا گیا ہے"۔

مفتی صاحب نے ہمیں اور پریشان کر دیا۔

"بھئی جنہیں پاکیزگی کا دعویٰ ہو۔ نیک، پاک صاف ہونے کے مدعی ہوں۔ وہ تو خالی ہاتھ لوٹتے ہیں وہاں سے" مفتی صاحب نے وضاحت کی۔

"اچھا یہ بتائیں۔ آپ نے ساری عمر کتابیں ہی لکھی ہیں۔ جب لکھنے والا لکھتا ہے تو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں، دور دراز کسی کونے میں، شہرت کی کوئی دبی دبی سی خواہش، نام پانے کی تمنا موجود ہوتی ہے یا نہیں"

"ہوتی ہے"۔

"تو پھر--- اللہ میاں سے راز و نیاز کی باتیں فاش کیسے کر دی جائیں۔ یہ تو اکاؤنٹ زیرو

کرنے والی بات ہوئی نا"؟

ہم نے پوری بات ان کے گوش گذار کر دی۔

"کرنل صاحب! میں آپ کے پبلشر سے متفق ہوں۔ آپ سے نہیں۔ جو وہ کہتا ہے لکھیں"۔

مفتی جی نے سلیمانی صاحب کی غیر موجودگی میں ان کی وکالت سنے بغیر فیصلہ ان کے حق میں دے ڈالا۔ کچھ دلائل بھی تھے ان کے پاس۔ انہی پر تکیہ ہے۔ قارئین سے گذارش ہے کہ وہ ہمارے حق میں دعا فرمائیں۔

ان تمام خواتین و حضرات کا شکریہ جن کے پیار بھرے اصرار، فرمائشوں، فہمائشوں نے فرصت کے لمحات میں ہمیں یہ کتاب لکھنے کی طرف راغب کیے رکھا۔ یہ انہی کی محبتوں کا جواب ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اشفاق حسین

کور ہیڈکوارٹرز۔ بہاولپور کینٹ

۱۶ ستمبر ۱۹۹۴ء

حال ۵ کور ہیڈکوارٹر کراچی

جون ۱۹۹۹ء

ذرا سعودی عرب تک

مولانا ابوالکلام آزاد، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قادر الکلام شخص تھے۔ اردو بولتے یا لکھتے تو عربی اور فارسی اشعار اور محاورے اتنے تسلسل سے وارد ہوتے کہ یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا کہ مولانا کس زبان میں کلام فرما رہے ہیں۔ عربی، جس میں اردو بقدر اشک بلبل استعمال ہو رہی ہے یا فارسی جسے عربی محاوروں کی مدد سے "معرب" کیا جا رہا ہے۔

ایک مرتبہ پنجاب کے سکھ دہقانوں کا ایک وفد اپنے مسائل کی ایک فہرست لے کر مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا نے شرف باریابی بخشا۔ پہلے تو خاموشی کا طویل وقفہ رہا۔ دہقان شاید پاس ادب سے چپ رہے اور مولانا منتظر کہ یہ خود ہی کچھ ارشاد فرمائیں۔ پھر مولانا نے پہل کی۔

"سنائیے امسال تمہاری کشت ہائے زرعی میں نزول باراں ہوا یا نہیں؟"

کسانوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا "کیوں بھائی! کسی کی سمجھ میں کچھ آیا؟"

سب کے چہرے سپاٹ تھے۔ مودب اور سرنگوں بیٹھے رہے۔ مولانا پھر گویا ہوئے۔

"نزول باراں عطیہ ہے رحمت باری تعالیٰ کا کہ اثمار و اناج نشوونما پاتے ہیں، فضائے بسیط کی کثافت دور ہوتی ہے"۔

وفد میں جو قدرے سمجھدار تھا، اٹھا، باقی افراد کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ مولانا کی طرف پیٹھ کیے بغیر، الٹے پیروں واپس آ گئے۔ دانا شخص نے بتایا "اس وقت مولانا عبادت میں مصروف ہیں۔ اپنی مذہبی زبان میں وظیفے پڑھ رہے ہیں"۔

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز وطن عزیز میں ایک اہم ادارہ ہے۔ یہاں دنیا کی اٹھارہ زبانوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہر زبان کو پڑھانے والے اہل زبان ہوتے ہیں۔ روسی زبان پڑھانے کے لیے کوہ قاف کی پریاں، فرانسیسی پڑھانے کے لیے کوئی موسیو یا مدموزل، جاپانی گڈی، چین کی گڑیا، کوئی جرمن بڈھا، فارسی کی مادام، اور عربی کے استاذ، غرض دیس دیس

کے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔

ہمیں بھی یہاں ڈھائی سال تک عربی پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے لیے فوج نے ہمیں جس انداز سے منتخب کیا وہ ایک الگ دلچسپ کہانی ہے۔ انٹرویو کے ایک مختصر واقعے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان دنوں افسروں سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ کون سی زبان پڑھنا پسند کریں گے۔ پھر ایک لمبا چوڑا بورڈ بیٹھتا تھا جو انٹرویو کے ذریعے موزوں امیدواروں کا انتخاب کرتا۔ ہم نے متعلقہ کاغذات جمع کرواتے وقت عین آخری لمحات میں اپنا انتخاب فرانسیسی سے بدل کر عربی کر دیا تھا۔ انٹرویو کے موقع پر بورڈ کے ایک رکن نے پوچھا'

"منفدة" کا کیا مطلب ہے؟

"معلوم نہیں سر!"

"کیوں؟"

"سر! بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں انسان علم نہیں رکھتا۔ اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی وجہ نہیں ہوتی"۔

"لیکن اس لفظ کا مطلب تو آپ کو آنا چاہیے"۔

"کیوں سر؟"

"بھئی آپ نے عربی پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے"۔

"لیس سر! اس لئے کہ ہمیں عربی نہیں آتی۔ اگر عربی آتی ہوتی اور ایسے ایسے مشکل لفظ ہم پہلے سے جانتے جیسے آپ پوچھ رہے ہیں تو پھر عربی کا انتخاب ہی کیوں کرتے۔ روسی' چینی یا جاپانی کا انتخاب کرتے"

ہم نے دیکھا کہ بورڈ کے سربراہ جو میجر جنرل تھے' ہماری دلیل پر نہ صرف مسکرا رہے ہیں بلکہ تائید میں سر بھی ہلا رہے ہیں۔ ایک جرنیل کا ایک کپتان کی تائید میں سر ہلانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جرنیلوں کی تائید سے دنیا میں حکومتیں بدل جاتی ہیں اور یہ تو معاملہ ہی ایک چھوٹے سے کورس کے لیے ہم جیسے صاحب فہم افسر کے انتخاب کا تھا۔ سمجھدار شخص ہوتا تو خاموشی اختیار کرتا لیکن بورڈ کے ان صاحب کو اصرار تھا کہ منفدة کا مطلب ہمیں آنا چاہیے۔

"بھئی تھوڑی بہت عربی تو آپ کو آنی چاہیے۔ ہم بالکل ہی کورے آدمی تو منتخب نہیں

کرتے"۔

"سر! تھوڑی بہت عربی ہمیں آتی ہے"۔

"مثلاً؟"

"مثلاً' الحمدللہ رب العالمین ...." ہم نے سورہ فاتحہ پڑھنی شروع کر دی۔ مالک یوم الدین ہی تک پہنچے تھے کہ بورڈ کے سربراہ نے مسکراتے ہوئے انٹرویو ختم ہونے کا اشارہ کیا اور ہمیں جانے کی اجازت عطا ہوئی۔

یہ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز کے اساتذہ کی محنت تھی کہ منفدة جیسے عام سے لفظ کا مطلب نہ جاننے والے کو ڈھائی سال میں اس قابل بنا دیا کہ وہ عربی اخبارات فر فر پڑھ سکتا تھا۔ عربی خبریں سمجھ لیتا تھا اور ترجمانی کے فرائض بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی سی قادر الکلامی کے دعویدار تو نہیں ہوئے لیکن کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا کہ مولانا کے دور میں تو نیشنل انسٹیٹیوٹ جیسا کوئی ادارہ نہیں ہو گا۔ اور اگر تھا بھی تو مولانا تو کہیں کے پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ طالب علمی کا زمانہ انہوں نے والد کی نظروں کے سامنے گھر کی چار دیواری ہی میں گذارا تھا۔ لیکن ہوا یوں کہ جب ہمیں اپنی عربی آزمانے کا موقع ملا تو اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جو مولانا ابوالکلام اور دہقانوں کی ملاقات کے وقت پیش آئی تھی لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔ ہمارے مخاطب دہقان نہیں تھے کسی دہقان کی بیٹی تھی۔

پاک فوج کے ایک دستے کے ساتھ بطور مترجم ہمیں بھی سعودی عرب جانا تھا۔ روانگی سے پیشتر ہم نے عربی اخبارات کا مطالعہ کر کر کے اپنے دانست میں اپنی عربی کو پالش کر لیا تھا اور جب ایک دیوہیکل طیارہ بارہ ہزار میٹر کی بلندی پر اڑتا ہوا سعودی عرب کی طرف رواں دواں تھا اور ایک دراز قد فضائی میزبان کہ اپنے قد کاٹھ اور چہرے مہرے سے مصر کی رہنے والی لگتی تھی' مفرحات لے کر آئی تو ہم نے اپنی عربی دانی کا ابتدائی تجربہ اسی پر کرنا چاہا۔ سیدھا سادا سا سوال تھا "کس ملک کی ہو تم؟"

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا "وہاٹ؟" (What)

ہم نے جلدی سے فقرے کی نوک پلک سنواری اور پوچھا "من ای بلد انت؟"

وہ اپنے تیکھے ابروؤں کو سمیٹتے ہوئے ہمارے اور قریب ہو گئی اور انگریزی میں بولی‘

”معاف کیجئے۔ میں سمجھ نہیں سکی۔ آپ کو کیا چاہیے؟“

”لاحول ولا قوۃ“ منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ چونکی تو سہی لیکن آداب میزبانی کے تقاضوں سے مجبور‘ سراپا سوال بنی‘ جھکی کھڑی رہی۔ ہم نے پھر اپنی عربی کو مجتمع کیا (ہم جو کوشش اس وقت کر رہے تھے اس کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے آپ کم از کم مجتمع کے ع کو حلق سے نکال کر پڑھیے) اور پوچھا‘

”اے خاتون! کیا تو بنت مصر ہے؟“۔

اس پر اس نے جو کچھ ہم سے پوچھا وہ ہمارے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا بولی ”آپ کون سی زبان بول رہے ہیں؟“

بول تو ہم عربی ہی رہے تھے لیکن چند لمحوں کے تجربے سے عیاں تھا کہ ہم یہ ”انکشاف“ فرماتے بھی تو وہ قطعاً اعتبار نہ کرتی اور دیار غیر کے سفر میں ملنے والی پہلی خوبصورت خاتون سے بے اعتباری کا خطرہ مول لینا ہمیں اچھا نہ لگا۔ انگریزی میں اس کا شکریہ ادا کیا اور وہ زلفیں جھٹکتی آگے بڑھ گئی۔ کسی دہقان یا چرواہے کی بیٹی لگتی تھی غالباً کسی پسماندہ علاقے میں پلی بڑھی کہ فصیح و بلیغ عربی اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ ساتھی یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ اتنی دیر کس موضوع پر ”تبادلہ خیالات“ ہوتا رہا۔ ایر ہوسٹس ہمارے ساتھ کیا ”سرگوشیاں“ کر رہی تھی۔ مسکراہٹ آمیز خاموشی سے طرح طرح کے مطلب نکالے گئے۔ یار لوگوں کو تو ہم نے ان خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے دیا لیکن مترجم ہونے کے حوالے سے مستقبل قریب میں جو کچھ ہمارے ساتھ ہونے والا تھا‘ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر‘ ایک تشویش تھی جو ہم کو لاحق تھی۔ ہمیں دہقانوں اور چرواہوں سے ہی واسطہ پڑنا تھا یا کسی معزز آدمی سے ملاقات بھی ہمارا مقدر تھی؟

دمام ایئرپورٹ پر ہمارا قیام عارضی تھا۔ یہاں سے ہمیں خمیس مشیط کے لئے فلائٹ بدلنا تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کا قیام تھا اور اس مختصر سے قیام نے اس تاثر کو اور گہرا کر دیا کہ ہمارا واسطہ پڑھے لکھے معززین سے نہیں سخت کوش دہقانوں اور مردم بیزار گڈریوں سے تھا جنہیں صحراؤں سے اٹھا کر زبردستی شہروں میں بسا دیا گیا ہو۔ سعودی نئے آدمیوں سے کم‘ بہت کم کھلتے

ہیں اور ان کے بارے میں اس ابتدائی تاثر کی تصدیق بہت سے افراد کریں گے لیکن بحیثیت قوم سعودی ملنسار لوگ ہیں۔ ہمیں بھی بعد میں بڑے بڑے نستعلیق اور خوبصورت لوگوں سے ملنے کا موقع ملا لیکن ابتدائی تجربات میں ترش رو لوگوں سے پالا پڑتا رہا۔

خمیس مشیط سعودی عرب کے جنوب میں ایک چھوٹا سا شہر ہے‘ صاف ستھرا‘ جگمگاتا۔ ایئرپورٹ پر اترے تو ایک اور ”حادثے“ سے دوچار ہونا پڑا۔ یونٹ کے سامان میں بہت سے ڈبے ایسے تحفے تحائف پر مشتمل تھے جو یونٹ نے متوقع پڑوسیوں اور بالا افسروں کے لئے پاکستان سے ساتھ لے لئے تھے۔ گڈی کاغذوں اور رنگین پیپروں میں ملفوف یہ ڈبے کسٹم کے عملے کی نظر پڑے تو انہیں کھولنے کا حکم ہوا۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ تحائف ہیں اور ان کی خوبصورتی انہی ملفوف کاغذوں میں پنہاں ہے۔ انہیں کھولنے سے معاف رکھا جائے تو عنایت ہو گی۔ کسٹم افسر خوش پوش‘ ہنستا مسکراتا نوجوان تھا۔ کچھ کچھ مان گیا‘ ”بولا“ مافی مشکلتہ۔ افتح واحد“۔ (اچھا کوئی بات نہیں۔ بس ایک کھول کر دکھا دو)

ہم نے جوانوں کو حکم دیا کہ کوئی ایک ڈبہ کھول دیں۔ وائے قسمت۔ جو ڈبہ کھولا گیا‘ پہلے تو اس میں مزید چھوٹے چھوٹے بیوٹی بکس نما ڈبے برآمد ہوئے۔ انہیں کھولا گیا تو جانتے ہیں ان میں سے کیا نکلا؟ استرے‘ کنگھے‘ قینچیاں‘ استعمال شدہ شیونگ سوپ اور برش۔ کسٹم آفیسر نے حیران ہو کر ہماری طرف دیکھا ”ھل ھذہ الھدایتہ؟“ (یہ ہیں وہ تحفے؟) ہم نے سوالیہ نظروں سے یونٹ کے ہیڈ کلرک کو دیکھا کہ یہ تحائف اسی کی زیر نگرانی پیک کئے گئے تھے۔ بولا ”سر‘ پتہ نہیں یہ باربروں کا سامان ان تحفوں میں کیسے پیک ہو گیا“۔

کسٹم آفیسر جھلا اٹھا اور حکم دیا کہ سارے ڈبے کھولے جائیں۔ ہم نے صفائی پیش کرنا چاہی تو یونٹ کی ایڈوانس پارٹی کے آفیسر کمانڈنگ میجر (اب کرنل) ریاض احمد نے ہمیں سمجھایا کہ میاں اب چپ ہی بہتر ہے۔ ہم چپکے ہو رہے۔

جو چپ ایرپورٹ پر لگی تھی‘ یونٹ میں آ کر اور گہری ہو گئی۔ ذمہ داریاں سنبھالنے کے پہلے دن ڈاک کا فولڈر کھولا تو پہلا خط دیکھتے ہی دماغ کے سارے فیوز اڑ گئے۔ اس کے شروع میں السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ اور آخر میں والسلام کے الفاظ تو دیکھتے ہی سمجھ میں آ گئے تھے لیکن سلامتی کی ان دو دعاؤں کے درمیان جو کچھ بھی تھا وہ ذہنی سکون کو غارت کیے دیتا تھا

ایک دو لفظ سمجھ میں آتے بھی تھے تو ان کا کوئی مطلب نہیں نکل رہا تھا۔ مثلاً دو لفظ بار بار استعمال ہوئے تھے جیب اور نیسان جیب ہمارے نزدیک یہی اردو والی جیب تھی جو قمیض' پتلون یا کوٹ میں لگی ہوتی ہے۔ کہ عربی میں بھی اسے جیب ہی کہتے ہیں اور نیسان کا ترجمہ کرنے کے لیے ہم نے پڑھائے گئے طریقہ کے مطابق نیسان کا "مادہ" نکالا جو نسی' یعنی' نسیان نکلا جس کا مطلب ہے بھول جانا۔ تو جیب نیسان کے معانی ہوئے "بھولی ہوئی جیب" لیکن یہ کیا بات ہوئی۔؟ خط کے باقی متن میں جو کچھ لکھا تھا اس سے یہ مفہوم نکلتا تھا کہ یہ جیب نیسان ریاض کے ایک سٹور سے جا کر لے آؤ۔ اس سب کچھ کو ملا جلا کر جو بات ہماری سمجھ میں آئی' یہ تھی کہ لفظ "جیب" غالباً بٹوے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے کسی صاحب کا بٹوا کھو گیا ہے۔ سعودی عرب میں چونکہ زیادہ تر اسلامی قوانین نافذ تھے' خوشحالی عام تھی۔ اس لئے بھی یہ مفہوم دل کو لگ رہا تھا کہ گری پڑی چیز کسی نے اپنے قبضے میں رکھنے کی بجائے کسی سٹور میں جمع کرا دی ہے اور حکومت کی طرف سے ہمیں اطلاع دی گئی ہے کہ "لو میاں! لے جاؤ اپنی امانت"۔ لیکن ایک ابہام یہ پیدا ہو رہا تھا کہ ریاض ہمارے شہر سے تیرہ سو کلو میٹر دور تھا ہمارا یونٹ یا یونٹ کا کوئی فرد ابھی تک ریاض نہیں گیا تھا۔ تو یہ بٹوا وہاں کیسے پہنچ گیا۔ شبہ ہوا کہ مفہوم سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے۔ ہماری یونٹ کے پڑوس ہی میں ایک سعودی یونٹ مقیم تھی۔ وہاں ہم نے ایک ایسا افسر تلاش کیا جو انگریزی میں تھوڑی بہت شد بد رکھتا تھا۔ کہ عربی میں لکھا خط پڑھ کر انگریزی میں ہمیں سمجھا سکے لیکن اس نے خط پڑھنا شروع ہی کیا تھا تو پتہ چلا"

ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا

والی بات تھی۔ محض زیر زبر کے فرق نے پورے خط کے متن کو زیر زبر کر دیا تھا۔ ہم جن لفظوں پر زبر پڑھتے رہے' ان پر زیر پڑھتے تو مسئلہ حل تھا۔ لفظ جیب نیسان نہیں "جیب نیسان" تھا جو "جیپ" کو عربی کے قالب میں ڈھال کر بنایا گیا تھا۔ یہ جیپ ہماری یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے لئے ایشو کی جا رہی تھی۔ گاڑیوں کے سٹور سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں تھے۔

جب یہ عقدہ کھلا کہ عربوں نے عربی کی خاصی مت مار رکھی ہے تو یہ بھی طے ہوا کہ محض

کتابی علم ہمارے کام نہ آئے گا۔ ہم نے اپنی دانست میں عربی سیکھنے میں بہت محنت کی تھی۔ گردانیں جو عام طلبہ کو مشکل سے سمجھ میں آتی تھیں' ہم فر فر دہرا سکتے تھے گرائمر کی موشگافیاں سمجھنے کے لئے گھنٹوں مغز ماری کی تھی' مصر کے فاضل اساتذہ ہماری بحث سے خوش ہوتے تھے لیکن مرحلہ وہ آ پڑا تھا جب انسان پکار اٹھتا ہے۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

وردی ڈاٹ کر بند کمروں میں فائلوں کے پیچھے بیٹھ کر تو جنوں کے مرحلے طے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لیے تو گریباں پھاڑ کر صحراؤں میں نکل جانے کی ضرورت تھی کہ جہاں گڈریوں اور چرواہوں سے مذاکرات ہو سکتے' بازاروں میں گھوم پھر کر لوگوں کو سننے کی ضرورت تھی کہ انہی کی گفتگو' انہی کے لہجے ہماری مدد کر سکتے تھے' قہوہ خانوں میں بیٹھ کر لوک گیت سننے کی ضرورت تھی کہ جنہیں سمجھے بغیر کسی بھی زبان کی گہرائی میں نہیں اترا جا سکتا۔ صحراؤں' بازاروں اور قہوہ خانوں کی تو سعودی عرب میں کوئی کمی نہ تھی لیکن گریبان پھاڑنے والا معاملہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ جس علاقے میں ہمارا ورود مسعود ہوا تھا اس کے بالکل قریب سے قیس مجنوں اٹھا تھا اور شمال میں منصور حلاج نے جنم لیا تھا۔ ان کے عشق کی جنوں خیزیوں کے قصے آج زبان زد عام ہیں لیکن ان ہر دو حضرات سے اہل عرب نے جو سلوک روا رکھا وہ قطعاً خوشگوار نہ تھا۔ ان کے دور میں تو پھر جمہوریت و شورائیت کسی نہ کسی شکل میں رائج تھی۔ ہم جس دور میں سعودی عرب میں وارد ہوئے' وہاں بادشاہت رائج تھی جو اپنی نوعیت کا اپنا ہی ایک نظام ہے۔ بادشاہ کل اختیارات کے مالک' خوش ہوئے تو خلعتیں اور جاگیریں بخش دیں' ناراض ہوئے تو زن بچہ کولہو میں پلوا دیا۔ فرد کا استحقاق کوئی نہیں۔ پھر بادشاہ بادشاہوں سے تو خوب ملتے ہیں' لونڈیوں' غلاموں' زر و جواہر اور دیگر قیمتی تحائف کے تبادلوں کے ساتھ لیکن عام آدمی کا استحقاق اتنا ہی ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کو کسی جھروکے سے دیکھ کر خوش ہو لے۔ ہم بادشاہ تھے نہ کسی شاہی خانوادے کے چشم و چراغ۔ عام لوگوں میں سے تھے اور عوام کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے سعودی عرب میں شرطے رکھے گئے ہیں اور وہاں جمعہ جمعہ آٹھ دن کے مختصر قیام نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کے نظام میں شرطوں کا بول بالا تھا۔ وطن عزیز میں

جیسی بھی جمہوریت رہی ہے اس میں پلنے بڑھنے والے جب کسی بند معاشرے میں جا نکلتے ہیں تو بڑی گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ وہاں قدم قدم پر نظم و ضبط کا سامنا تھا۔ عالم بے خودی میں بھی ضبط کے بندھن توڑنے کی اجازت نہ تھی۔ سو صاحبو! ہم نے گریبان پھاڑنے کا پروگرام تو کیا ملتوی اور عام لوگوں میں گھل مل کر ان کی زبان سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔

مالش، بکرا، یلا

عرب معاشرے میں ایک نووارد کو اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں زیادہ تر جن الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے وہ ہیں ''مافی، مالش، بکرا اور یلا''۔ مافی کو شروع شروع میں تو ہم معافی ہی سمجھتے رہے۔ آپ کسی دکاندار سے پوچھیں کہ میاں فلاں چیز ہے تو انکار کے لیے وہ کہے گا ''مافی''۔ ہم یہی سمجھتے کہ دکاندار معافی کا خواستگار ہے لیکن جب دکانداروں کے بے نیازی کے رویے پر غور کیا اور دیکھا کہ معافی مانگنے کے لئے جو عاجزی و انکساری ہونی چاہیے وہ سرے سے ناپید ہے۔ تو شک ہوا کہ یہ معافی وافی نہیں کوئی اور ہی چکر ہے۔ مطلوبہ چیز موجود ہونے کی شکل میں ''فیہ'' کا جواب سن کر پتہ چلا کہ مافی دراصل ''مافیہ'' کا عامیانہ استعمال ہے۔ دفتروں میں متعلقہ کلرک، افسر یا ذمہ دار شخص کے ہونے نہ ہونے کے بارے میں جواب بھی فیہ یا مافیہ کی شکل میں ملتا ہے۔

مالش کا اردو یا پنجابی والی اس مالش سے قطعاً کوئی تعلق نہیں جو ہمارے ہاں سروں میں کی جاتی ہے، پہلوان حضرات کسرت کرنے سے پہلے اپنے جسم پر تیل چپڑ چپڑ کر کرتے ہیں یا جس کا اہتمام لاہور میں بھاٹی گیٹ کے باہر سرکلر روڈ کے ساتھ ساتھ واقع باغات میں ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا ہے مالش کا لفظ سنتے ہی ان کے ذہن کے پردے پر پہلی تصویر یہی ابھرتی ہے کہ پورے تن، من، دھن کے ساتھ کرائی جانے والے مالش یہی ہوتی ہے۔ یہ پیشہ اور اس پیشے کے مربی حضرات ہمارے خیال میں زندہ دلان لاہور تک ہی محدود ہیں کسی اور شہر میں یہ منظر دیکھنے میں نہیں آیا۔ یا شاید ہمیں کوئی اور شہر اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ مالش کرنے والے حضرات باغ کے کسی کونے میں ایک دری بچھائے تشریف فرما رہتے ہیں۔ ان کا اپنا سر کسی خوشبودار تیل سے مہک رہا ہوتا ہے۔ کانوں میں گلاب کا کوئی پھول پنسل کی طرح اڑسا ہوتا ہے۔ دری کنارے ایک چمکتا دمکتا دھات کا گول سا اسٹینڈ جس کے سوراخوں سے رنگ برنگی شیشیاں لٹک رہی ہوتی ہیں جن میں سرسوں، ناریل، چنبیلی، دھنیے، تارے میرے وغیرہ کا تیل بھرا ہوتا ہے۔ گاہک کی مرضی کے مطابق کسی بھی تیل کی مالش ہو

سکتی ہے۔ قدرے بہتر معیار کے ماشیوں کے ہاں موسیقی کا انتظام بھی ہے۔ دری کے کنارے پھولدار غلاف اور جھالروں سے مرصع کوئی ٹرانسسٹر یا ٹیپ ریکارڈر دھرا ہوتا ہے جس سے موسیقی کی مدھر تانیں اڑتی رہتی ہیں۔ اس اہتمام کے ساتھ مالش کا منظر کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ مالش کا تمنائی کپڑے اتار ایک طرف رکھ دیتا ہے اور ایک انڈر ویر بلکہ کہنا چاہیے کہ کچھے' انگر کھے یا لنگوٹ میں ملبوس دری پر ایسی بے نیازی سے لیٹ جاتا ہے جیسے مغربی یا یورپی ملکوں میں عوام سمندر کنارے غسل آفتابی کے لیے لیٹتے ہیں۔ ماشیا سر کے بالوں سے شروع ہوتا ہے اور مالش کرتا ہوا پیروں تک پہنچتا ہے۔ یہ مالش صرف ہاتھوں سے مساج تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ماشیا اس میں پورا تن من استعمال کرتا ہے مثلاً کمر پر مالش کرتے ہوئے ماشیا منہ کے بل لیٹے ہوئے اپنے گاہک کے کاندھوں کے قریب گھٹنے ٹیک کر اپنی ہتھیلیاں اس کے شانوں پر رکھتا ہے اور جسم کا پورا زور ڈالتے ہوئے ہاتھ شانوں سے کمر تک لے جاتا ہے اور سانس کھینچتے ہوئے ہاتھ بھی واپس لے آتا ہے۔ اس دوران گاہک کو حسب ضرورت کروٹیں دلوائی جاتی ہیں کہ کوئی حصہ مالش سے محروم نہ رہ جائے مالش کروانے والا بڑی بے پروائی سے عالم غنودگی میں لیٹا رہتا ہے اور ماشے پر تو ایک اور ہی دھن سوار رہتی ہے وہ موسیقی کی لے پر بس مالش میں مصروف رہتا ہے' اسے اتنی فکر کہاں کہ حسن کہاں بے حجاب ہو گیا۔ علاقہ اقبال بھی ایک عرصہ لاہور میں مقیم رہے شاید انہی مناظر سے متاثر ہو کر انہوں نے لکھا تھا۔

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

ان دنوں اصل شہر تو مختلف دروازوں کے اندر ہی واقع تھا' سرکلر روڈ سے ملحقہ باغات شاید بنوں کا منظر ہی پیش کرتے ہوں۔

پہلے یہ مالش شہر کے باقی حصوں میں بھی ہوتی تھی۔ سورج ڈھلنے کے بعد ماشے ایک تھیلے میں دری اور سٹینڈ میں بوتلیں لٹکائے باقاعدہ آواز لگاتے پھرتے تھے "تیل مالیش"۔ جہاں کوئی گاہک ملا' سڑک کنارے' گلی کے نکڑ پر' کسی بند دکان کے تھڑے پر یا سردیوں کا موسم ہو تو کسی تندور کے کنارے دری بچھائی اور مالش شروع۔ جب سے گلیوں اور سڑکوں پر خلق خدا کا اژدھام بڑھا ہے یہ ماشے صرف اندرون شہر اور سرکلر روڈ کے باغات تک محدود ہو کر رہ گئے

ہیں۔

اس ذہنی پس منظر کے ساتھ سعودی عرب میں ہم نے پہلی بار مالش کا لفظ اس طرح سنا کہ ایک ہوائی سفر کے دوران لینڈنگ کے وقت ایک غیر ملکی نوجوان ایر ہوسٹس (سعودی ایر لائنز میں تمام ایر ہوسٹیس نان سعودی ہوتی ہیں) ادھیڑ عمر کے ایک سعودی کے ساتھ بحث میں مصروف ہے۔ وہ حفاظتی بیلٹ باندھنے پر اصرار کر رہی ہے اور سعودی جواب میں مالش مالش پکارتا ہے۔ ہم چونکے "یا اللہ' سعودی ایر لائنز میں دوران پرواز مالش کا بھی اہتمام ہے؟ کس طرح ہوتی ہو گی یہ مالش؟ جگہ تو اتنی ہے نہیں؟ یہاں تو شاید زیتون کا تیل استعمال ہوتا ہو گا" کتنے ہی سوال ذہن میں آئے اور گذر گئے۔ ہم اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ شور ختم ہو گیا۔ جہاز تھوڑی دیر میں ایر پورٹ پر اتر گیا۔ ہم یہی سمجھے کہ سعودی مالش پر اصرار کر رہا تھا لیکن شاید وقت کی قلت کی وجہ سے ایر ہوسٹیس نے معذرت کر لی۔

لاہور میں مالش کے منظر بارہا دیکھے ہوں گے کبھی اس عمل سے گذرنے کی خواہش نہ ابھری لیکن تیس پینتیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے ایر ہوسٹسوں کے ہاتھوں مالش کروانے کا تصور اس قدر جاں فزا تھا کہ ذہن میں مالش کے فوائد خود بخود ترتیب پانے لگے علامہ اقبال نے کہا تھا"

ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اس معاملے میں یہ خیال بھی نہ آیا کہ مالش کے بارے میں ڈکشنری ہی دیکھ لیتے۔ پہلے تو چند ساتھیوں سے دبے دبے لفظوں میں پوچھا کہ سعودی ایر لائنز سے انہوں نے کتنی بار سفر کیا ہے؟ سروس کیسی ہے؟ کیا کچھ شامل ہے "سروس" میں؟ جب کام کی بات ہاتھ نہ آئی تو صاف صاف پوچھا کہ کبھی مالش بھی کروائی یا نہیں۔ کیسی مالش' کہاں کی مالش؟ پتہ چلا کہ مالش کا مطلب ہے' چھوڑو چھوڑو' فکر نہ کرو۔ خیال ہی نہ کرو"۔

"بکرہ" دفتر کے بابوؤں کا تکیہ کلام ہے۔ کسی کام کے لیے جاؤ بکرہ کہہ کر ٹال دیں گے۔ مطلب ہے کل آئیے گا اور یہ وہی کل ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آج کا کام کل پہ مت چھوڑو۔ مسئلہ یہ ہے کہ آپ لاکھ کوشش کریں کہ آج کا کام آج ہی ہو جائے لیکن بابو کے منہ سے بکرہ نکل گیا تو بکرہ کے ساتھ انشاء اللہ کی شرط کا اضافہ تو ہو سکتا ہے بکرہ یعنی کل

آج میں نہیں بدل سکتا

"بکرہ انشاء اللہ" کا مطلب (ترجمہ نہیں، مطلب) کچھ یوں ہوتا ہے "بچو! اب اللہ ہی تیرا کام کرائے تو کرائے میرے ہاتھ سے تو ہونے سے رہا"۔ جو لوگ بابوؤں کی اس عادت سے واقف ہیں وہ بکرہ ہی پر ٹل جاتے ہیں اور مزید اصرار کے ذریعے بابو کو "بکرۃ انشاء اللہ" کے مرحلے تک نہیں جانے دیتے۔

یلا۔ پہلے پہل ہم نے یہ لفظ سنا تو اسے "یا اللہ" کا مخفف سمجھا اور سعودی دکانداروں کے اخلاق و کردار سے بہت متاثر ہوئے کہ کوئی چیز موجود نہ ہونے پر "معافی یا اللہ" کہہ کر گاہک سے بھی معذرت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی عفو و درگذر کے طالب ہوتے ہیں کہ ان کی کوتاہی کی وجہ سے ایک بندہ خدا کو دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن بہت جلد ہماری غلط فہمی دور ہوگئی۔ "مافی" کی تشریح تو پہلے گذر چکی، "یلا" کے پیچھے انسانی فطرت کی ایک پوری کہانی کار فرما ہے۔

عربوں کے ہاں تیل دریافت ہونے سے پہلے تک پانی کے کنووں اور چشموں کی بڑی اہمیت تھی۔ قرآن میں جا بجا اس طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنی اہلیہ محترمہ اور معصوم بچے کو مکہ جیسی وادی غیر ذی ذرع میں چھوڑ گئے، پیاس سے ننھے اسمٰعیل کے ہونٹ پپڑا گئے اور ہاجرہ بی بی پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کے درمیان بے تابانہ دوڑیں تو اللہ تعالیٰ کو ایثار و قربانی کی یہ ادا پسند آئی اور خانہ کعبہ کی تعمیر سے بھی پہلے آب زم زم کے چشمے کا ظہور ہوا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کے لیے معجزے کے طور پر اونٹنی نمودار ہوئی۔ ان کے چشمے ہر دوسرے روز اسی کے لیے مختص رہتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں جب قبطیوں کا ایک شخص مارا گیا اور انھوں نے مصر سے مسافرت اختیار کی تو حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیوں سے ایک کنویں پر ہی ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ اپنے مویشیوں کو پانی پلانے کے لیے لوگوں کی بھیڑ چھٹنے کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ بعد میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بارہ قبیلوں کے لیے الگ الگ چشمے جاری فرمائے گئے۔ زیادہ تر بستیاں کنوؤں اور چشموں کے ارد گرد ہی آباد ہوتی تھیں لیکن آبادی بڑھنے پر مکینوں اور کنوؤں کے فاصلے بڑھتے گئے۔ لوگ مشکیزوں اور برتنوں میں دور دور سے پانی بھر کر لایا

کرتے۔ جب کاندھوں پر پانی کے مشکیزے اٹھائے یہ لوگ گھروں کو لوٹ رہے ہوتے اور بوجھ سے ان کی کمر دہری ہو جاتی تو قدم بقدم آواز ملا کر اللہ کو پکارا کرتے "یا اللہ، یا اللہ، یا اللہ" اس پکار میں التجا بھی تھی، توکل علی اللہ بھی، اپنی عاجزی و بے بسی کا اعتراف بھی اور اللہ سے مدد کی درخواست بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ پہلے تو "یا اللہ" ملا کر کہا جانے لگا اور پھر چلنے کی دعوت کے لیے استعمال ہونے لگا۔ کوئی کہتا "یا اللہ" تو مطلب ہوتا کہ آؤ اللہ کرنے چلیں، پانی بھر لائیں۔

انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ پریشانی و درماندگی کی حالت میں تو اللہ کو پکارتا ہے، پورے خشوع و خضوع کے ساتھ، خلوص کے ساتھ، آہ و زاری کے ساتھ، راتوں کو اٹھ اٹھ کر، پچھلے پہر، تنہائی میں، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے۔ لیکن جب اللہ کشادگی کے در وا کرتا ہے، رزق کی فراوانی عطا کرتا ہے اسے عزت و منصب سے سرفراز فرماتا ہے تو وہ مال کی محبت میں گرفتار ہو کر فرعونیت اختیار کر لیتا ہے۔ بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے اور خود اس پر گواہ بھی۔ جب عربوں کے ہاں تیل کے کنووں سے سیال سونا ابلنے لگا اور وہ اونٹوں سے اتر کر مرسیڈیز گاڑیوں میں آ بیٹھے اور پانی خوبصورت بوتلوں میں پیک ہو کر گھروں کے ریفریجریٹروں میں سج گیا تو یا اللہ، یلا سے بدل گیا۔ گرچہ یا اللہ کا تلفظ بھی یلا بنتا ہے لیکن ہم نے جان بوجھ کر ہجے بھی یہی اختیار کیے ہیں اس لئے کہ اس لفظ کا اب اللہ جیسے نرم، شفیق اور رحیم و کریم نام سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا۔ پانی تو بھاپ کی طرح اڑتا ہی تھا "یا اللہ" میں پائے جانے والے توکل اور استقامت کے معانی بھی غائب ہو گئے اور یہ صرف "آؤ چلیں" کے معانی تک محدود رہ گیا۔ جب عربوں کے ہاں اجنبی دیس کے لوگوں کی بہتات ہوئی تو یلا پہلے تو "تم چلو" (میں آیا) کے معانی میں استعمال ہوا اور پھر اس میں خشونت در آئی۔ آج اس میں قہر کی ایک جھلک ملتی ہے۔ قہر بھی خدائے برتر کی قہاری والا نہیں جس پر اس کی رحمت غالب ہے بلکہ بندوں کا قہر جس سے بچنے کی دعا سکھائی گئی۔

اللھم انی اعوذ بک من قھر الرجال

ترجمہ (اے اللہ! میں بندوں کے قہر سے تیری پناہ میں آتا ہوں)

جب دکاندار، بابو یا دفتر کے متعلقین درشت رویہ اختیار کرتے ہیں تو مافی کے ساتھ یلا کا

اضافہ کرتے ہیں۔ اگر نرم لہجے میں کہیں تو مطلب ہے "نہیں ہے۔ چلے جاؤ" اور درشت لہجے میں کہیں یا باآواز بلند یلا کو دو مرتبہ پکاریں تو اس کا صاف مطلب ہے "دفان ہو جاؤ۔ جاتے ہویا........."۔

یہ تو تھے وہ عام الفاظ جن سے عرب معاشرے سے سرسری طور پر گذرنے والے کو بھی واسطہ پڑتا ہے لیکن ہمارا کام تھا ذرا ڈوب کر کرنے والا اور اس کے لیے ہم کھلی آنکھوں کے ساتھ سراپا گوش بنے شہر میں گھومتے پھرتے تھے۔

خمیس مشیط ایک چھوٹا سا شہر ہے، سعودی عرب کے جنوب میں، یمن کی سرحدوں سے قریب۔ یوم الخمیس عربی میں جمعرات کو کہتے ہیں اور مشیط، مشط یعنی کنگھے کا اسم تصغیر ہے۔ علامتی معنوں میں بننے سنورنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے جیسے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

کہتے ہیں کسی زمانے میں اس جگہ ہر جمعرات کو لونڈیوں کا بازار لگا کرتا تھا اور انھیں خوب بنا سنوار کر یہاں لایا جاتا تھا۔ اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام "خمیس مشیط" پڑ گیا۔ اس کے بالکل قریب منطقہ جنوبی کا دارالحکومت "ابہا" واقع ہے۔ یہ اسم تفضیل ہے اس کا مطلب ہے "حسین ترین" اور اس میں کوئی شک والی بات نہیں کہ سعودی عرب کا حسین ترین مقام ابہا ہے۔ ملک کی وسیع ترین اور خوبصورت سیرگاہیں اور پارک اسی علاقے میں واقع ہیں۔ موسم معتدل اور خوشگوار ہے۔ القرعاء کے پہاڑوں پر بادل آنکھ مچولی کھیلتے پھرتے ہیں۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے موسم گرما میں ایک تو درجہ حرارت مناسب حد سے اوپر نہیں جاتا دوسرے تقریبا روزانہ سہ پہر کے وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو جاتی ہے۔ موسم سرما میں سمندر کی قربت اثر دکھاتی ہے۔ اور پہاڑوں کی بلندی کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں اور برف باری کی نوبت نہیں آتی۔ طائف کو چھوڑ کر عرب کے باقی تمام علاقے جھلتی گرمیوں میں تپتے رہتے ہیں اور ان علاقوں کے لوگ موسم گرما میں طائف، ابہا اور خمیس مشیط ہی کا رخ کرتے ہیں۔ ہم خوش قسمت تھے کہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے خمیس مشیط میں مقیم تھے، عربی زبان کو گرفت

میں لانے کی کوششوں میں مصروف۔

خمیس شہر کے وسط میں ایک خوبصورت جامع مسجد ہے۔ ایک شام وہاں سے عصر کی نماز پڑھ کر نکلے تو دیکھا کہ ایک لڑکا زمین پر مسواکوں کا ڈھیر لگائے کھڑا ہے اور باآواز بلند پکارتا ہے۔ "بریال، بریال، بریال" کچھ ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ اس وقت ہمیں بھوک لگی ہوئی تھی یا شہر کی دکانوں سے خوشبوئیں اس طرح کی اٹھ رہی تھیں کہ اس لڑکے کی پکار سے ذہن فوری طور پر بریانی کی طرف منتقل ہوا۔ لڑکا جو کچھ پکار رہا تھا اس میں آخری لفظ چھوڑ کر باقی بریانی ہی کے تھے لیکن اس نے اپنے سامنے جو ڈھیر لگا رکھا تھا وہ محض مسواکوں کا تھا اور ان کا کوئی تعلق، کسی بھی طرح بریانی سے نہ بنتا تھا۔ لوگ تھے کہ زمین پر بیٹھے اپنی اپنی پسند کی مسواکیں چن رہے تھے اور ہم مسواکوں اور بریانی کے تعلق پر غور کر رہے تھے۔ ذرا قریب ہوئے کہ شاید تلفظ ٹھیک سے سمجھ میں آجائے۔ اتنے میں نمازیوں کا ایک ریلا آیا اور بہت سے لوگ مسواک کے طالب ہوئے تو لڑکے نے آواز لگانی چھوڑ دی اور نیچے بیٹھ کر گاہکوں کو نبٹانے لگا۔ ہم بھی زمین پر بیٹھ گئے اور ذرا قریب ہو کر بڑی شستہ سی عربی میں اس سے درخواست کی کہ وہ دوبارہ آواز لگائے۔ اس نے حیرانی سے ہمیں دیکھا اور پوچھا۔

"چاہتے کیا ہو؟"

"مسواک"

"تو آواز کیوں لگواتے ہو؟ کوئی سی چن لو"۔

ہم نے پھر اصرار کیا کہ آواز لگاؤ، تمھارے منہ سے اچھی لگتی ہے۔ وہ مسکرایا، جھپٹ کر کھڑا ہوا "بریال، بریال، بریال" پکارا اور جھپاک سے پھر بیٹھ گیا۔ مفہوم تو اب بھی نہ سمجھ سکے لیکن اخلاقا ایک مسواک اٹھائی۔ اس سے پوچھا "بکم"؟ (کتنے میں ہے؟)

بولا "واحد ریال"۔

ہم نے ایک ریال اسے تھمایا اور مسواک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے کہ شاید "بریال" کے معانی ہاتھ آسکیں۔ ایک سعودی جانے کب سے ہماری "حالت زار" کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمیں اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا "تم نے شاید عربی گرائمر کی معرفت پڑھی ہے"؟ بحث کی گنجائش نہ تھی۔ ہم نے فوراً اپنی الجھن بیان کی "یہ لڑکا کہتا کیا

ہے؟''

سعودی مسکرایا اور شستہ عربی میں بولا' ''بے ریالن'' ''اوہ- تو وہ ریال ریال پکار رہا تھا اور اس کے ساتھ اس نے بجا طور پر ب کا اضافہ کیا تھا جو لکھنے میں تو بریال ہی لکھا جائے گا لیکن بولتے ہوئے ہمارے حساب سے اس کے ب کے نیچے زیر اور ل کے نیچے تنوین چاہیے تھی اور صوتی اثرات گرائمر کی رو سے ''بے ریالن'' ہی بنتے تھے لیکن لڑکا مسواکیں بیچ رہا تھا' گرائمر کی کتابیں نہیں- بلکہ کتابیں بھی بیچ رہا ہوتا تو کیا ضروری تھا کہ گرائمر کے اصولوں کے مطابق آواز بھی لگاتا- وہ اہل زبان تھا اور اس ناتے جو کچھ کہہ رہا تھا' درست تھا- یوں کتابوں اور ڈکشنریوں کی دنیا سے نکل کر ہم نے کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے سیروا فی الارض پر عمل شروع کیا تو بہت سے لاینحل عقدے خود بخود کھلتے چلے گئے' حقیقتیں آشکار اور علم کے دروازے وا ہوتے چلے گئے-

حیرتوں کے باب

لفظ لفظ موتی چن کر جب ہم عربی زبان کی مالا پرو رہے تھے تو یونٹ میں تعمیر و تزئین کے مختلف منصوبے پروان چڑھ رہے تھے- یہ آرٹلری یعنی توپخانے کی ایک یونٹ تھی- جیسے انفنٹری بٹالین میں چار کمپنیاں ہوتی ہیں اور الفا' بریو' چارلی اور ڈیلٹا کہلاتی ہیں' آرٹلری کی یونٹ میں تین بیٹریاں ہوتی ہیں اور پاپا' کیوبک' رومیو بیٹری کہلاتی ہیں- انفنٹری بٹالین کی کمپنیاں انگریزی کے ابتدائی حروف یعنی اے بی' سی اور ڈی کے نام پر ہوتی ہیں اور آرٹلری کی بیٹریاں پی' کیو اور آر کے حروف پر لیکن وائرلیس کی شوں شوں اور میدان جنگ کے شور میں محض حروف کے استعمال سے کنفیوژن کا خدشہ ہوتا ہے بی' سی ڈی اور پی میں امتیاز مشکل ہو سکتا ہے اس لیے انفنٹری کمپنیوں کو الفا' بریو' چارلی' ڈیلٹا اور آرٹلری رجمنٹ کی بیٹریوں کو پاپا' کیوبک اور رومیو کہہ کر پکارا جاتا ہے ہر بیٹری میں چھ چھ توپیں ہوتی ہیں- ان تینوں بیٹریوں کے انتظامی بندوبست کے لئے ہیڈ کوارٹر بیٹری ہوتی ہے- یونٹ میں جب تک سازو سامان نہ آجاتا اور فوجی تربیت کی باقاعدہ سرگرمیاں شروع نہ ہو جاتیں' وقت کا بہترین مصرف یہی تھا کہ اپنے رہنے کی جگہ بہتر بنائی جائے- ہماری یونٹ کو ایک وسیع و عریض قطعہ زمین پر آباد کیا گیا تھا جس میں ہر طرف خاردار جھاڑیاں تھیں یا بڑے بڑے پتھر- کمانڈنگ آفیسر نے پورا علاقہ مختلف بیٹریوں میں بانٹ دیا- چنانچہ سارا دن اونچی نیچی جگہ ہموار کرنے' کیمپ کے ارد گرد اور اپنی اپنی بیٹری کے علاقے میں پھول بوٹے' گھاس اور درخت لگانے میں صرف ہو جاتا شام کو کھیلوں کا اہتمام ہوتا- یونٹ کے سپورٹس افسر کیپٹن سعید نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے پاکستان ہی سے کرکٹ' ہاکی' فٹ بال' والی بال اور بیس بال کا سامان خرید لیا تھا جس کی وجہ سے شامیں پر لطف گزرتیں- جب بیٹریوں میں مختلف کھیلیں ہو رہی ہوتیں- مرکزی گراؤنڈ میں وکٹیں گاڑی جاتیں اور سورج ڈھلنے تک ہم کرکٹ کھیلتے- پتہ چلا کہ خمیس مشیط میں موجود اور بہت سے پاکستانی ایسے ہیں جو کرکٹ کا شوق رکھتے ہیں اور انہوں نے

باقاعدہ ٹیمیں بنا رکھی ہیں چنانچہ چھٹی والے دن کسی نہ کسی ٹیم سے میچ کا اہتمام ہوتا۔ وہ ٹیم یونٹ آجاتی یا ہم کسی گراؤنڈ میں پہنچ جاتے۔ جمعے کی نماز اور کھانے کا وقفہ ہوتا باقی چھٹی کا پورا دن کرکٹ میں گذر جاتا بلکہ شامیں بھی کرکٹ کے نام رہتیں کہ میچ جیت جانے کی صورت میں کسی پارٹی کا اہتمام ہوتا۔ سنچری بنانے والا بیٹسمین' زیادہ وکٹیں لینے والا بالر یا میچ کے کسی سنسنی خیز مرحلے پر کوئی مشکل کیچ لینے والا' باؤنڈری سے پہلے بال روک لینے والا فیلڈر کھلا رہتا اور جن سے میچ کے دوران حماقتیں سرزد ہوئی ہوتیں۔ زیر عتاب رہتے'

"اتنا آسان کیچ چھوڑ دیا؟ تمھیں کہا کس نے ہے کرکٹ کھیلنے کو تمھارے لئے گلی ڈنڈے کا انتظام کروائے دیتے ہیں"۔

"کپتان کو بدلنا پڑے گا۔ یہ آخری اوور خود کروانے کا کیا شوق چرایا تھا؟"

"اور تم باؤنڈری لائن پر کھڑے سو رہے تھے؟ بال قریب سے نکل گیا تمھیں پتہ ہی نہیں چلا"۔

"کیا خوبصورت کیچ لیا تھا بھئی؟"۔

"اس میں ان کے ارادے کا دخل نہیں تھا۔ بال خود ہی ان کے ہاتھ میں آگئی تھی انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کہ اسے کرنا کیا ہے"۔

ہمارا شمار ٹیم کے ان ارکان میں تھا جن کے بغیر گیارہ کھلاڑی پورے نہیں ہوتے تھے۔ بیٹنگ آرڈر میں چھٹے ساتویں نمبر پر جاتے۔ کیپٹن ارتضٰی کی غیر موجودگی میں وکٹ کیپنگ بھی ہمیں کرنا پڑتی۔ کیپٹن سعید اور ارتضٰی کا شمار اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ انہوں نے کئی دفعہ سنچریاں بنائیں۔ لیکن ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ان ہر دو حضرات کی موجودگی میں ہمیں ٹاپ سکورر کا اعزاز ملا۔ یہ میچ ہم ہار گئے۔ (ظاہر ہے) بات ہار جیت کی نہ تھی بلکہ یہ تھی کہ خود کو مصروف کیسے رکھا جائے۔ جب انسان اپنوں سے بچھڑتا ہے تو تنہائی کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ یہ مصروفیت بہت سے غموں کا مداوا بھی تھی اور بہترین ورزش بھی۔ اقبالؒ نے کہا ہے۔

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندہ حر کے لئے جہاں میں فراغ

ہمارے ہی یونٹ میں کچھ ایسے افسر بھی تھے جو بالکل فارغ تھے۔ دفتر کے معمولی امور

نبٹانے کے بعد انہیں سمجھ نہ آتی تھی کہ وقت کیونکر گذارا جائے۔ اس فراغت کے عجیب و غریب مصرف نکالے گئے۔ ایک صاحب نے اپنی بیگم کو طویل خط لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ایک ایک ہفتے وہ خط ہی لکھتے رہتے۔ فل سکیپ کے پندرہ بیس صفحات پر مشتمل ان کے خط جاتے تو دیکھے گئے جواب میں کیا آتا تھا' اس کی اطلاع ہمیں نہیں ہو سکی۔ ایک اور صاحب فارغ وقت میں ٹیلیفون ایکسچینج یا کسی ہوٹل چلے جاتے اور پاکستان میں اپنی منگیتر سے فون پر طویل گفتگو کیا کرتے۔ ایک دفعہ ایک ہی نشست میں انہوں نے تیرہ سو ریال یعنی تقریباً چھ ہزار روپے کی گفتگو فرمائی۔ اسی خاتون سے ان کی شادی ہو گئی۔ آج کل تین بچیوں کے باپ ہیں۔ معلوم نہیں آج کل دن بھر میں بیگم سے کتنی مالیت کی گفتگو کرتے ہیں۔

ان فارغ افسروں میں کچھ افسر مزید فارغ تھے۔ یعنی وہ غم جاناں میں مبتلا تھے نہ غم دنیا میں۔ انہوں نے اپنے لئے کوئی روگ نہیں پالا تھا۔ ایک صاحب تو اپنے ہاتھ پر گھڑی تک نہ باندھتے تھے ان کے نزدیک وردی پہننا بجائے خود اتنا بڑا کام تھا کہ انہیں جو تنخواہ ملتی تھی وہ بمشکل اس کام کا معاوضہ بنتی تھی' اس میں گھڑی کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ فوج کا کوئی ضابطہ ان سے گھڑی پہننے کا تقاضا نہیں کرتا تھا۔ وقت کے بارے میں اندازے سے کام چلاتے تھے ان کا کہنا تھا کہ اندازے سے وقت کا پتہ چلانے میں انسان غلطی کرے بھی تو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کی کمی بیشی ہو سکتی ہے اور بقول ان کے اس سے کائنات کے نظام میں کوئی خلل واقع ہوتا تھا نہ خود ان کی صحت پر کوئی مضر اثرات مرتب ہوتے تھے۔ ان کی شہزادگی کا یہ رویہ بے نیازی اور کئی جگہوں پر اپنا اظہار کرتا تھا مثلاً کھانے کی میز پر ہم نے اکثر دیکھا کہ اگر کھانے کے بعد کنو' مالٹے یا سنگترے پیش کیے گئے تو انہوں نے اپنی پلیٹ بڑھا دی۔ سعودیہ میں ملنے والے پھل بلاشبہ دنیا کے بہترین پھل ہوتے تھے۔ کنو اور مالٹے بحیرہ روم کے اردگرد کے ممالک سے درآمد کیے جاتے تھے۔ انتہائی نفاست سے پیک کیے ہوتے تھے۔ ایک ایک دانے پر فارم یا برآمد کنندہ کا چھوٹا سا سٹکر لگا ہوتا تھا جو اس کے معیار کے بہترین ہونے کی علامت ہوتا تھا لیکن اس سارے اہتمام کے جواب میں ان صاحب کا کہنا تھا "کون چھیلے؟"

تو کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ جب آپ خود کسی مصروفیت کا انتخاب نہیں کرتے تو کوئی مصروفیت آپ کا انتخاب کر لیتی ہے۔

یونٹ میں ایک صاحب کو اس وہم نے گھیر لیا کہ ان کے دل کی دھڑکنوں میں باقاعدگی نہیں ہے۔ اب اس کا سیدھا سادا علاج تو یہ تھا کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا جاتا اور مختلف ٹسٹ کروا کے ایک ہی بار تسلی کر لی جاتی کہ بے قاعدگی ہے تو کتنی اور اسے معمول پر لانے کے لیے کیا احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں لیکن انسان کی نفسیات بھی عجیب ہے جب وہ وہم میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنے قریب ترین' عزیز ترین لوگوں کی بات نہیں مانتا۔ ماہرین کی رائے پر نہیں اپنی سوچ پر اعتماد کرتا ہے۔ ماہرین کی رائے اس کی سوچ کے برعکس ہو تو شک و شبے میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ای سی جی کروائی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ہر طرح خیریت ہے۔ دل بالکل معمول کے مطابق کام کر رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ ان کا چہرہ کھل اٹھتا' بجھ سا گیا۔ ڈاکٹر حیران' بولا "یوں لگتا ہے کہ تمھیں میرے جواب سے کچھ مایوسی ہوئی ہے"۔

ڈاکٹر کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ وہ صاحب جس وہم میں مبتلا تھے' اس کی تصدیق کر دی گئی ہوتی تو وہ ڈاکٹر کو بھی ڈاکٹر مان لیتے اور ہسپتال میں موجود سہولتوں پر بھی ان کا ایمان پختہ ہو جاتا۔ اس جواب سے ان کی تسلی ہونا تھی نہ ہوئی۔ اب ہوتا یوں تھا کہ دوستوں کا ایک گروپ بازار میں ونڈو شاپنگ میں مصروف ہے۔ سب ایک سمت میں جا رہے ہیں اور پتہ لگتا ہے کہ وہ صاحب غائب۔ نظر دوڑائی تو دیکھا کہ موصوف کافی دور کھڑے ہیں۔ قمیض کے بٹن کھولے' دایاں ہاتھ گریبان میں ڈال کر' دل پر رکھے کچھ سننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا ہاتھ زبردستی گریبان سے باہر نکالا جاتا' قمیض کے بٹن بند کیے جاتے اور یقین دلایا جاتا کہ وہ بالکل نارمل ہیں۔ ان کا اصرار ہوتا کہ نہیں کچھ ہوا تھا۔ اللہ انہیں اپنی امان میں رکھے۔ جس دن کچھ ہونا ہوگا انہیں قمیض کے بٹن کھول کر گریبان میں جھانکنے کی فرصت کب ملے گی۔ زندگی کی سب سے بڑی محافظ تو خود موت ہے جو کسی کو اپنے وقت سے پہلے مرنے نہیں دیتی۔ کئی لوگوں نے بتایا کہ وہ نماز کے لئے بھی کھڑے ہوتے ہیں تو آہستہ آہستہ گریبان کے بٹن کھول کر دایاں ہاتھ قمیض کے اندر لے جاتے ہیں اور یہ ہاتھ ان کے دل پر دھرا رہتا ہے۔ یہ بھولپن کی انتہا تھی۔ دل کی دھڑکنیں سننے کے لیے دل پر ہاتھ رکھنا کہاں ضروری ہے۔ خون کی کسی بھی شریان کو انگلیوں کی پوروں سے محسوس کیا جائے تو دھڑکنوں کی خبر لی جا سکتی ہے۔ لیکن آخر ہر وقت ان دھڑکنوں پر گوش بر آواز رہنا کہاں کی شرافت ہے۔ یہ وہم سعودی عرب

میں قیام کے آخری دنوں تک ان پر طاری رہا بلکہ ایک اور کپتان کو بھی لگ گیا۔ وہ ان کی طرح راہ چلتے اپنی نبضیں تو نہیں ٹٹولتے تھے لیکن ہر ہفتے ای سی جی اور دوسرے ٹسٹ ضرور کرواتے ہر بار یہ امید رکھتے کہ اس بار تو ضرور دھڑکنیں زیر زبر ہو چکی ہوں گی۔ کوئی نہ کوئی شریان پھٹ گئی ہوگی' دل میں کوئی سوراخ ہو گیا ہو گا اور کچھ نہیں تو کولیسٹرول لیول تو ضرور بڑھ گیا ہو گا۔ "سب اچھا" کی رپورٹ پر منہ لٹکائے واپس آ جاتے۔

جب یونٹ کی واپسی کی تیاریاں تھیں تو دل کے مرض میں مبتلا ہونے کے شوقین گرو اور ان کا چیلا ایک محفل میں بیٹھے تھے۔ موضوع زیر بحث تھا "شاپنگ" کون سی چیز کہاں سے خریدی جائے۔ کیسے سستی پڑے گی۔ آیا یہاں سے خریدنا مناسب ہے کہ پاکستان جا کر ڈیوٹی فری شاپس سے خریدنا بہتر رہے گا۔ کس پر کتنی ڈیوٹی لگے گی۔ گرو نے اپنی کسی تجویز کا اظہار کرنا چاہا تو چیلے نے چپ کروا دیا'

"سر! ہم نے کیا شاپنگ کرنی ہے۔ دونوں مل کر ای سی جی کی مشین خرید لیتے ہیں۔ ہر وقت دل کی دھڑکنیں سنا کریں گے"۔ گرو ناراض ہو گیا۔

بات ہو رہی تھی مصروفیت کی۔ ایک اور صاحب کو اور کچھ نہ سوجھی تو وہ اپنے عشق یعنی نرگسیت میں مبتلا ہو گئے بلکہ یوں کہئے کہ یہ بیماری انہیں لاحق تو پہلے سے ہو گی لیکن اس کی علامات بڑی شدومد سے وہاں ظاہر ہونا شروع ہوئیں۔ رنگ تو بلاشبہ ان کا گورا تھا لیکن محض چٹی چمڑی سے لوگ کہاں متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے انگریزیت کا سہارا لیا۔ جی ہاں۔ یہ لفظ ہم جان بوجھ کر استعمال کر رہے ہیں۔ بات جب صرف انگریزی تک محدود نہ رہے بلکہ انگریزی کے کلچر تک جا پہنچے تو اسے انگریزیت کہنے میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ صاحب فوج کے خرچ پر چند مہینوں کے لئے ایک مغربی ملک کیا ہو آئے' وہیں کے ہو رہے۔ منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولتے تھے اور بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ سٹاف کالج میں لوگ انہیں "دیسی انگریز" کہتے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم ان کے فخر اور شرم کے پیمانے کیا تھے۔ ان کے نزدیک یہ قابل فخر لقب تھا۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا (بلکہ ہم ہوتے کون تھے اعتراض کرنے یا نہ کرنے والے۔ اردو میڈیم) وہ انگریزوں کے کلچر کا بھی کھلم کھلا پرچار کرتے تھے مثلاً ان کے نزدیک چھری کانٹے سے کھانا کھانا' حفظان صحت کے اصولوں کے عین مطابق تھا اور اس سے

پانی کی بھی بچت ہوتی تھی کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ رفع حاجت کے بعد پانی استعمال کرنا گندگی ہے' نفاست ٹائلٹ پیپر کے استعمال میں تھی۔ یہاں تک بھی ہم معترض نہ ہوئے کہ ہر شخص اپنی ذاتی زندگی اپنی مرضی سے گذارنے کا حق رکھتا ہے لیکن ایک دفعہ یوں ہوا کہ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد تھکے ہارے ہم یونٹ واپس آئے۔ سخت بھوک لگی تھی۔ کھانے کی میز پر بیٹھے تو ویٹر نے ابلے ہوئے آلو' ڈبل روٹی کے دو سلائس' تلے ہوئے مٹر کے چند دانے' چکن کا ایک پیس' مکھن کی ایک ٹکیہ اور کالی مرچوں کی ایک نفیس سی ڈبیا سامنے لا رکھی۔ سخت بھنائے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ ویٹر بولا "سر! یہ انگلش فوڈ ہے۔۔ صاحب کی تجویز پر بطور خاص تیار کی گئی ہے"۔

سخت غصے کے عالم میں' ہم نے یہ "انگلش فوڈ" زہر مار کی۔ کھانے کے بعد میس سیکرٹری سے ملے۔ اس نے بتایا کہ۔۔ صاحب کی تجویز تھی' سی او نے مان لی ہے اب ہر ہفتے یہ پکا کرے گی۔ میس کا عام ممبروں کا استحقاق ایک سا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ جونیئر افسر یہ حق بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ یہ انہی موقعوں میں سے ایک تھا جب ہم نے اپنا یہ حق استعمال کرنا چاہا۔ تجویز پیش کی کہ رات کے کھانے پر سویٹ ڈش میں زردہ بنایا جائے اور آئندہ روز جو چھٹی کا دن تھا' ناشتے میں سری پائے یا حلوہ پوری ہونی چاہیے۔ میس اپنا تھا۔ خانسامے پاکستانی تھے۔ چیزوں کی فراہمی بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ از راہ احتیاط میس سیکرٹری نے باقی افسروں سے مشورہ کرنا چاہا۔ جس نے سنا' پھڑک اٹھا اور پورے زور و شور سے نہ صرف زردے اور سری پائے کی حمایت کی بلکہ اور بہت سے ایسے کھانے تجویز کیے جو خالص دیسی بلکہ ورنیکلر تھے' اردو میڈیم' دال چاول' حلیم' نہاری' آلو یا قیمے بھرے پراٹھے' سیخ کباب چکڑ چھولے' میس سیکریٹری گھبرا گیا۔ اس نے زردے اور سری پائے والی تجویز تو فوراً مان لی اور باقی آئندہ میس میٹنگ تک کے لیے اٹھا رکھیں۔

رات کے کھانے کے بعد ویٹر قاب میں زردہ لے کر آیا۔ "صاحب" نے پہلے تو غور سے اسے دیکھا۔ پھر بڑے تکلف سے گنتی کے چند چاول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے میس سیکرٹری سے پوچھا "یہ فنی آئیڈیا کس نے پیش کیا ہے؟"

میس سیکرٹری نے ہماری طرف اشارہ کر دیا۔ انہوں نے ہمیں گھورا۔ پہلے تو چپکے ہو رہے'

پھر رہا نہ گیا بولے "اشفاق! میں نے سنا تھا کہ یہ ڈش شادیوں کے موقع پر سرو (Serve) کی جاتی ہے"۔

اگر وہ ہمارا نام لئے بغیر اس رائے کا اظہار کرتے تو ہم شاید چپ رہتے۔ لیکن سوال براہ راست ہم سے کیا گیا تھا جواب ضروری تھا۔ "سر آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟" ہم نے پوچھا۔ گڑبڑائے کہ یہ کیا؟ سوال گندم' جواب چنا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولے' "ویل بلوچستان میں"۔

"سر! بلوچستان تو بہت بڑا صوبہ ہے۔ آپ کا خاص مقام پیدائش کون سا ہے؟"

"فورٹ سنڈیمن"

"اسے آج کل ژوب کہتے ہیں اور یہ پورے ضلع کا نام ہے۔ آپ اپنے گاؤں کا نام بتائیے"۔

انہوں نے کسی کلئے یا تنگلے کا نام لیا جو شہر سے کوسوں دور تھا۔

"سر! آپ نے پرائمری تعلیم کہاں حاصل کی؟"

"اپنے گاؤں میں"۔

"اور سیکنڈری ایجوکیشن؟"

"فورٹ سنڈیمن میں"۔ انہوں نے ژوب کو ایک انگریز کی یاد میں رکھے گئے پرانے نام سے پکارنے پر اصرار کیا۔

"اور آپ کو معلوم ہے کہ بلوچستان میں شرح آبادی فی میل عام صوبوں سے کم ہے؟"

"جی ہاں"

"اور جن علاقوں کے نام آپ لے رہے ہیں وہاں انسان اور بھی کم ہیں"۔

"درست"

"تو آپ کو کیا خبر کہ انسان کس موقع پر کیا کھاتے ہیں' کیا نہیں کھاتے۔ زردہ صرف شادیوں ہی پر نہیں' عام دنوں میں بھی کھایا جاتا ہے اور خوب کھایا جاتا ہے"۔

اتنی طویل جرح کے بعد ایک مختصر سے سوال کا اتنا تفصیلی جواب انہیں اس سے پہلے کب ملا ہو گا۔ انہوں نے چمچے سیدھے کیے' نیپکن میز پر پٹخا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

وہ واحد افسر تھے جو چھٹی والے دن بھی ناشتہ میس میں آ کر کرتے تھے۔ دوسرے دن ناشتے میں سری پائے تھے۔ ان کا "ساتھ" دینے کو اس دن ہم بھی میس چلے آئے۔ ایک دو اور افسروں کو بھی اشتیاق ہوا انہیں دیکھیں "دیسی انگریز" چھری کانٹے سے سری پائے کھاتا کیسا لگے گا۔

ہمیں میس میں دیکھ کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی اور ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے انہوں نے میس کے آداب پر اچھی خاصی سپیچ کر ڈالی (جو کچھ انہوں نے ارشاد فرمایا چونکہ انگریزی میں تھا اس لئے ہم سپیچ کہنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ ورنہ اردو میں اس کا متبادل موجود ہے) زور اس بات پر دیا گیا تھا کہ کھانا یا ناشتہ میس ہی میں کرنا چاہیے۔ ان کی سپیچ جاری تھی کہ ویٹر نے ڈونگا اور نان ان کے سامنے لا رکھے ساری خوش بیانی رخصت ہو گئی۔ وہ ہمیں گھورتے ہوئے میز سے اٹھ گئے۔ اس دن ناشتہ انہوں نے غالباً پہلی بار اپنے کمرے میں اور ہم نے میس میں کیا۔ لیکن وہ کب تک میس سے جان چھڑاتے۔ میس میٹنگ ہوئی 'نیا مینو بنا تو بہت سے افسروں کی تجویز پر دال چاول' حلیم' سیخ کباب' نہاری' آلو یا قیمے بھرے پراٹھے' سری پائے' مغز اور حلوہ پوری وغیرہ وغیرہ کھانے میں شامل کر لئے گئے۔ ایک دن "انگلش فوڈ" کے لئے مخصوص ٹھہرا۔ ہم نے میس سیکرٹری سے کہہ کر یہ اہتمام کروا لیا تھا کہ "انگلش فوڈ" والے دن ہمیں ڈبل روٹی کے سلائس کی جگہ تندور کی گرم گرم روٹی مل جایا کرے۔ اس روٹی سے "انگلش فوڈ" بڑی مزیدار لگتی تھی۔ ہم "انگلش فوڈ" اور دیسی کھانے مزے لے کر کھاتے اور گنگناتے۔

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

اور لوگوں کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ جیسے ہم انگلش فوڈ میں تھوڑی سی دیسی ترمیم کرتے تھے' وہ دیسی کھانوں میں انگلش فوڈ کی آمیزش کر لیں اور حلیم' نہاری یا سری پائے' نان یا تندوری روٹی کی بجائے ڈبل روٹی کے سلائسوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

قریب تھا کہ "صاحب" دیسی کھانوں کے ہاتھوں تنگ آ کر میس میں اپنی ہانڈی الگ کرنے کا انتظام کرتے کہ ہم نے ایک دن ان کا موڈ خوشگوار دیکھ کر بلوچستان کا ذکر چھیڑ دیا۔ پوچھا

"آپ کے ہاں کی سجی" بڑی مشہور ہے۔ کیا ہوتی ہے؟ کیسے بنتی ہے؟" اب جو انہوں نے سجی کی تفصیلات بیان کرنا شروع کی تو زبان چٹخارے لینے لگی۔ ان سے درخواست کی گئی کہ کسی دن سجی پکانے کا اہتمام کیا جائے۔ مہمان نواز افسر تھے۔ انہوں نے جھٹ حامی بھر لی اور ایک دن انہوں نے اپنی بیٹری میں سجی کی دعوت کا سچ مچ اہتمام کر ڈالا۔ سب نے مزے لے کر کھائی اور بجا طور پر خوب تعریف بھی کی۔ اس کے بعد سے انہیں دیسی کھانوں پر ناک بھوں چڑھاتے نہیں دیکھا گیا۔ اس طرح کم از کم کھانوں کی حد تک "صاحب" براستہ بلوچستان واپس پاکستان آ گئے۔

یونٹ کے تقریباً سبھی افراد کی اہم ترین مصروفیت شاپنگ تھی جس کا اصل آغاز تو کچھ دنوں بعد ہوتا تھا جب جیبیں گرم ہو جاتیں لیکن "ونڈو شاپنگ" تو خالی جیب بھی کی جا سکتی ہے یعنی مختلف بازاروں میں آوارہ گردی کر کے شوکیسوں میں سجی ہوئی برائے فروخت اشیاء کو دیکھ دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں سے کن چیزوں کی آپ کو اشد ضرورت ہے۔ یہ دور بھی عجیب دور ہے۔ ضرورت کے احساس کا عمل ہی الٹ گیا ہے۔ مادی ترقی کے نام پر انسان نے بہت کچھ پایا تو ہے لیکن یہ اختیار کھو دیا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیزوں کا انتخاب خود کر سکے۔ اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی کے اشتہارات اسے بتاتے ہیں کہ کن چیزوں کے بغیر اس کی زندگی ادھوری رہی جاتی ہے۔ اس کا سٹینس کیا ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے اسے کیا کچھ خریدنا چاہیے۔

سعودی عرب کے بازار پر رونق تھے اور دکانیں مال سے بھری ہوئی۔ سونے پر سہاگہ عربی زبان کے اشتہارات۔ اس زبان کی فصاحت و بلاغت کو اشتہاروں اور کاروبار میں خوب استعمال کیا گیا ہے۔ ریاض میں ایک بہت بڑی دکان دیکھنے میں آئی۔ اس کی پیشانی پر کوئی سوفٹ کا ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر بڑا سا ایک ہی لفظ لکھا تھا "لہا" یعنی اس خاتون کے لئے اور یہ سٹور صرف خواتین کے ذاتی استعمال کی اشیاء سے بھرا ہوا تھا۔ "اور اگر کوئی خاتون اس سٹور میں شاپنگ کرتے ہوئے مرد کی فراخ دلی سے متاثر ہو کر اس کے لئے کچھ خریدنا چاہے تو؟" ہم نے سڑک پر سے گزرتے ہوئے سوچا۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ یہاں سے گزرنا ہوا تو ایسا لگا جیسے کسی تاجر نے ہمارا خیال "سن" لیا ہو۔ "لہا" کے عین سامنے اتنا ہی بڑا ایک اور سٹور کھل چکا تھا اور اس کا نام تھا "لہ" یعنی "اس مرد کے لئے" اس میں صرف مردوں کے ذاتی

استعمال کی چیزیں تھیں۔

خمیس مشیط میں ہمارے قریب ہی ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا جس میں دنیا جہان کی اشیاء فروخت ہوتی تھیں۔ فرنیچر کی ایک دکان پر پچاس ہزار سے ایک ایک لاکھ ریال کے پلنگ بکتے تھے۔ پلنگ کیا تھے انسانی ذہن کی عیاشیوں کے شاہکار۔ مثلاً ایک پلنگ گول شکل کا تھا۔ اس پر نرم جھاگ جیسے گدے اور نفیس چادریں تو بچھی ہی تھیں لیکن اصل کمال اس کے سرہانے کی طرف بنے ہوئے لکڑی کے ایک پینل میں تھا جس پر مختلف بٹن لگے ہوئے تھے۔ ایک بٹن دبانے سے بستر پانی کی لہروں کی طرح ہلکورے لینے لگتا تھا۔ ایک اور بٹن سے آہستہ آہستہ گھومنا شروع کر دیتا تھا۔ ایک بٹن موسیقی بکھیرتا تھا تو ایک اور بٹن بستر کو سرہانے یا پائنتی کی طرف سے اسے اونچا یا نیچا کر دیتا تھا۔

ہمارے ایک افسر نے جو سعودی عرب کی بہت سی مارکیٹوں کے بیشتر سامان کو پاکستان "اپنے گھر" منتقل کرنے کے لیے ہمیشہ بے چین دکھائی دیتے تھے' اس بستر کے سامنے کھڑے ہو کر کولہے پر ہاتھ دھرے' پسندیدگی سے سرہلاتے ہوئے فرمایا" "یہ اس قابل ہے کہ اسے پاکستان لے جایا جائے لیکن اس کی پیکنگ کا مسئلہ رہے گا"۔

ایک اور افسر نے جو ان صاحب کے رومیٹ تھے اور ان کے اس طرح کے بیانات سے تنگ آئے ہوئے تھے' جھٹ پیشکش کی' "یار! تم اپنی سال بھر کی کمائی سے اسے خریدنے کی ہمت کرو۔ اس کا پیکنگ میٹریل تمھیں میں بنوا کر دوں گا"۔

افسوس یہ پلنگ خریدا گیا نہ اس کا پیکنگ میٹریل تیار ہوا۔ یوں پاکستان ایک ایسی شے کی درآمد سے محروم رہا جسے پاکر اس کا شمار راحت یافتہ ممالک میں کیا جا سکتا تھا۔

خوبصورت پلنگوں اور سیجوں کے شوقین یہ افسر ونڈو شاپنگ کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ کبھی کبھار شاپنگ بھی کر ڈالتے تھے لیکن یہ خرید مزید ونڈو شاپنگ کا سبب بن جاتی تھی۔ بات یہ تھی کہ وہ خدا خدا کر کے کوئی چیز خریدتے تو باقی لوگوں کو ایک مشغلہ ہاتھ آ جاتا تھا۔ ہر کوئی ان کی خریدی ہوئی چیز کو دیکھنے ضرور آتا۔ وہ خود بھی خرید کردہ اشیا کی نمائش ضروری خیال کرتے تھے۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ ہر کوئی ان کی خرید کردہ شے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال جاتا۔ ان صاحب کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا کہ کسی کو پکارتے سنا "لینا میاں۔ کوا تمھارا کان لے

گیا" تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے کان پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں' کوے کے پیچھے بھاگ اٹھیں گے۔ وہ ہر کسی کی بات پر یقین کرتے ہوئے اپنی خریدی ہوئی چیز کو لئے بازار میں پھرتے رہتے۔ اسی کے دوسرے برانڈ' رنگ اور قسمیں دیکھتے اور بلا استثناء اس نتیجے پر پہنچتے کہ ان سے خرید میں زبردست غلطی ہو گئی۔ واپس دکاندار کے پاس پہنچتے اور اسے بدل کر لاتے۔ یار لوگ کہاں چوکنے والے تھے وہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی عیب ڈھونڈ نکالتے وہ پھر اسے اٹھائے بازار پہنچ جاتے۔ ایک وال کلاک انہوں نے 'خدا جھوٹ نہ بلوائے' تو کوئی دس دفعہ بدلا ہو گا۔ گھنٹوں اور منٹوں کی سوئیاں چھوٹی بڑی تو ہوتی ہی ہیں۔ پہلی دفعہ کسی نے اعتراض جڑا کہ اس کی گھنٹے کی سوئی کچھ زیادہ ہی چھوٹی ہے۔ دوسری دفعہ کہا گیا کہ رومن ہندسوں کی جگہ انگریزی حروف ہوتے تو بہتر تھا۔ پھر کسی نے تین اور نو کے ہندسوں کے بارے میں کہہ دیا کہ ایک سیدھ میں نہیں ہیں۔

ایک بار انہوں نے ایک ڈیک خریدا۔ بڑے اہتمام سے اٹھوا کر کمرے میں لائے۔ پمفلٹ میں دی گئی ہدایات کے مطابق اس کے مختلف حصے جوڑے' تاریں لگائیں اور جب ہر کوئی اس کی تعریف کر رہا تھا' ان کے رومیٹ کیپٹن اختر نے "انکشاف" کیا کہ اس کی نابیں KNOBS ایک سیدھ میں نہیں ہیں۔ وہ جیسے پریشان ہونے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے تھے' آناً فاناً تاریں الگ کیں۔ مختلف حصوں کو کھولا' ڈبوں میں پیک کیا اور واپس دکان پر جا پہنچے۔ "اسے بدل دیں"۔

"کیوں بھائی۔ اس میں کیا خرابی ہے؟"

"اس کی نابیں ایک لائن میں نہیں ہیں"۔

"تمھارا دماغ ٹھیک ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"مجھے اس کا رنگ بھی پسند نہیں۔ سیاہ کی جگہ سلور رنگ والا دے دیں"۔ دکاندار نے جان چھڑانے کو بدل دیا۔

ڈیک پھر کمرے میں لایا گیا۔ کھولا گیا۔ پھر سے چالو ہوا۔ سی او پاس سے گذر رہے تھے۔ اونچی آواز میں ریکارڈنگ سنی تو "خیریت" دریافت کی۔ بتایا گیا کہ ایک نیا ڈیک خریدا گیا ہے۔ اسے چیک کیا جا رہا ہے۔ وہ بھی دیکھنے آئے۔ پسند کیا۔ چلتے ہوئے کہہ گئے کہ سلور کی جگہ سیاہ رنگ

ہوتا تو زیادہ خوبصورت اور باوقار رہتا۔

انہیں شاید معلوم نہیں تھا کہ ان کا یہ ایک فقرہ صاحب ڈیک پر کیا قیامت ڈھا جائے گا۔ ویسے بھی یہ کسی عام آدمی کی رائے نہیں تھی۔ کمانڈنگ آفیسر کی رائے تھی۔ رات زیادہ گذر چکی تھی۔ دکان کے کھلے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ سو رات انہوں نے کروٹیں بدلتے گذاری۔ دوسرے دن پہنچ گئے۔ سٹور پر "سیاہ رنگ کا دے دیں لیکن کوئی ایسا جس کی نابیں ایک سیدھ میں ہوں"۔

"میرے تمام سیاہ ڈیکوں کی نابیں ٹیڑھی میڑھی ہیں۔ تم راستہ ناپو"۔ دکاندار نے ڈیک بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔ کئی دنوں تک موصوف کی شامیں وہیں گذرتی رہیں۔ ہر شام نئی دلیل، نیا موقف۔ دکاندار یلا یلا پر بھی اتر آیا لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ بالآخر اس کمپنی کے ہیڈ کوارٹر سے کوئی سینئر افسر معائنے کے لئے خمیس مشیط تشریف لائے۔ یہ صاحب ان سے بھی ملے۔ انہوں نے از راہ عنایت ڈیک تبدیل کروا دیا۔ جب وہ خوشی خوشی ڈبے کھول کر ڈیک کو ترتیب دے رہے تھے، کیپٹن اختر ہاتھ میں فٹا لئے، اس کی نابیں چیک کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔

☆☆☆☆☆

ہم توپخانے کے ایک یونٹ کے ساتھ بطور مترجم متعین تھے اور اس یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیر) ریاض احمد ملک پورے شہر میں موجود تمام پاکستانی افسروں سے سینئر تھے۔ اس لئے ہمارا یونٹ گویا تمام پاکستانیوں کے لیے ہیڈ کوارٹر کا سا کام کرتا تھا۔ اس سینیارٹی کا فائدہ تو یہ تھا کہ پاکستانی جہاں بھی واقع تھے ہم سے رابطہ رکھتے تھے اور اپنے ہم وطنوں سے قربت کا احساس دیار غیر میں اجنبیت کو کم کرتا تھا لیکن نقصان یہ تھا کہ جہاں کہیں کوئی مسئلہ درپیش ہوتا، مترجم ہونے کے ناطے ہماری پکار پڑتی۔

ہمارا اپنا یونٹ ہی کچھ کم نہ تھا۔ توپخانے کے یونٹ میں جوانوں کی وردیوں کے سٹور کے علاوہ بے تحاشا گاڑیاں، بے شمار ریڈیائی سامان، سروے کے مختلف آلات، طبی ساز و سامان اور اصلاح و مرمت کے شعبے کی ان گنت اشیاء ہوتی ہیں اور مسئلہ یہ تھا کہ تمام خط و کتابت بزبان عربی تھی۔ یونٹ میں آنے والی تمام ڈاک عربی میں ہوتی جسے ہم انگریزی کے قالب میں

ڈھالتے۔ سٹاف افسران یعنی ایڈجوٹنٹ، ٹرانسپورٹ آفیسر، کوارٹر ماسٹر، سگنل آفیسر یا سروے آفیسر سے ہوتی ہوئی یہ ڈاک سیکنڈ ان کمانڈ اور کمانڈنگ آفیسر تک جاتی۔ شروع شروع میں تو سٹاف افسر لکھ کر اس کا جواب دیتے جسے عربی میں ڈھالا جاتا اور کمانڈنگ آفیسر کے دستخطوں سے خط متعلقہ دفتر کو چلا جاتا لیکن آہستہ آہستہ یوں ہوا کہ سٹاف افسروں نے تھوڑی بہت انگریزی لکھنی بھی چھوڑ دی۔ خطوں کے جواب وہ زبانی ہمیں سمجھا دیتے۔ اس کے بعد عربی ڈاک کا پلندہ ہوتا اور ہم۔

اب مسئلہ صرف یونٹ کے لیے گاڑیوں اور دیگر اشیاء کی ڈیمانڈ کرنے تک محدود ہوتا تو ہم کبھی کے شتابی سے فارغ ہو چکے ہوتے لیکن ہماری مثال گاؤں کے اس منشی کی سی تھی جو پاؤں میں درد ہوتا تو لوگوں کے خط لکھنے سے انکار کر دیتا تھا کیونکہ خط پڑھنے کے لیے بھی دوسرے دیہات سے اسے ہی طلب کیا جاتا تھا۔ ہمارے خط پڑھ تو لیے جاتے تھے لیکن بات محض خط و کتابت تک محدود نہ رہتی بلکہ کچھ مسائل ایسے اٹھ کھڑے ہوتے جنہیں حل کرنے کے لیے مزید بھاگ دوڑ کی ضرورت پیش آتی۔ اور اس کے لیے ہمارا ساتھ ہونا ضروری قرار پاتا۔

شروع شروع کے دن تھے۔ ہم نے یونٹ کے لیے توپوں، گاڑیوں اور ٹرکوں کی ڈیمانڈ بنائی۔ خط جب ٹائپ ہو کر مکمل ہوا تو دفتری اوقات ختم ہونے کو تھے۔ یونٹ کے کوارٹر ماسٹر کیپٹن محمد اسلم حسب معمول جلدی میں تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم ڈیمانڈ لے کر ان کے ساتھ ایریا ہیڈ کوارٹر چلیں تاکہ مذاکرات کی ضرورت پیش آئے تو وقت نہ ضائع ہو۔ ہم جب متعلقہ ہیڈ کوارٹر پہنچے تو قائد المنطقہ میجر جنرل سعد علی الموینع دفتر سے جا چکے تھے۔ متعلقہ آفیسر نے ڈپٹی کمانڈر سے دستخط کروانے کو کہا۔ پتہ چلا کہ وہ بھی دفتر سے اٹھ گئے ہیں۔ باہر آ رہے تھے تو دیکھا وہ اپنی گاڑی میں بیٹھنے کو تھے۔ سعودی آفیسر نے اشارہ کیا کہ وہ رہے جنرل فراج، ان سے دستخط کروالو۔ یہ کہہ کر وہ تو دفتر کی لابیوں میں گم ہو گیا ہم حیران و پریشان کہ اتنی اہم ڈیمانڈ ہے توپوں سمیت کل گاڑیوں کی تعداد ڈھائی سو کے قریب بنتی تھی یوں کھڑے کھڑے جنرل صاحب کب دستخط کریں گے اور آیا اس وقت ان سے بات کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ جنرل صاحب نے خود ہی ہمیں بلا لیا۔ پوچھا کیا پریشانی ہے۔ بتایا کہ

ایک ڈیمانڈ تھی۔ انہوں نے فائل لی' ایک نظر اسے دیکھا' جیب سے قلم نکالا اور پوری ڈیمانڈ کو من و عن منظور کرتے ہوئے دستخط ثبت فرمادیے۔ فائل ہمیں تھماتے ہوئے بتایا کہ اسے فلاں ڈپو میں دے آؤ۔ ہم بے یقینی کی حالت میں فائل کو دیکھ رہے تھے کہ جنرل صاحب گاڑی میں بیٹھ' یہ جاوہ جا۔ حیرتوں کے کچھ اور باب ابھی کھلنے کو تھے۔

متعلقہ ڈپو گئے تو دیکھا ایک حوالدار کان پر نیازبو کے پتے لگائے فائلوں کے ڈھیر میں گم ہے۔ ہمارے ہاں وردی پہننے کے کچھ آداب ہیں۔ لیڈی ڈاکٹرز اور نرسیں بھی وردی پہنتی ہیں تو بننے سنورنے کا بنیادی حق رکھنے کے باوجود' وردی کے ساتھ بالوں میں گلاب' جوڑے میں موتیے کے ہار یا دیگر بھاری زیورات استعمال نہیں کرتیں۔ وردی بذات خود انسان کو بڑا وقار عطا کرتی ہے۔ نیازبو کے پتوں کی خوشبو اپنی جگہ لیکن وردی کے ساتھ انہیں کانوں میں اڑس لینا ہمارے نزدیک زیادتی تھی۔ حوالدار سے پوچھا کہ یہ کیا لگا رکھا ہے تو اس نے مسکراتے ہوئے اپنی میز کی دراز کھولی اور ایک نازک سی شاخ ہمیں بھی تھمادی۔ بڑی بھینی بھینی خوشبو تھی۔ لیکن ہم گاڑیاں لینے نکلے تھے۔ خوشبوؤں پر قناعت کیسے کر لیتے۔ فائل حوالدار کے آگے رکھ دی۔ وہ کچھ دیر تو فائل کو گھورتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے ایک الماری کھولی اور رنگین چاکوں کا ایک ڈبہ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کچھ بولا۔ لیکن سمجھ نہ آئی۔ ہم گاڑیاں لینے آئے تھے۔ جواب میں پہلے ہمیں نیازبو کے پتے ملے تھے' اب چاکوں کا ڈبہ پیش کیا جا رہا تھا۔ کوارٹر ماسٹر نے ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا'

"استاذی! یہ کس چیز کی ڈیمانڈ بنادی ہے۔ میں بھی تو کہوں کہ جنرل نے کھڑے کھڑے یوں بے نیازی سے دستخط کیسے کر دیے؟"۔

تھوڑی دیر کے لئے تو ہم بھی چکرا گئے۔ یونٹ میں افسروں کے لیے عربی کی ایک کلاس شروع کرنے کا پروگرام تھا اور اس کے لئے تختہ سیاہ' ڈسٹر' چاک' پنسلوں اور روشنائی کی دواتوں وغیرہ کی ایک ڈیمانڈ بھی بنائی تھی لیکن اس ڈیمانڈ کی تیاری میں بھی ہم نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا تھا اور اس بات کا قطعاً امکان نہیں تھا کہ توپوں سمیت بھاری بھر کم گاڑیاں' جیپیں اور ٹرک چاک یا پنسلوں کے کسی ڈبے یا روشنائی کی کسی دوات میں بدل جاتے۔ البتہ فائل کے بدلنے کا امکان تھا۔ ہم نے فائل دیکھی۔ سو فیصد گاڑیوں والی فائل ہی تھی۔ پھر

چاک کا ڈبہ کیوں؟ ہماری پریشانی بھانپتے ہوئے عرب حوالدار نے ذرا سلیس زبان میں وضاحت کی تو بات سمجھ میں آئی۔

ہم نے جو ڈیمانڈ بنائی تھی وہ توپخانے میں مروج عسکری اصطلاحوں کے مطابق بنائی تھی اور ان اصطلاحوں کے مطابق ہر وہ چیز جو چار پہیوں پر دوڑتی ہو محض گاڑی نہیں کہلاتی بلکہ اس کے مخصوص نام ہوتے ہیں جیسے کوارٹر ٹن جیپ' ڈیڑھ ٹن ٹرک' ڈھائی ٹن ڈاج وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو پہیوں کی بجائے لوہے کے ٹریک پر چلتی ہو' ضروری نہیں کہ ٹینک ہی ہو۔ یہ کوئی توپ بھی ہو سکتی ہے۔ اور بکتربند گاڑی بھی۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں رہتی۔ توپخانے میں توپ سے ملتی جلتی اور گاڑیاں بھی ہوتی ہیں جیسے کمانڈ پوسٹ۔ نام سے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ زمین پر واقع کوئی چوکی ہو لیکن درحقیقت یہ ایک بکتربند گاڑی ہوتی ہے جہاں سے کمانڈنگ آفیسر حرکت میں رہتے ہوئے اپنے توپخانے کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس میں مواصلات کے آلات کے علاوہ مقامی دفاع کے لیے مشین گنیں بھی لگی ہوتی ہیں اور بظاہر یہ توپ ہی دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح ایک اور گاڑی شاپ وین کہلاتی ہے۔ یہ اصلاح و مرمت کے شعبے سے متعلق ہوتی ہے۔ ترپالوں اور کینوس کی موٹی چادروں کے ذریعے اس کے اردگرد پوری ورکشاپ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک گاڑی سروے گاڑی کہلاتی ہے جو سطح زمین کو ماپنے' تاکنے کے کام آتی ہے۔ ڈپو کا انچارج یقیناً بہت قابل' سمجھدار' لائق و فائق حوالدار ہو گا کہ رتبے میں کم ہونے کے باوجود اسے اتنے بڑے ڈپو کا انچارج بنایا گیا تھا جس میں کروڑوں ڈالروں کا سامان پڑا تھا لیکن کسی ایک شعبے کے ذہین ترین فرد کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ تمام شعبوں کی باریک ترین تفصیلات جانتا ہو۔ عرب حوالدار کا کہنا تھا کہ چاک کا ڈبہ لے کر ہم ڈپو کے اندر جائیں اور مطلوبہ گاڑیوں اور ان کے فاضل پرزہ جات کے ڈبوں پر نشان لگادیں۔ دوسرے دن گاڑیاں مل جائیں گی۔ اس وقت تک یونٹ کے ٹرانسپورٹ افسر کیپٹن ممتاز احسن چیمہ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ مطلوبہ گاڑیوں پر ٹھیک ٹھیک نشان لگانے کے لیے چاک کا ڈبہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔

دوسرے دن ایک اور مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔ یونٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر (اب فل کرنل) خالد نکا اور کوارٹر ماسٹر اسلم ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ توپوں سمیت ڈھائی سو

گاڑیاں متعلقہ ڈپو کے باہر سڑک پر کھڑی ہیں اور ڈپو کا انچارج حوالدار بضد ہے کہ فوراً انہیں وہاں سے لے جایا جائے۔ ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ یونٹ میں اتنے ڈرائیور موجود نہیں تھے۔ جو تھے وہ پاکستان سے نئے نئے آئے تھے اور انہیں لیفٹ ہینڈ ڈرائیونگ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ خدشہ تھا کہ گاڑیوں کا یہ بیڑا یونٹ آتے آتے کوئی گل نہ کھلا دے۔ ڈپو گئے اور حوالدار سے بات کی کہ بھئی اتنی جلدی کیا تھی۔ ہم تھوڑی تھوڑی کر کے گاڑیاں لے جاتے' یہ تمام گاڑیاں یک دم باہر کیوں نکلوا دیں۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ضرورت نہیں تھی تو ڈیمانڈ کیوں دی تھی۔ ہم اسے کیسے سمجھاتے کہ ضرورت تو تھی لیکن ہم اس معاشرے سے آئے تھے جہاں پستول کا لائسنس لینے کے لیے توپ کی درخواست دینی پڑتی ہے اور پھر بھی برسوں انتظار کا چلہ کھینچنا پڑتا ہے۔ ڈرائیوروں والی مجبوری بتائی تو اس نے صاف کہا کہ یہ ہمارا درد سر تھا' ڈیمانڈ دینے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ وہ اپنی کاروائی مکمل کر چکا تھا اور گاڑیاں واپس ڈپو میں نہیں جا سکتی تھیں۔

خالد نکا' جنرل ٹکا خان کے بیٹے ہیں۔ جن دنوں ٹکا خان پاک فوج کے چیف آف آرمی سٹاف تھے' وہ ان کے ساتھ سعودی عرب کے دورے پر جا چکے تھے۔ ماشاء اللہ ذہین ہیں' سیماب صفت طبیعت کے مالک' گفتگو کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ انہوں نے تجویز کیا کہ ملٹری پولیس کے پاس چلتے ہیں اور ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ شہر کی ٹریفک بند کروا دیں تاکہ گاڑیوں کا قافلہ بحفاظت یونٹ پہنچ سکے۔

ملٹری پولیس کے کمانڈنگ آفیسر نے میجر خالد کو فوراً ہی پہچان لیا۔ بڑے تپاک سے ملے۔ قہوہ پلایا لیکن ٹریفک بند کرنے کی تجویز پر ہنسنے لگے۔ بولے کہ ٹریفک تو شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز (وزیر دفاع) کے آنے پر بند نہیں ہوتی' ان گاڑیوں کے لیے کیسے بند کر دیں۔ بادشاہت کے راج میں ایسی گفتگو ہماری سمجھ سے بالاتر تھی لیکن آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ سعودی عرب میں بادشاہت کے باوجود عام آدمی سکون کا سانس لیتا ہے وہاں ہٹو بچو کا شور نہیں ہے۔ جھنڈے والی کسی گاڑی کے لئے ٹریفک بند نہیں ہوتی۔ جرنیلوں کی گاڑیوں کے آگے پیچھے ستاروں والی پلیٹ نہیں ہوتی۔ اپنی گاڑیاں وہ خود ہی ڈرائیو کر لیتے ہیں بلکہ کہیں ٹریفک پولیس کا سپاہی (شرطہ) گاڑیوں کے کاغذات کی چیکنگ کر رہا ہو تو بلا امتیاز ہر کوئی

صبر کے ساتھ قطار میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ پاکستان کی عادات کے مطابق ہمیں خود جب پہلی مرتبہ کاغذات کی چیکنگ کے لئے روکا گیا تو ہم "نقیب" یعنی کپتان کہتے ہوئے بے نیازی سے گذرنے لگے۔ شرطے نے اس رویے پر وہ ہنگامہ برپا کیا کہ جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ سعودی عرب میں جو عادات پختہ ہوئیں ان کی وجہ سے پاکستان میں کئی بار ٹریفک پولیس کے طعنے سننے پڑے۔ سول کپڑوں میں ہوتے ہوئے روکا گیا تو اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر ہم نے کاغذات پیش کر دیے۔ کوئی پڑھا لکھا سپاہی ہوتا تو کاغذات دیکھ کر سیلوٹ کرتا اور شکایت بھی "سر! آپ نے پہلے بتا دیا ہوتا"۔ جاہل سپاہی کاغذات ہاتھ میں رکھ کر رعونت سے پوچھتے "کیا کام کرتے ہو؟"۔ رینک جان کر گڑبڑا جاتے۔ سعودی عرب میں ایسی سہولت حاصل نہ تھی۔ ہم فوج کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ فوجی مشقوں کے دوران ہم نے جرنیلوں اور سپاہیوں کو ایک ہی خیمے میں کھاتے پیتے' آرام کرتے بلکہ لطیفوں کے تبادلوں پر ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہے لگاتے دیکھا۔ یہ بعد کی بات ہے لیکن اس دن جب ملٹری پولیس نے ٹریفک بند کرنے سے معذرت کا اظہار کیا تو ہمیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ جمہوریت کی خوبیوں سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ طے یہ ہوا کہ آدھی رات کے وقت جب ٹریفک کافی کم ہو جاتی ہے' ہم اپنی گاڑیاں لے جائیں۔ ملٹری پولیس سڑکوں پر موجود ہو گی اور ضروری مدد بہم پہنچائے گی۔ رات گئے شروع ہونے والا یہ اپریشن صبح تک مکمل ہوا۔

سرکاری گاڑیوں کے علاوہ یونٹ کے افسروں نے ذاتی گاڑیاں بھی خرید لیں۔ گاڑیوں کی ریل پیل ہو گئی۔ اس کے بعد متعلقہ مسائل نے اتنی شدومد سے سر اٹھایا کہ سانس لینا کہیں ارادی افعال میں شامل ہوتا تو ہم کبھی کے انا للہ ہو چکے ہوتے۔ صرف گاڑیوں سے متعلق خط و کتابت کے لیے عربی کے ایسے ذخیرہ الفاظ کی ضرورت پیش آئی جو خود اردو میں بھی موجود نہیں ہیں مثلاً پلگ' پوائنٹ' ایئر فلٹر' انجن آئل کی تبدیلی' سٹیئرنگ' کلچ یا بریکوں کی ایڈجسٹ منٹ' بیٹری چارجنگ' فیول پمپ' ہارن" وائپرز یا گیئر کی خرابی' انجن کی اوور ہیٹنگ' ویل الائنمنٹ' کاربوریٹر کی صفائی' شاک ابزوربر یا سپرنگوں کی لچک کا ختم ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ دقت تو بڑی دقت پیش آئی لیکن یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ ان تمام الفاظ کے لیے عربی کے مترادفات موجود تھے۔ گرچہ کچھ الفاظ کو معرب کیا گیا تھا یعنی کھینچ تان کر عربی کے قالب میں

ڈھال دیا گیا تھا لیکن زیادہ تر الفاظ بالکل عربی ہی کے تھے۔

پہلے تو گاڑیاں اصلاح و مرمت کے لیے ورکشاپ جاتی تھیں۔ پھر یونٹ کے الیکٹریکل اینڈ مکینیکل آفیسر نے یونٹ ہی میں ایک سروس سٹیشن کھولنے کی تجویز پیش فرمائی جو یونٹ کے لیے تو بہت مفید قرار دی گئی لیکن ہم نے اسے خون کے گھونٹ پی کر سنا کہ اس کی تعمیر کے لیے جن اشیاء کی ڈیمانڈ کی جانے والی تھی ان کے نام ہمارے ذخیرہ الفاظ میں موجود نہ تھے۔ بات صرف اینٹوں، سیمنٹ یا گارے تک محدود رہتی تو ہمیں کیا فکر تھی لیکن متعلقہ افسر نے انگریزی میں جو ڈیمانڈ تیار کی اس میں اینٹوں اور سیمنٹ کے علاوہ سو کیج پٹ (Sockage pit) سیوریج، پانی کے ٹینکوں اور مختلف النوع (آپ کم از کم اس لفظ کو تو ٹھیک تلفظ کے ساتھ 'ذرا حلق سے نکال کر پڑھیں کہ ہماری حالت زار کا کچھ اندازہ کر سکیں) پائپوں سے لے کر گاڑیوں کی صفائی کے لئے مختلف آلات از قسم پائپ رینچ، بینڈ پائپ، ایڈجسٹ ایبل پائپ رینچ، ٹی جوائنٹ، چوڑی دار پائپ، ٹکلے اور جانے کیا کچھ شامل تھا۔

سب سے حیران کن تجربہ "سپلائی" کی ڈیمانڈ بناتے ہوئے ہوا۔ "سپلائی" کے شعبے میں روز مرہ کے لباس اور کھانے پینے کی اشیاء شامل تھیں۔ ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ ہم جو کچھ خاطر میں لائے بغیر پہنتے رہتے ہیں یا کھاتے پیتے رہتے ہیں وہ کتنی "مشکل" اشیاء ہیں اور ان کے نام کس قدر پیچیدہ۔ نیز یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے پہلی بار نام سکھائے تھے تو ان پر کیا بیتی ہو گی۔ غالب امکان یہی ہے کہ یہ نام عربی میں سکھائے گئے ہوں گے کیوں کہ جنت میں رائج زبان عربی ہی بتائی گئی ہے اب یہ معلوم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو صرف انہی اشیاء کے نام سکھائے گئے تھے جو اس وقت موجود تھیں (اور یقیناً محدود ہوں گی کہ انسان اس وقت تک تو لباس تک سے بے نیاز تھا جو بعد میں اس کی بنیادی ضرورت ٹھہرا) یا بعد میں وجود میں آنے والی اشیاء کے نام بھی اسی وقت سکھا دیے گئے تھے۔

اگر ایسا تھا تو حضرت آدم علیہ السلام کو یقیناً بڑی مشکل پیش آئی ہو گی۔ انہیں تو قیامت تک رائج ہونے والی اشیاء کے نام سکھائے گئے ہوں گے۔ ہم پندرھویں صدی کے آغاز میں صرف چند شعبوں سے متعلق جن اشیاء کے نام دریافت کرنے کے عمل سے گذر رہے تھے، وہ قیامت سے کم نہ تھا۔

ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ وردیوں کی ڈیمانڈ کے جواب میں جو بے شمار کپڑے وصول ہوئے، ان میں زیادہ تر تو ٹھیک ٹھاک ہی تھے لیکن ٹوپیوں اور انڈرویئروں (جنہیں کچھے کہنا زیادہ مناسب ہو گا) کے سائز غیر معمولی طور پر چھوٹے بڑے تھے یعنی ٹوپیاں تو اتنی چھوٹی تھیں کہ یونٹ کے کم سے کم حجم کے سر والے شخص کو بھی پوری نہ آتی تھی اور انڈرویئر اتنے کھلے اور بڑے تھے کہ اچھا بھلا پہلوان نما شخص بھی پہنتا تو نیفہ اس کے سینے پر ہوتا اور نچلا حصہ گھٹنے کو چھو رہا ہوتا۔ "استاذی! یہ کیا منگوا لیا ہے"۔

کسی نے پوچھا۔

"میں نے سائز تو نہیں دیے تھے"

"تو پھر یہ تمام ٹوپیاں اتنی چھوٹی اور تمام انڈرویئر اتنے بڑے کیوں ہیں؟"

ہمارا بس چلتا تو پورے یونٹ کو نیچرل لباس ہی میں رکھتے کہ وردیوں کی ڈیمانڈ تیار کرنا آسان کام نہ تھا۔ عام کپڑوں کے علاوہ اس میں بیلٹ، بکل، شولڈر ٹائٹل، ہپ، چاند ستارے، فیتیاں وغیرہ، شامل تھیں اور سعودیوں نے تمام اشیاء بلاچون وچرا بھجوا دی تھیں، اب اگر وہ ہمارے جسموں کے محض دو حصوں کے بارے میں کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار ہو گئے تھے تو اس میں چیں بجبیں ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

منزل ہائے فکر و شوق

یونٹ میں کام تو زیادہ تھا لیکن اسے ہم نے چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ دن رات اسی فکر میں رہتے تھے کہ کس شعبے کے بارے میں ذخیرہ الفاظ کہاں سے مل سکے گا بلکہ فکر کا لفظ اس کیفیت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا جو ہم پر طاری رہتی تھی یہ فکر اور شوق کی درمیانی منزل تھی۔

فکر فکر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک فکر تو وہ ہوتی ہے جس کے پیچھے سوچ بچار کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے۔ مکتب فکر کے نام سے جانی جاتی ہے جیسے فکر اقبال' فکر حالی' فکر آزاد' یہ یونہی کسی کے نام سے منسوب نہیں ہو جاتی۔ اس کے لیے ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔ زمین اپنے بانجھ پن کا ماتم کرتی ہے۔ پھر ایسے انسان میسر آتے ہیں جو ذاتی آسائشوں کو بھلا کر اصلاح انسانیت کا بیڑا اٹھاتے ہیں زخم کھا کر مسکراتے ہیں' گالیاں سن کر دعا دیتے ہیں۔ راتوں کے پچھلے پہر اٹھ کر غور و فکر کرتے ہیں ؎

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

تب کہیں قبولیت کے در وا ہوتے ہیں' ان کی فکر اپنائی جاتی ہے۔

ایک فکر وہ ہوتی ہے جو محض اپنی یا اپنی ذات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے تشویش بن کر ابھرتی ہے جیسے ماں کو جوان بیٹی کے بر کی تلاش' باپ کو بیٹے کے لیے اچھے سکول میں داخلے کی جستجو' بیروزگار شخص کو ملازمت کی تمنا' بارانی علاقے کے دہقان کو بارش کا انتظار' گندم کی بالیوں میں دانے پک جائیں تو بارش کے چھینٹے پڑنے سے پہلے فصل اٹھانے کی کوشش' وقت کم رہ جائے تو سٹیشن یا ائیرپورٹ پہنچنے کی جلدی' اپنی جمع پونجی انتخابی مہم میں صرف کر کے ہار جیت کے فیصلے کا انتظار۔ اس فکر کی اڑان محدود ہوتی ہے' تمنائیں مختصر اور عارضی۔ پوری ہو

جائیں تو انسان وقتی طور پر سکون کا سانس لیتا ہے تا آنکہ پھر کوئی فکر اسے گھیر لیتی ہے اور ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

شوق کے مرحلوں میں اس فکر کے دائرے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس فکر میں قناعت کی گنجائش ہی نہیں۔ شوق میں بے نیازی بت ہے۔ حاصل تمنا کے سوا ہر چیز سے منہ موڑ لینے کا حوصلہ ؎

مجھے فکر جہاں کیوں ہو' جہاں تیرا ہے یا میرا

شوق کی اڑانیں وسیع ہوتی ہیں تمنائیں لامحدود جیسے شہد کی مکھی شہد بنانے کی لگن میں پھول پھول منڈلاتی پھرے' دنیا دیکھنے کا خواہش مند' ملک ملک کی سیاحی کرتا رہے' موسیٰ سے پوچھا جائے تیرے ہاتھ میں کیا ہے تو اللہ سے ہمکلام رہنے کے شوق میں وہ عصا کے استعمال کی تفصیلات بیان کرتے رہیں۔ جیسے روز محشر کامیاب رہنے والے سے سوال کیا جائے کہ زندگی کی طرف کون لوٹنا چاہے گا تو راہ حق کا شہید کھڑا ہو جائے' "میں چاہوں گا کہ تیری راہ میں قتل کیا جاؤں' زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں"۔

فکر آخرت میں مبتلا شخص فرائض کی ادائیگی کا بڑا اہتمام کرتا ہے لیکن اپنے رب سے ملاقات کا شوق رکھنے والوں کی نظروں میں دنیا بالکل ہی بے توقیر ہو جاتی ہے۔

بنا کے تجھ کو مولا' خود کو بندہ کر لیا میں نے
منگا ہو کہ سستا ہو' یہ سودا کر لیا میں نے

ایک دفعہ ہارون رشید سر شام دجلہ کی سیر کو نکلا۔ ملکہ زبیدہ بھی پالکی میں ہمراہ تھی۔ دریا کنارے ایک مجذوب کو دیکھا کہ مٹی کے گھروندے بنا رہا ہے۔ ہارون رشید نے پوچھا' یہ کیا ہے۔ بولا "جنت کے گھروندے ہیں۔ خریدو گے؟"۔

ہارون رشید ہنس دیا اور گزر گیا۔ ملکہ زبیدہ کی پالکی مجذوب کے قریب سے گزری پوچھا' "یہ کیا ہیں؟"۔ بولا "جنت کے گھروندے ہیں خریدو گی؟"۔

"بصد شوق" ملکہ زبیدہ نے اشتیاق ظاہر کیا۔

"کتنے لوگی؟" سوال ہوا

"جتنے ہیں سبھی دے دو"۔ ملکہ نے ایک قیمتی موتی مجذوب کے حوالے کر دیا۔

رات کو ہارون رشید نے خواب دیکھا کہ ایک بہت بڑا آبدار موتی ہے اتنا بڑا کہ اس میں ایک باوقار محل بنا ہوا ہے۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہے "قصر زبیدہ"۔ ہارون رشید اس میں داخل ہونا چاہتا ہے تو درشت رو دربان اس کی راہ روک لیتے ہیں کہ زبیدہ کے محل میں اجنبی داخل نہیں ہو سکتے۔ آنکھ کھلتی ہے تو ہارون رشید کو ایک ہی فکر کہ وہ سودا جو کل نہ ہو سکا آج ہو جائے۔ شام ہوئی سیر کو نکلا۔ مجذوب دریا کنارے موجود تھا۔ گھروندے بنا رہا تھا۔ پوچھا "یہ کیا ہیں؟"

بولا "ریت کے گھروندے"

"اور وہ جنت کے گھروندے کیا ہوئے" ہارون رشید نے پوچھا۔

"میاں وہ غیب کا سودا تھا۔ مشاہدے کے بعد تو شوق شوق نہیں رہتا۔ لالچ کہلائے گا"۔

تو صاحبو! ہم فکر اور شوق کی درمیانی منزلوں میں تھے۔ دفتری اوقات میں ہمیں سرکاری کاموں کی تکمیل کی فکر رہتی۔ جو لفظ سمجھ میں نہ آتے ڈکشنریوں میں ڈھونڈتے۔ قریبی یونٹوں کے افسروں سے مدد لیتے یا سکول آف آرٹلری چلے جاتے لیکن دفتری اوقات کے بعد بھی نئے نئے الفاظ جاننے کی جستجو رہتی۔ کسی تقریب میں جانا ہوتا تو لوگ محض لذت کام و دہن میں مصروف رہتے، ہم کرید کرید کر کھانوں کے نام پوچھتے۔ پکنک پر جاتے تو لوگ سیر کا لطف اٹھاتے، کسی نہ کسی کھیل کا اہتمام کرتے ہم مختلف جگہوں پر لگی تختیاں پڑھتے۔ بازار میں لوگ شاپنگ کے لیے جاتے تو ہمیں ساتھ لے جاتے۔ ہماری نظریں بورڈوں پر مرکوز رہتیں اور کان عربوں کی باہم گفتگو پر۔

اسی دوران یہ بات بھی تفصیل سے سمجھ میں آئی کہ ہر معاشرے کی اپنی کچھ اقدار ہوتی ہیں، لوگوں کی اپنی عادتیں جنہیں سمجھے بغیر ابلاغ کا عمل پورا نہیں ہو سکتا۔ یعنی تمام تر زبان دانی کے باوجود آپ اپنی بات سمجھا سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ جو انگریزی رسالوں میں لکھے ہوئے لطیفے کبھی کبھار سمجھ میں نہیں آتے حالانکہ لفظ اور حروف سب سمجھ میں آتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ثقافتی روایات سے لاعلمی ہوتی ہے یا علاقائی پس منظر سے ناواقفیت۔ "کبھی کچے گھڑے پر چناب بھی پار ہوا ہے"۔ اس فقرے کو کسی بھی زبان میں ترجمہ کر کے آپ کسی غیر

ملکی کو نہیں سمجھا سکتے کہ اس سے کیا مراد ہے جب تک آپ سوہنی مہینوال کے قصے کی موٹی موٹی تفصیلات نہ سمجھا لیں۔ لکھنے والے کبھی کبھار کسی محاورے کو ایسے استعمال کرتے ہیں کہ اس کا سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔ ہمیں بھی چناب کا سفر درپیش تھا اور گھڑا کچا تھا۔

ہماری یونٹ سعودی فضائیہ کے ایک اڈے کے بالکل قریب واقع تھی۔ اس اڈے کے اردگرد خاردار تار لگی ہوئی تھی جس کے ساتھ ساتھ ایک کچا رستہ تھا۔ ہمارا معمول تھا کہ شام کا کھانا کھا کر ایک افسر کیپٹن اختر کے ساتھ لمبی سیر کو نکل جاتے۔ سڑک پر ٹریفک تیز ہوتی تھی۔ گاڑیوں کی تیز روشنیاں بھی تنگ کرتی تھیں اس لیے کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہم سڑک سے ہٹ کر چلیں۔ کبھی کبھار ہم سعودی اڈے کے اردگرد والے رستے پر بھی جا نکلتے۔ ابتدائی دنوں ہی کی بات ہے۔ ایک رات ہمیں ایک سعودی گارڈ نے آلیا اور شک کی نظروں سے دیکھتے ہوئے لگا سوال جواب کرنے۔ ہمارے پاس شناختی کارڈ تھے نہیں۔ اس کا شک اور بڑھ گیا۔ بار بار یہی پوچھے کہ تم یہاں کیا کر رہے تھے۔ ہم نے سیر کے لیے جتنے لفظ یاد تھے۔ سبھی استعمال کر ڈالے لیکن اس کی سمجھ میں نہ آئے کہ اس ویرانے میں سیر کا کیا مطلب۔ آخر میں ہم نے ترپ کا پتہ پھینکا اور کہا کہ ہم نقیب (کپتان) ہیں۔

"نقیب و سیارہ مافی" (کپتان ہو اور تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے۔) گارڈ کی حیرانیاں اور بڑھ گئیں۔

اسے ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ کپتان ہوتے ہوئے جسمانی طور پر فٹ رہنا بڑا ضروری ہے اس لئے شام کے بعد ہم ذرا سیر کو نکلتے ہیں۔

"لیکن تم کلب کیوں نہیں جاتے۔ یہاں مدینہ عسکریہ (یعنی چھاؤنی) میں اتنے خوبصورت اور وسیع کلب ہیں۔ جہاں ہر طرح کی سہولتیں بھی میسر ہیں"۔

بڑی مشکلوں سے اسے یقین آیا کہ نہ ہم غیر قانونی تارکین وطن ہیں اور نہ تخریب کار۔ وہ چلتے چلتے ہدایت کر گیا "بطاقہ لازم"۔ کہ کارڈ اپنے ساتھ ضرور رکھا کرو۔ ایک دفعہ کارڈ کے ہوتے ہوئے بھی ہمیں اسی قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک مرتبہ چھٹی کے دن کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ریاض احمد ملک نے کچھ افسروں کو ساتھ لیا اور خمیس مشیط کے قریب پکنک کی ایک خوبصورت جگہ "القرعاء" پارک جا نکلے۔ یہ

غالباً دنیا کا سب سے بڑا پارک ہے اور کئی میلوں پر محیط ہے۔ یہاں بڑے بڑے پارکوں کا ایک سلسلہ بھی واقع ہے۔ سی او کے کہنے پر ہم نے گاڑیاں ایک جگہ چھوڑیں اور فیصلہ کیا کہ درمیانی پہاڑ کو پیدل عبور کیا جائے۔ اچھا خاصا بڑا پہاڑ تھا جسے عبور کرنے میں گھنٹوں کی مسافت طے کرنا پڑی ڈرائیوروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ سڑک سڑک جا کر پارک کے دوسری طرف واقع فلاں مقام پر ہمارا انتظام کریں۔ ہم ہنستے گاتے پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ایک دو جگہ دم بھی لیا۔ میس سیکرٹری کیپٹن ارشد اپنے انتظامی لوازمات کے ساتھ ہمراہ تھے۔ بہترین مشروبات اور پھلوں کے ٹوکرے ایسے موقعوں پر ساتھ رہتے تھے۔ خاصی دیر بعد ہم چوٹی پر پہنچے تھوڑی دیر ستائے اور پھر نیچے اترنے لگے۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچے ہوں گے کہ شاہی محافظ جانے کہاں سے نمودار ہوئے اور انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ سٹین گنیں چھتیائے وہ چیختے چلاتے ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کا انداز اتنا خوفناک تھا کہ ہماری ساری عربی دھری کی دھری رہ گئی۔ افسر ہماری طرف دیکھ رہے تھے کہ ہم ان محافظوں کو سمجھاتے کہ ان کا سامنا پاک فوج کے افسروں سے تھا لیکن گھگھیاتے ہوئے ہمارے منہ سے صرف ایک ہی لفظ نکلا "مقدم، مقدم" (کرنل، کرنل) اور اس کے ساتھ ہم نے سی او کی طرف اشارہ کیا۔ محافظوں کا انچارج ٹریگر پر انگلی رکھے سی او کی طرف مڑا اور چیخا "بطاقہ۔ بطاقہ"۔

کرنل ریاض نے شناختی کارڈ پیش کیا۔ کارڈ دیکھ کر اس کا غصہ اور سوا ہو گیا۔ "کرنل ہو کر تم اتنے غیر ذمہ دار ہو"۔

اب تک ہم اپنے اوسان پر قابو پا چکے تھے۔ اس کی سٹین گن جھکاتے ہوئے پوچھا کہ آخر بات کیا ہے۔ پتہ چلا کہ پہاڑ کے نیچے کھلے میدان میں ابہا کے گورنر کے والد صاحب حرم سمیت خیمہ زن ہیں۔ شاہی محافظوں نے تین اطراف کو گھیرے میں لے کر اپنی طرف سے سیکورٹی کے انتظامات مکمل کر لئے تھے اور خیموں کے پیچھے والے پہاڑ کے بارے میں ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی یہاں سے بھی نمودار ہو سکتا ہے۔ بار بار ایک ہی سوال کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے اور پہاڑ پر کب، کہاں، کیوں اور کیسے جا چڑھے۔ اسے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ سیر کو نکلے ہیں، جاگنگ کر رہے تھے، پیدل چلنا بہترین ورزش ہے لیکن اسے یہ باتیں کہاں سمجھ میں آتیں۔ جیسے مختلف جگہوں پر وائرلیس پہ کام کرنے والے

اپنی اپنی فریکوئنسی پہ بول رہے ہوں۔ اس کی سکیورٹی کے سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے تھے اور چونکہ ان کے ہاں "سیر" کا کوئی رواج ہی نہیں، اسے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنے بہت سے افسر ہوں، لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک کے، اور ان کے پاس گاڑی نہ ہو۔ پیدل چلنا ہی مقصود تھا تو آخر اتنے بڑے پہاڑ پر چڑھنے کی مصیبت کیوں مول لی جائے کہ جس کے چڑھنے اترنے میں گھنٹوں لگ جائیں۔ اسے ہماری باتوں پر تو جانے یقین آیا کہ نہیں البتہ اپنی حکومت کے جاری کردہ شناختی کارڈوں پر اسے یقین لاتے ہی بنی۔ اس کے تیور اتنے بگڑے ہوئے تھے کہ بس چلتا تو سارے شناختی کارڈ وہیں، اسی وقت منسوخ کر دیتا۔ الزام یہی ہوتا "پیدل چلتے ہیں۔ انہیں افسر ہونے کی تمیز نہیں"۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ سعودی معاشرے میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں ان میں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سعودی، اونٹ سے اتر کر براہ راست گاڑی میں جا بیٹھے ہیں اور اس کے لیے محنت بھی نہیں کرنا پڑی۔ اس موضوع پر آئندہ کہیں تفصیل سے بات ہوگی، ابھی تو ہم آپ کو عربی زبان سیکھنے کی ان کوششوں سے آگاہ کر رہے تھے جو ہمیں کرنا پڑیں۔ اس موضوع کی کچھ باتیں ابھی باقی ہیں۔

عربی سیکھنے میں ہماری مستقل رفیق وہ ڈکشنریاں تھیں جو ہم نے سعودی عرب جاتے ہی خرید خرید کر جمع کر لی تھیں۔ عربی دنیا کی واحد زبان ہے جس کی ڈکشنری دیکھنے کے لیے بھی گرائمر یعنی قواعد کا جاننا ازحد ضروری ہے۔ کسی بھی اجنبی لفظ کو دیکھ کر ڈکشنری پر جھپٹنے والے شخص کو مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ عربی ڈکشنری سے کسی لفظ کے معانی جاننے سے پہلے اس لفظ کا اصل ماخذ جاننا ضروری ہے مثلاً مسجد کا لفظ میم سے شروع ہونے والے الفاظ میں نہیں ملے گا بلکہ سین سے شروع ہونے والے الفاظ میں ملے گا کیونکہ اس کا اصل لفظ سجد ہے اور مسجد کا مطلب سجدہ کرنے کی جگہ۔ الحمدللہ کہ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز میں عربی پڑھتے ہوئے ہمیں ایسے اساتذہ میسر آئے جن کے خلوص، محنت اور لگن سے ہمیں عربی گرائمر یعنی صرف و نحو پر اچھا خاصا عبور حاصل ہوا۔ ان اساتذہ میں ایک تو شعبہ عربی کے موجودہ سربراہ استاذ ضیاء الحق تھے جنہیں عربی اور خاص طور پر صرف و نحو پڑھانے میں کمال حاصل ہے اور اس کے باوجود ان کی جچی تلی رائے ہے کہ عربی زبان کو گرائمر کی معرفت پڑھانا

انتہائی غلط بات ہے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر اساتذہ عربی کی ابتدا ہی گرائمر سے کرتے ہیں جو بلاشبہ دنیا کی تمام زبانوں سے مشکل ترین اور وسیع ترین گرائمر ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ عربی ہی سے بھاگ جاتے ہیں۔ گرائمر کے دوسرے استاذ مصر کی جامعہ الازہر کے فارغ استاذ عبداللطیف تھے جن کی شگفتہ مزاجی نے صرف ونحو جیسے خشک مضمون کو دلچسپ بنادیا۔

عربی لغت کے ہر صفحے پر آپ کو عورت یا اونٹنی کا ذکر ملے گا۔ بڑے تواتر کے ساتھ مختلف لفظوں سے عورتوں اور اونٹنیوں کا خروج ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً هفافته کا مطلب ہے تیز خوشگوار ہوا۔ **مهفهفته** کا مطلب ہے ہوا جیسی کمر یعنی پتلے پیٹ، باریک کمر والی عورت، هر کولته خوبصورت اندام، خوش رفتار عورت، المعلاء دبلے بازوؤں والی عورت۔ ایک دفعہ ہم نے استاذ لطیف سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ عربی لغت کے ہر صفحے پر عورتوں اور اونٹنیوں کی بھرمار ہے۔ بولے "هذا دلیل علی اننا رجال" (یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم مرد ہیں۔)

استاذ لطیف کی بات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ کسی غیر عرب کے لیے عربی زبان کو سیکھنا اور اس پر عبور حاصل کرنا مردانگی ہے۔

ماہرین لسانیات متفق ہیں کہ عربی، دنیا کی فصیح ترین زبان ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں معانی و مطلب کی ایک دنیا آباد ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مختلف یونیورسٹیوں سے محض ایک لفظ پر تحقیق کرنے والوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ بیٹھئے گا کہ عربی زبان کے ڈاکٹر بس ایک ایک لفظ ہی کے ماہر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈاکٹر ہوتا ہے۔ ایک لفظ سے معانی و مطالب کی ایسی دنیائیں آباد کرنا اور اتنا پر مغز مقالہ لکھنا کہ اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی جائے، سہل کام نہیں ہے۔

لفظوں ہی کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک لفظ بھی کتنی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک لفظ نے ہمارے دو تین افسروں کو تگنی کا ناچ نچوایا۔ پاکستان سے لیفٹیننٹ جنرل کمال سعودی عرب کے دورے پر آئے تو خمیس مشیط بھی تشریف لائے۔ سارے دن کی سرکاری مصروفیات کے بعد انہیں رات کو ضیافہ عسکریہ یعنی ملٹری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ رات کے کھانے کے بعد سعودی میزبان، پروٹوکول افسر اور دیگر حضرات تو رخصت ہو گئے، ہم پاکستانی افسران کے ساتھ بیٹھے وطن کی باتیں کر رہے

تھے۔ اچانک جنرل کمال نے کہا،

"وہ......اچھا چلیں رہنے دیں"۔

صاف ظاہر تھا کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت پیش آئی ہے لیکن ہمیں کسی زحمت سے بچانے کی خاطر وہ ضرورت کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل کے رینک کا افسر ہو اور "آداب ملازمت" سے پوری طرح واقف جونیئر افسروں کی موجودگی میں کسی خواہش کا اظہار ادھورا رہ جائے، کیسے ممکن تھا۔ ان سے پوچھا گیا۔

"سر! حکم فرمائیں کس چیز کی ضرورت ہے؟"

انہوں نے انکار کیا کہ رہنے دیں، چھوٹی سی بات ہے۔

"نہیں سر! آپ حکم تو کریں۔ دودھ لیتے ہیں آپ سونے سے پہلے؟"

"ارے نہیں بھئی"

"فروٹ رکھوا دیے جائیں کمرے میں؟"

"نہیں بالکل نہیں"۔

"سر آپ حکم کریں نا"۔

"اصل میں میرے ایک دانت میں کبھی کبھی درد اٹھتا ہے تو میں لونگ چبا لیتا ہوں۔ اس سے درد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لونگ مل جائے گی یہاں؟" جنرل صاحب نے دریافت کیا۔ جب تک ہم اپنی نشست چھوڑتے، دو تین افسر جھپاک سے کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ ہم چپکے سے اپنی جگہ پر بیٹھ رہے۔

اور یہ تفصیلات ہمیں بعد میں معلوم ہوئیں۔ فرض شناس افسر دوڑتے ہوئے گیسٹ ہاؤس سے باہر آئے۔ گاڑی نکالی اور سیدھے مارکیٹ کی طرف بھاگے۔ مارکیٹ پہنچ کر لگے سوچنے کہ لونگ ملے گی کس دکان سے اور اسے طلب کیسے کریں گے۔ روز مرہ کے استعمال کی اشیاء کے لیے وہاں بلاشبہ بڑے بڑے سٹور ہیں، کئی منزلہ عمارات میں ایسے ایسے سٹور ہیں کہ ایک سوئی سے لے کر کار تک ایک ہی عمارت سے مل سکتی ہے لیکن صحیح دکان تک پہنچنا شرط ہے۔ لونگ اگر زیورات والی ہوتی تو باآسانی مل جاتی کہ کسی بھی اشتہار پر ہنستی مسکراتی کسی خاتون کی تصویر دکھا کر اس کی ناک کے زیورات مانگے جاسکتے تھے لیکن یہ تو گرم مصالحے والی

لونگ تھی۔ مختلف دکانوں پر پوچھ گچھ کرتے یہ افسر ایک بقالے یعنی سبزی فروش کے پاس پہنچے۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اشاروں کنایوں سے انہوں نے جس چیز کی خواہش کا اظہار کیا' اس کے جواب میں سبزی فروش نے پہلے گاجریں پیش کی' پھر مولیاں دکھائیں۔ ایک افسر نے جیب سے قلم نکالا اور سگریٹ کی ایک ڈبیا پھاڑ کر اس پر لونگ کی ڈرائنگ بنائی۔ سبزی فروش نے انہیں ایک اور دکان کی راہ سجھائی "علیٰ طول یعنی سیدھے چلے جاؤ۔ ایک چوک آئے گا وہاں سے دائیں مڑ جانا۔ دائیں مڑ کر آگے جاؤ گے تو بائیں ہاتھ ہسپتال آئے گا۔ ہسپتال کے آگے والے چوک سے گذر کر دائیں طرف ایک مارکیٹ آئے گی۔ پہلی دکان ہی اس چیز کی ہے جو تم ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔"

کسی بھی اجنبی معاشرے میں قیام کے ابتدائی دنوں میں انسان کو مجبوراً اتنی زبان سیکھنی پڑتی ہے کہ راہ بھول جائے تو پتہ پوچھ سکے۔ یہ افسر بھی دائیں' بائیں' مارکیٹ اور ہسپتال جیسے لفظ سمجھنے لگے تھے چنانچہ علیٰ طول یعنی سیدھے گئے۔ چوک سے دائیں مڑ کر ہسپتال والی سڑک پر آئے۔ وہاں سے مارکیٹ پہنچے اور پہلی دکان کے سامنے گاڑی روکی تو .... سر پیٹ لیا۔ یہ ہارڈویئر کی دکان تھی۔ کیلوں' میخوں' قبضوں' پیچوں کی دکان۔ جس افسر نے لونگ کی ڈرائنگ کرنے کی کوشش کی تھی اپنے "فن" کے اظہار پر شرمندہ تھا۔

ایک اور افسر نے ایک نئی تجویز پیش کی۔ مختلف کمپنیوں کی ٹوتھ پیسٹ کی جو ٹیوبیں بازار میں دستیاب ہوتی ہیں ان میں ایک ٹیوب ایسی بھی ہوتی ہے جس پر لونگ کی تصویر بنی ہوتی ہے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ کسی سٹور میں چلتے ہیں۔ پہلے وہ ٹوتھ پیسٹ خریدتے ہیں اور پھر اس پر بنی لونگ کی تصویر دکھا دکھا کر لونگ تلاش کرتے ہیں۔ وائے بدقسمتی اس دن بازار سے وہ پیسٹ ہی غائب ہو گئی جس پر لونگ کی تصویر بنی ہوتی ہے۔

ادھر ہم جنرل کے حضور میں بیٹھے پہلے تو افسروں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے لیکن جب دس پندرہ منٹ تک وہ نہ آئے تو اٹھے اور گیسٹ ہاؤس کے کچن میں پہنچے عربوں کے ہاں ہر گیسٹ ہاؤس میں الائچی' دار چینی' لونگ اور عربی قہوے میں استعمال ہونے والی گٹھلیاں کافی مقدار میں سٹور ہوتی ہیں کہ قہوہ تو ان کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اتفاق سے دو چار دن پہلے ہی ہم نے کسی سعودی سے قہوہ کے اجزاء اور اسے بنانے کی ترکیب پر مفصل بحث کی تھی اور ان

اجزاء کے نام یاد تھے۔ کچن میں موجود ایک ویٹر کو ہم نے بتایا کہ قرنفل ایک پلیٹ میں رکھ کر لے آؤ۔ لونگ جنرل صاحب کو پیش کر دی گئی۔ ایک لونگ تو انہوں نے اسی وقت دانت تلے دبالی۔ باقی ان کے کمرے میں رکھوا دی گئیں۔

کوئی پون گھنٹے بعد ہم نے دیکھا کہ ایک افسر دروازے کے پردے کو ذرا سا کھسکا کر ہمیں باہر آنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ ہم باہر چلے آئے۔ "استاذی لونگ کو عربی میں کیا کہتے ہیں اور یہ کس دکان سے ملے گی؟"

"لونگ کو تو عربی میں قرنفل کہتے ہیں لیکن تم کہاں چلے گئے تھے وہ تو ہر کچن میں مل جاتی ہے۔ وہ لے کے میں نے دے بھی دی"۔ افسر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنسنے لگے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جب انسان لفظوں پر قدرت رکھنے کے باوجود بے نوا رہ جاتا ہے۔

ہم پاکستان' برصغیر اور وسطی ایشیا کے ممالک کے لوگوں کی کھانے کی عادات دنیا بھر سے نرالی ہیں۔ ہمارے ہاں کھانوں کو چٹپٹا اور لذیذ بنانے کے لئے جتنے مصالحے بلکہ گرم مصالحے استعمال ہوتے ہیں' دنیا میں کہیں اور نہیں ہوتے' اور اس کے ساتھ برصغیر میں روٹی بھی کئی قسموں کی ہوتی ہے۔ تندوری روٹی' نان' تافتان' روغنی نان' پراٹھے اور پھلکے۔ ہمارے ہاں سے جو پاکستانی حج پر جاتے ہیں تو ان میں سے کئی لوگ توے ساتھ لے جاتے ہیں کہ ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کے بغیر ان کا گذارہ نہیں ہوتا۔ تو ایسی ہی ایک فیملی کا ذکر ہے۔ جس کے افراد پھلکوں کے عادی تھے لیکن توا ساتھ لے جانا بھول گئے۔ وہاں جا کر پہلی فکر یہ ہوئی کہ توے کا بندوبست کیا جائے۔ دو تین پھرتیلے آدمی توے کی خرید پر مامور کئے گئے۔ اس ریسرچ پراجیکٹ کے سربراہ تھے پاکستان ٹیلی ویژن کے کنٹرولر نیوز عبدالشکور طاہر (یہ سراسر ذاتی نوعیت کا پراجیکٹ تھا۔ سنا ہے ٹیلی ویژن میں سرکاری طور پر جن پراجیکٹس پر کام ہوتا ہے وہ ذرا بہتر نوعیت کے ہوتے ہیں مثلاً چمٹا بجانے والے بہت سے فنکاروں کی دریافت کا سرا بھی پاکستان ٹیلی ویژن کے سر ہے ویسے شکور طاہر کو موسیقی سے' سننے کی حد تک تو دلچسپی ہو سکتی ہے' یہ شعبہ ان کا نہیں۔ وہ نیوز کے آدمی ہیں اور ان کی کارکردگی کا معیار ہے ٹی وی کا خبرنامہ

تیری پیاری پیاری صورت کو کسی کی نظر نہ لگے
چشم بد دور

تو شکور طاہر توے کی تلاش میں نکلے۔

انہوں نے پہلے تو توے کی عربی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مایوسی ہوئی۔ بازار میں جا کر ہاتھ کے اشارے سے کسی گول گول چیز کی خرید کی خواہش ظاہر کی جس پر روٹی پکائی جا سکے۔ ان اشاروں کنایوں کے مخاطب یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید انہیں روٹی درکار ہے کسی تندور کی راہ دکھائی اور روٹی کی عربی بھی بتائی "خبز"۔ لیکن انہیں خبز نہیں، خبز بنانے کے لئے توے کی تلاش تھی۔ تھک ہار کر انہوں نے برتنوں کی دکان ڈھونڈنا شروع کی کہ وہاں توے پر نظر پڑی تو خرید لیں گے۔ اب سعودی عرب میں برتنوں کی ہر دکان پر توا نہیں ہوتا۔ خاصی جدوجہد کے بعد ایک دکان پر توا نظر آیا۔ خرید لیا گیا۔ چلتے ہوئے دکاندار سے ٹوٹی پھوٹی زبان میں پوچھا کہ اسے عربی میں کیا کہتے ہیں۔ جواب ملا "توا"۔

فرصت کے مشغلے

یونٹ کی سرگرمیاں ہمیں دن بھر مصروف رکھتیں۔ شام ڈھلے کمانڈنگ آفیسر دو تین اور افسروں کو ساتھ لے کر بازار کا رخ کرتے تو ہمیں ساتھ رکھتے۔ بازار میں قسم قسم کے لوگ ملتے، اور بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملتیں۔ بے شمار نیون سائن، اشتہاری بورڈ، سٹکر، ٹریفک کی ہدایات، پمفلٹ نظر سے گذرتے رہتے اور غیر محسوس طریقے سے ذہن کا کمپیوٹر نئے نئے لفظ رجسٹر کرتا رہتا۔ پرانے لفظوں کے جدید استعمال سیکھتا رہتا۔ اس سب کچھ کا یہ فائدہ ہوا کہ دو تین مہینوں کے اندر اندر وہ وحشت جاتی رہی جو شروع دنوں میں کھڑی بولی یعنی عامیہ سن سن کر ہم پر طاری ہو گئی تھی۔

یونٹ میں کام کرنے کے لئے ہم نے بازار سے بہترین ڈکشنریاں خرید رکھی تھیں ان کے ساتھ ساتھ ہر شعبے کے بارے میں ذاتی کوششوں سے وسیع ذخیرے بلکہ ذخیرہ ہائے الفاظ اور عسکری اصطلاحات کی فائلیں ہمارے پاس تھیں اور ہم کھٹاکھٹ زبان فرنگ کو زبان یار میں اور پیام مشرق کو زبور عجم میں بدل سکتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ یونٹ میں ہم عربی پڑھتے لکھتے اور بازاروں میں سنتے، بولتے رہتے تھے گویا یونٹ میں نظری تعلیم تھی اور بازاروں میں پریکٹیکل۔ کبھی کوئی سینئر افسر یونٹ میں آ جاتا یا کمانڈنگ آفیسر کو کسی سعودی یونٹ یا ہیڈ کوارٹرز میں جانا پڑتا تو گویا پریکٹیکل کے پیریڈ پہلے آ جاتے۔ اس سب کچھ کے اثرات خوشگوار حیرتوں کے ساتھ منکشف ہونا شروع ہوئے۔

ایک دن منطقہ جنوبی کے ڈائریکٹر سپلائی اینڈ ٹرانسپورٹ بریگیڈیئر جنرل حسن الغامدی ہماری یونٹ میں آئے۔ ہم حسب معمول ترجمانی و میزبانی کے لئے کمانڈنگ آفیسر کے دفتر میں حاضر تھے بریگیڈیر غامدی انگریزی جانتے تھے اور براہ راست سی او سے گفتگو کرتے تھے۔ جہاں اٹک جاتے، عربی میں ہمیں مخاطب کر کے مدد چاہتے۔ ہم ایک دو لفظوں کی کمک بہم پہنچاتے اور ان کی انگریزی کی گاڑی پھر رواں ہو جاتی۔ ہمیں ایسے افسر اچھے لگتے تھے جو

انگریزی میں بات کر سکیں کیوں کہ ان کے ساتھ ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے اپنے سی او کے سامنے عربی کا اور ان کے سامنے انگریزی کا بھرم قائم رہتا تھا۔ کچھ دن پہلے ہم نے انہیں کوئی خط لکھا تھا گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اچانک سی او سے پوچھا کہ وہ خط کس نے لکھا تھا۔ ہمارا پہلا تاثر یہی تھا کا اس میں کوئی فاش غلطی ہو گئی ہے۔ سی او بھی معذرت کرنے لگے کہ نیا نیا مترجم ہے پاکستان میں اس نے جو عربی سیکھی ہے وہ اس عربی سے بالکل مختلف ہے جو آپ کے ہاں بولی جاتی ہے۔ لیکن انہوں نے بتایا کہ وہ تو یہ سوچ رہے تھے کہ شاید خط کسی سعودی یونٹ میں ڈرافٹ کروا کے بھیجا گیا ہے۔ یہ ہماری پہلی حوصلہ افزائی تھی۔

سعودی عرب کے بازاروں میں چلتے پھرتے ایک اور بات مشاہدے میں آئی۔ سعودی جب کسی پاکستانی کو مخاطب کرتے ہیں اور اس خطاب میں عزت و احترام کے جذبات شامل نہ ہوں تو "یا رفیق" کہہ کر بلاتے ہیں اور اگر احترام مقصود ہو تو "یا صدیق" کہہ کر پکارتے ہیں۔ جستجو پر پتہ چلا کہ سعودی عرب کو بجلی سے منور کرنے والا پہلا شخص برصغیر کا ایک مسلمان انجینئر محمد رفیق تھا۔ اس صدی کے آغاز میں بجلی کی سہولت صرف مکے اور مدینے میں تھی اور ان جنریٹروں کی مدد سے پیدا ہوتی تھی جو برصغیر یا دیگر مشرقی ممالک سے آنے والے صاحب ثروت حاجیوں نے مقدس مقامات کے لئے بطور عطیہ دیے تھے۔ فالتو پرزے دستیاب نہیں تھے چنانچہ جنریٹر خراب ہو جاتے تو کئی کئی دن خراب رہتے۔ ۱۹۲۸ء میں برما کے ایک حاجی نے نئے جنریٹر بھی دیے اور اپنے خرچ پر محمد رفیق کی خدمات بھی خانہ کعبہ کے سپرد کیں۔ رفیق ایک ذہین شخص تھا۔ اس کی نگرانی میں مقدس مقامات زیادہ تر روشن رہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب سعودی عرب کا دارالحکومت ریاض بجلی کی روشنی سے محروم تھا۔ موجودہ سعودی حکومت کے بانی بادشاہ عبدالعزیز بن سعود نے ایک مرتبہ حج کے موقع پر رفیق کی کارکردگی دیکھی تو اسے جنریٹر خرید کر ریاض آنے کو کہا۔ رفیق جدہ اور مکہ سے جنریٹر خرید کر ریاض پہنچا اور اپنے کارکنوں کی مدد سے شاہی محل میں وائرنگ کرنے لگا۔ اس وقت ابن سعود حجاز میں تھے۔ رفیق پورے محل میں گھومتا پھرتا تھا۔ ہر طرف تاروں کے گچھے بکھرے ہوئے تھے۔ شاہی حکم کی وجہ سے اس پر روک ٹوک تو کوئی نہ تھی لیکن دیکھنے والے حیران ضرور ہوتے تھے کہ کسی تیل یا روغن کے بغیر ان تاروں سے روشنی کیسے نکلے گی۔ شاہ عبدالعزیز واپس آئے تو

وائرنگ تقریباً مکمل ہو چکی تھی صرف جنریٹرز کی تنصیب باقی تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب بادشاہ کو بجلی کے افتتاح کے لئے جنریٹر روم میں بلایا گیا۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ باوجود کوشش کے 'جنریٹر سٹارٹ نہ ہو سکے۔ رفیق کو نہ صرف جلال پادشاہی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ شاہ کے مصاحبوں میں بھی مطعون ٹھہرا۔ "رفیق" طنز و استہزاء کی علامت بن گیا۔

رفیق مستقل مزاج شخص تھا۔ وقتی طور پر تو وہ بادشاہ کے غیظ و غضب سے بچنے کے لئے فالتو پرزے خریدنے کے بہانے جدہ آ گیا لیکن بعد میں وزیر خزانہ شیخ عبداللہ سلیمان سے ملا۔

عبداللہ سلیمان نجد کے قبیلہ عنیزہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بچپن ہی میں ایک متمول عرب تاجر کے ساتھ بمبئی آ گیا تھا۔ یہاں اس نے تجارت کے گر سیکھے۔ پھر بحرین جا کر اپنا کاروبار شروع کیا لیکن قسمت نے یاوری نہ کی۔ اس کا ایک بھائی ملک عبدالعزیز کے دربار میں امور خزانہ کا کلرک تھا۔ جب اس کا کام بڑھا تو اس نے اپنا ایک نائب رکھنے کی اجازت چاہی اور سلیمان کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ یوں عبداللہ سلیمان نے معمولی کام سے شاہی دربار میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اپنے بھائی کی وفات پر اس نے پورا چارج سنبھالا اور اپنی محنت و جانفشانی سے بادشاہ کے دل میں جگہ بنائی اور بالآخر ۱۹۳۲ء میں وزیر خزانہ مقرر ہوا۔

شاہی خاندان سے باہر کا کوئی آدمی اگر بادشاہ کا مقرب خاص تھا تو سلیمان۔ اسے مملکت کا مفاد عزیز تھا اور اس کے لئے وہ اکثر شاہی خاندان کے افراد کو بھی اللوں تللوں کے لئے رقم دینے سے انکار کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ولی عہد شہزادہ سعود کو جو ان دنوں حجاز کے گورنر بھی تھے رقم دینے سے انکار کر دیا جس پر مشتعل ہو کر وہ تلوار لے کر سلیمان کی تلاش میں نکلے۔ سلیمان نے بھاگ کر جدہ کی بندرگاہ میں کھڑے ایک جہاز میں پناہ لی اور اس وقت وہاں سے نکلا جب معلوم ہوا کہ شہزادے کا غصہ اتر گیا ہے۔ ایک اور دن اس نے ملک عبدالعزیز کی ایک چہیتی ملکہ کو مطلوبہ رقم دینے سے انکار کر دیا جس پر اسے جلال بادشاہی کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن چونکہ بنیادی طور پر مخلص اور شاہ کا خیر خواہ تھا اس لئے ملک عبدالعزیز کی پوری زندگی کے دوران وزارت خزانہ کے اہم مرتبے پر فائز رہا۔ بادشاہ زیادہ تر وقت نجد میں گذارتے تھے لیکن وہ حجاز میں رہتا تھا۔ بادشاہ جب حج کے موقع پر حجاز آتے تو نماز فجر کے بعد وہ تنہائی میں

اپنے رجسٹر لئے بادشاہ کے حضور پیش ہوتا۔ حساب کتاب رکھنے کے اس کے اپنے طریقے تھے اور کسی جدید تعلیم یافتہ شخص کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اس کے اکاؤنٹ سمجھ سکے۔ جب تیل کی آمدنی اتنی بڑھ گئی کہ اس کے لئے حساب کتاب رکھنا مشکل ہو گیا تو ماہرانہ رائے کے لئے اس نے ہالینڈ سے ایک ماہر منگوایا۔ اس نے چند ہفتے سلیمان کے ساتھ گذارے لیکن سلیمان کو اس کی ماہرانہ رائے سمجھ آئی نہ وہ سلیمان کے اکاؤنٹ سمجھ سکا۔ چند ہفتوں بعد وہ اپنا بوریا بسترا سمیٹ کر چلتا بنا۔ سلیمان اپنی ڈگر پر چلتا رہا۔ کہتے ہیں سہاگن وہی جسے پیا چاہے۔ بادشاہ اس کے کام سے مطمئن تھا۔ اسے اس سے کیا غرض تھی کہ اکاؤنٹ پرانے طریقے سے رکھے جا رہے ہیں یا جدید انداز میں۔ شاہ سعود کے دنوں میں بھی وہ وزیر خزانہ رہا۔ لیکن شاہ فیصل نے مملکت کو جدید خطوط پر چلانے کے لئے انقلابی اقدامات کئے تو سلیمان کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں اس نے استعفیٰ دے دیا اور باعزت طور پر ریٹائر ہوا۔

کہتے ہیں ملک عبدالعزیز کے دنوں میں شیخ عبداللہ سلیمان سعودی عرب کا بے تاج بادشاہ تھا اور بہت سے امور میں اپنے طور پر احکامات جاری کر دیا کرتا تھا۔ ذرائع مواصلات اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے کہ وہ ہر معاملے میں بادشاہ سے مشورہ کر سکتا۔ سو محمد رفیق شیخ سلیمان سے ملا اور اس کی منظوری سے مصر سے نئے جنریٹر خرید کر لایا اور انہیں شاہی محل میں نصب کیا۔ یوں اس کی کوششوں سے ۱۹۳۱ء میں ریاض میں پہلی بار بجلی کے بلب روشن ہوئے۔ رفیق کی ذاتی عزت تو بحال ہو گئی لیکن وہ "رفیق" جو طنز و استہزاء کی علامت بن کر عام لوگوں میں رواج پا گیا تھا اپنی عزت بحال نہ کر سکا۔

سعودی مملکت کے قیام کے بعد پاکستان سے جو افراد وہاں گئے زیادہ تر پڑھے لکھے، ہنر مند اور رکھ رکھاؤ والے تھے اور اچھے عہدوں پر فائز رہے، وہ احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انور علی شاہ فیصل کے قریبی معتمد تھے۔ شاہ سعود کے دنوں میں ایک امریکی کے مشورے پر سعودی عریبین مانیٹری ایجنسی قائم کی گئی جس کا مقصد سعودی عرب کے مالی معاملات کو جدید خطوط پر استوار کرنا تھا۔ شاہ فیصل نے ڈاکٹر انور علی کو اس ایجنسی کا گورنر مقرر کیا۔ یہ ایجنسی مملکت کے تقریباً تمام مالی امور کنٹرول کرتی تھی۔ انور علی ۱۹۷۴ء میں اپنی وفات تک اس کے گورنر رہے۔ ان کے بعد ایک اور پاکستانی عبدالعزیز قریشی نے یہ عہدہ سنبھالا۔ ان کے

علاوہ جو افراد سعودی عرب گئے ان میں زیادہ تر ڈاکٹر یا انجینئر ہوتے تھے۔ ۷۰ء کی دہائی میں حکومت کے زیر اہتمام ہزاروں افراد سعودی عرب اور خلیجی ممالک کو برآمد کئے گئے جن میں زیادہ تر افراد ان پڑھ اور غیر تعلیم یافتہ تھے۔ یہ لوگ جب پاکستان چھٹی پر آتے تو الیکٹرانک سامان اور دیگر اشیاء تعیش سے لدے پھندے ہوتے، اس سے ایک طرف تو پاکستان میں دولت کا جنون بڑھا۔ قدریں تیزی سے تبدیل ہوئیں۔ جائز، ناجائز ذرائع سے معیار زندگی بلند کرنے کی دوڑ لگ گئی، دوسری طرف سعودی عرب میں پاکستانیوں کی عزت گر گئی۔ بازار میں پھرنے والا ہر شخص رفیق ٹھہرا۔ البتہ رکھ رکھاؤ یا گفتگو سے پڑھا لکھا محسوس ہو تو رفیق کی بجائے اسے صدیق کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

خمیس مشیط کے بازاروں میں گھومتے ہوئے ہمیں کئی بار سعودیوں نے پوچھا "ھل انت دکتور؟" ۔ (کیا ڈاکٹر ہو؟) تحقیق پر پتہ چلا کہ اس سوال کے پیچھے ایک مصلحت کار فرما ہوتی ہے۔ دولت کی فراوانی نے عربوں کو کئی کمزوریوں میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ ان کمزوریوں کے علاج کے متلاشی رہتے ہیں۔ ہم نے کئی بار وضاحت کی کہ بھائی ہم ڈاکٹر نہیں ہیں۔ لیکن اس جواب پر پہلے تو شبے کا اظہار کیا جاتا اور باصرار ہمیں ڈاکٹر کہہ کر بلایا جاتا۔ مزید انکار پر پوچھا جاتا کہ اچھا ڈاکٹر نہیں ہو تو پھر کیا ہو۔ فوجی کہنے پر وہ مزید شناخت کے متمنی ہوتے۔ ایک مرتبہ ایک دکاندار نے یہی سوال کیا تو ضمنی سوالوں سے بچنے کے لئے ہم نے ہاں کر دی۔ اس نے سارے کام چھوڑ چھاڑ ہمیں کاؤنٹر کے پیچھے بلایا۔ باقی گاہکوں کو جلدی جلدی فارغ کیا اور شٹر کھینچ کر دکان بند کر دی۔ پھر اس نے کاغذوں کا ایک پلندہ نکالا اور برائے ملاحظہ ہماری طرف بڑھا دیا۔ اگرچہ ڈاکٹروں کا لکھا ہوا پڑھنا عام طور پر اتنا آسان نہیں ہوتا لیکن خوش قسمتی سے یہ تحریر قدرے خوش خط تھی اور کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی۔ جو کچھ ہم سمجھ سکے یہ تھا کہ موصوف کو پیشاب میں تیزابیت کی شکایت تھی جو کچھ دنوں کے علاج کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ بعد کی تاریخوں کی رپورٹ سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اس دوران دکاندار جو اب ہمارا "مریض" تھا مستقل بول رہا تھا اور مختلف گولیوں اور کیپسول کے پیکٹ ہمیں دکھا رہا تھا کہ انہیں کھا کھا کر میں تنگ آ گیا۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جب پیشاب کی اصل تکلیف ختم ہو گئی ہے تو گولیاں اور کیپسول کیوں کھائے جا رہے تھے۔ ہم نے جرح شروع کی۔

"تمہیں پیشاب میں جلن کی تکلیف تھی؟"

"ایوہ یا صدیق" ۔ (جی۔ محترم)

"یہ معدہ کی رپورٹ بتاتی ہے کہ تیزابیت ختم ہو گئی ہے"۔

"ایوہ یا صدیق ۔بارک اللہ فی علمک"۔ (اللہ تیرے علم میں برکت دے)

"تو اب یہ گولیاں اور کیپسول کیوں کھا رہے ہو؟"

"ڈاکٹر نے دیے ہیں تو کھانے تو ہوں گے"۔

سعودی عرب کے ہسپتالوں میں ہمارا مشاہدہ تھا کہ جب تک مریض کو تفصیل سے دیکھا نہ جائے اور پھر تین چار قسم کی دواؤں کے بھرپور پیکٹ نہ دیے جائیں۔ مریضوں کی تسلی نہ ہوتی تھی۔ ہمیں خود بھی ایک دو بار ہسپتال جانے کا اتفاق ہوا تو ان مراحل سے گزرنا پڑا۔ ویمیکن ہسپتال ہماری یونٹ کے قریب ہی واقع تھا۔ اسے امریکی چلاتے تھے۔ دانت میں درد تھا۔ دو گھنٹوں کے انتظار کے بعد باری آئی تو ایک چیمبر میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ کپڑے اتار کر بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ اسے بتایا کہ ہمارے صرف دانت میں درد ہے لیکن اس کا اصرار جاری رہا۔ پھر اس نے سر سے پیر تک ہمارا معائنہ فرمایا۔ آنکھیں کھول کھول کر جانے ان میں کیا تلاش کرتا رہا۔ دل کی دھڑکنیں سنیں۔ بلڈ پریشر چیک کیا۔ گھٹنے پر ایک آلہ ٹھوک ٹھوک کر آواز سنتا رہا۔ پھر فرمایا کہ منہ کھولو۔ اس ساری کاروائی کی تفصیل لکھ کر اس نے ہمیں "قسم الاسنان" یعنی دانتوں کے شعبے میں بھیجا۔ جہاں ایک نرس نے دانتوں کے معائنے کے بعد جو دوائیں ہمارے حوالے کیں ان میں ایک نیا برش اور ٹوتھ پیسٹ بھی تھی۔

ہمارا مریض بھی انہی تفصیلات کی زد میں آیا ہوا تھا کہ اس کی بیماری دور ہو گئی تھی لیکن وہ انٹی بایوٹک دواؤں کا استعمال جاری رکھے ہوئے تھا۔ استفسار پر اس نے بتایا کہ اس کی تازہ تکلیف پیاس تھی۔ وہ دن بھر پانی کی بوتلیں پیتا رہتا تھا۔ پاکستان میں پانی پینا شاید کسی پر گراں نہ گزرے کہ بلا معاوضہ ملتا ہے لیکن وہاں پانی مہنگا ہے پیٹرول سستا۔ پانی کی ایک بوتل تین ریال میں ملتی تھی اور یہ دکاندار دن میں دس دس بوتلیں پی جاتا تھا لیکن اس کی پیاس نہ بجھتی تھی۔ حلق سوکھتا رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ اپنی پیاس کے مطابق پانی پیتا تو بیس بوتلیں بھی پی سکتا تھا لیکن اس سے اس کا بجٹ بری طرح متاثر ہوتا تھا۔ ہم نے اس کے کیپسول اور

گولیوں کے پیکٹ اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینکے اور ہدایت کی کہ صبح نہار منہ پانی کے ایک گلاس میں نمک اور ایک لیموں نچوڑ کر پیا کرے۔ کھانے کے ایک گھنٹے بعد بھی اسی طرح ایک ایک گلاس پئے۔ تین دن تک یہ عمل کرے۔ اور ہماری آئندہ آمد پر اپنا حال بتائے۔

اس واقعے کے بعد کسی کام سے ریاض جانا پڑ گیا۔ ایک ہفتے بعد واپسی ہوئی۔ شہر جانا ہوا تو یاد آیا کہ فلاں بازار میں ہمارا ایک مریض بھی ہے اس کا حال ہی پتہ کرتے چلیں۔ اس کی دکان پر پہنچے تو اس نے "جاء الدکتور' جاء الدکتور (ڈاکٹر آگیا مرحبا یا صدیق)" کے نعروں سے ہمارا استقبال کیا۔ گاہکوں کو باہر کا رستہ دکھایا۔ اپنے عقال (یعنی سر پر باندھے جانے والے رومال) سے کرسی صاف کی جو مہمان کے لئے بہت زیادہ عزت و تکریم کی علامت ہے۔ چائے اور قہوے کا آرڈر دیا اور ہاتھ چومنے لگا۔ اس کا رویہ بتا رہا تھا کہ اندھیرے میں چھوڑا گیا تیر نشانے پر بیٹھا ہے لیکن پھر بھی مریض کا حال تو پوچھنا تھا۔ استفسار پر وہ پھر پلکیں بچھانے لگا اور اللہ کی قسمیں کھا کھا کر بتانے لگا کہ وہ نہ صرف نارمل ہو گیا ہے بلکہ اس کے ہضم کا نظام بھی درست ہو گیا ہے جس کی شکایت اس نے پہلے نہیں کی تھی اس "مریض" نے ہماری آمد پر جو نعرے بلند کئے تھے انہیں سن کر ارد گرد کے چند دکاندار بھی جمع ہو گئے۔ اندازہ یہ ہے کہ اس نے ہماری آمد سے قبل ہی ہمارا کافی چرچا کر رکھا تھا۔ سب دکاندار احترام بھری نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور جب قہوے کا دور چل چکا تو ہمارے "مریض" نے درخواست کی کہ ہم باقی دکانداروں کی نبض بھی دیکھیں۔ ایک دکاندار ہمیں اپنے گھر لے جانے پر تلا ہوا تھا کیوں کہ اس کی اہلیہ عرصے سے کسی ہسپتال میں زیر علاج تھی اور افاقہ نہ ہو رہا تھا۔ اس دن ہمیں شدت سے احساس ہوا کہ اپنے پبلشر کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تو کتنے فائدے میں رہتے۔ عبدالوحید سلیمانی نے طباعت کا آغاز اپنے والد صاحب کی کتابیں چھاپنے سے کیا تھا۔ ان کے والد حکیم محمد عبداللہ برصغیر کے مشہور حکیم تھے۔ متقی اور پرہیزگار۔ غذاؤں سے علاج کے سلسلے میں انہوں نے خواص شہد' خواص پیاز' خواص لیموں' خواص لہسن جیسی بے شمار کتابیں لکھیں۔ سلیمانی صاحب نے گرچہ فارمیسی میں گریجویشن بھی کی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اپنے والد صاحب کی کتابوں کی پروف ریڈنگ کرتے کرتے وہ فارمیسی بھول گئے ہیں اور حکمت میں طاق ہو گئے ہیں۔ اب ان سے ملنے جائیں تو وہ مریضوں میں گھرے دکھائی دیتے

ہیں۔ پبلشر کم اور "بڑے حکیم جی" کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں۔ جن کے ہاں مریضوں کے حالات "صیغہ راز" میں رکھے جاتے ہیں۔ ہفت روزہ ہلال کے ایڈیٹر ممتاز اقبال ملک کا کہنا ہے کہ اگر سلیمانی صاحب بذریعہ ڈاک بھی علاج شروع کر دیں تو اس سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔ ان کا مشورہ ہے کہ اس بارے میں اشتہارات وغیرہ شائع کیے جائیں یا "ادارۂ مطبوعات سلیمانی" کے بورڈ ہٹا کر "مطب سلیمانی" کے بورڈ لگائے جائیں تو ان پر یہ ضرور لکھوائیں' (ملک صاحب کے الفاظ میں) "خطوں پر خاص پرائیویٹ لکھا ہو تو انہیں بڑے حکیم جی خود کھولتے ہیں۔"

طباعت کے میدان میں بھی انہوں نے زیادہ تر حکمت کی کتابیں شائع کی ہیں۔ طبی کتابوں کے آرڈر کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار ہماری کتابیں بھی بھجوا دیتے ہیں۔ ایک دو حکیموں کی طرف سے ڈانٹ بھرے خطوط بھی وصول ہوئے کہ طبی کتابوں کے ساتھ یہ کیا فضول کتابیں بھجوا دی ہیں۔

حکیم محمد عبداللہ صاحب کی کتابیں ہمارے پاس ہوتیں یا سلیمانی صاحب سے قریبی رابطہ ہوتا تو ہم ان نئے "مریضوں" کو بھی نیم حکیمی کی زد پر رکھ لیتے لیکن بھانڈا پھوٹنے کا سخت خطرہ تھا۔ اس لئے مصروفیت کا بہانہ کر کے جان چھڑائی اور اس بازار سے گذرنا چھوڑ دیا۔

یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کمرے میں محبوس رہنے کی بجائے کھلی فضاؤں کے دلدادہ تھے۔ ہر شام بازار جاتے اور مختلف بازاروں کا سروے کرتے۔ ہفتے میں دو دن چھٹی ہوتی تھی۔ بحر قلزم خمیس مشیط سے دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ چھٹی کا ایک دن سمندر پر گذرتا۔ ہم یونٹ سے ایسے روانہ ہوتے کہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے سمندر کنارے پہنچ جاتے۔ وہاں پہنچ کر خیمے گاڑتے' سامان جماتے اور پھر کچھ تو خیموں ہی میں براجمان ہو جاتے' تاش کی بازیاں لگتیں' سکریبل کھیلی جاتی یا کیرم بورڈ اور کچھ سمندر کے ساتھ ساتھ طویل سیر کو نکل جاتے اور غروب آفتاب کے بعد لوٹتے۔ خمیس مشیط اور دیگر مضافاتی قصبوں میں مقیم دیگر غیر ملکی بھی ویک اینڈ یہیں آ کر گذارتے۔ ان میں اکثریت امریکیوں کی ہوتی۔ ان کی دوشیزائیں تو بالکل ہی آپے سے باہر ہو جاتیں اور بیدنگ سوٹ کے نام سے جو کچھ ان کے جسموں پر رہ جاتا وہ "سوٹ" کے نام پر تہمت ہی ہوتا۔ رات سمندر کنارے گذرتی۔ صبح جس جس کی آنکھ

کھلتی جاتی' نہانے کا کاسٹیوم پہن کر سمندر میں اترتا جاتا۔ طلوع آفتاب کے منظر سے ہم سمندر ہی میں لطف اندوز ہوتے۔ دن چڑھے واپسی کی راہ لیتے۔

ایک بار سمندر کی طرف جاتے ہوئے ایک گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو گیا۔ اس کی مرمت کے لئے رکنا پڑا۔ قریب ہی عوامی طرز کا ایک ہوٹل تھا۔ بڑے بڑے رنگین پایوں والی وسیع و عریض بان کی چارپائیاں قطار میں بچھی تھیں۔ ان پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے اور ان کے پہلو میں اونچی اونچی بنچ نما میزیں تھیں۔ زیادہ تر لوگ چائے اور قہوے سے دل بہلا رہے تھے اور گاؤ تکیوں کے سہارے یوں نیم دراز تھے جیسے کہہ رہے ہوں

مجھے فکر جہاں کیوں ہو — جہاں تیرا ہے یا میرا

کچھ "شیشے" سے دل بہلا رہے تھے۔ یہ "شیشہ" اپنے حقے ہی کی ذرا امیرانہ سی شکل ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ جو حقے ہمارے بڑے جاگیرداروں کے ہاں پائے جاتے ہیں ان کی "عوامی" شکل ہے۔ اس پر رنگین شیشے کے ٹکڑے جڑے ہوتے ہیں۔ چلم بھی قوس قزح کے رنگوں سے مزین ہوتی ہے البتہ "نے" کافی لمبی ہوتی ہے اور ایک میز کے اردگرد بیٹھے دوستوں کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے۔ چارپائیوں کی ایک جانب اونچے سے ایک سٹول پر ٹیلی ویژن دھرا تھا جس پر یمن کا کوئی چینل لگا ہوا تھا اور کوئی یمنی گلوکار لہک لہک کر کوئی لوک گیت گا رہا تھا۔ ہم اسے سمجھنے کی کوشش میں اس قدر محو ہوئے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ کس وقت ساتھی افسروں نے ویٹر کو ہمارے قریب لا کھڑا کیا۔ کسی نے توجہ دلائی کہ چائے اور کھانے پینے کی چیزوں کا آرڈر دے دیا جائے۔ ہم نے باآواز بلند عربی میں اپنے بندوں کو گنا اور اس حساب سے چائے اور روسٹ چکن لانے کو کہا۔ اس نے عربی سنی تو متجسس ہوا۔ پوچھا کہ ہمارا تعلق کس ملک سے ہے۔ وہ خود اپنے حلیے سے یمنی لگتا تھا۔ ہم نے "ہر ملک ملک ماست" کا عربی ترجمہ کرتے ہوئے یمن سے اپنائیت کا اظہار کیا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے آرڈر کی تکمیل کے لئے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پانی کے گلاس رکھنے آیا تو ایک اور تیز طرار سا لڑکا اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ہم سے یمن کے کسی ساحلی شہر کا نام لینے کو کہا۔ صنعاتو یمن کے دارالحکومت کے طور پر مشہور ہے ہی لیکن ساحلی شہروں کے نام غیر یمنیوں کو کہاں معلوم ہوتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ چند دن پہلے ہی یمن کی تاریخ پر کوئی کتاب پڑھتے ہوئے ہم نے چند شہروں کا ذکر پڑھا

تھا۔ سو ملا کا ذکر کر دیا۔ یہ بحر عرب کی طرف ایک ساحلی شہر ہے جس کے تقریباً ۱۲۵ میل شمال میں ایک مزار ہے جو حضرت ہود علیہ السلام کے مزار کی حیثیت سے مشہور ہے۔ ہم نے یہ ساری تفصیلات بتائیں تو ویٹر چپکے چپکے پھر اس لڑکے سے باتیں کرنے لگا جو اس کے ساتھ آیا تھا۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ ویٹر ہمیں یمنی سمجھ بیٹھا تھا اور اس دوسرے لڑکے کو جو اس کا چھوٹا بھائی تھا اور اسی ہوٹل پر ملازم تھا' یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم یمنی ہیں۔ چھوٹے کو یہ بات ماننے میں تامل تھا بلکہ اسی نے آ کر بڑے بھائی کی "الجھن" ہم سے بیان کی اور براہ راست ہم سے پوچھا "کیا تم یمن سے ہو؟"

ہم نے بڑے بھائی کی "الجھن" سے لطف اندوز ہونے کے لئے جواب گول کر دیا اور الٹا اس سے پوچھا کہ اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہمارا تعلق کس ملک سے ہے۔ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کا عربی ترجمہ بھی اسے سنایا۔ لیکن اس کی خلش دور نہ ہوئی۔ پوچھا "تم پیدا کہاں ہوئے تھے؟" اتنے میں بڑا بھائی روسٹ چکن لے آیا تھا۔ ہم اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے چکن پر پل پڑے۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ دونوں بھائی پھر سر پر مسلط ہیں۔ چھوٹے نے ٹیلیویژن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ بتاؤ یہ کون گا رہا ہے۔ اب ہم عربوں کی نور جہاں "ام کلثوم" سے تو واقف تھے لیکن یمن کے اس "مہدی حسن" سے بالکل واقفیت نہ تھی۔ بات بنانے کی کوشش کی کہ بھئی ہم پڑھنے لکھنے والے لوگ ہیں گانے بجانے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے لیکن بات بن نہ سکی۔ چھوٹا بھائی فاتحانہ انداز میں بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہمارے قریب آیا اور ہنستے ہوئے بولا "یمن میں پتلون قمیض پہننے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو اسے نہ پہچانتا ہو"۔

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بے باکی
ہر شوق نہیں گستاخ' ہر جذبہ نہیں بے باک

بلاوے کی تدبیر

سعودی عرب بھیجنے کے لئے جب افسروں کی سیلیکشن ہو رہی تھی تو ہمیں قطعاً امید نہیں تھی کہ ہمارا نام بھی کسی پینل میں شامل ہو سکتا ہے۔ وجہ اس "ناامیدی" کی (جس میں حسرت و یاس قطعاً شامل نہیں تھا) یہ تھی کہ ملٹری کالج جہلم میں تعیناتی سے پہلے ڈھائی سال تک نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگوئجز میں طالب علم بن کر ہم نے جوانی لوٹائی تھی۔ عدم نے کہا تھا۔

کہتے ہیں عمر رفتہ کبھی لوٹتی نہیں
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

عدم نے تو جانے کے حکم دیا تھا جوانی اٹھا کے لانے کا' لیکن انداز بتاتا ہے کہ وہ خود وہیں کہیں جوانی کی سرحد کے اس پار کھڑے رہے۔ ہمارے ساتھ یہ ہوا کہ ملٹری سیکرٹری برانچ کے ایک حکم کے تحت ہم بنفس نفیس طالب علم بن کر ایک تعلیمی ادارے میں لوٹ آئے۔ اس سے پہلے تین سال تک کراچی میں مارشل لاء حکام میں شامل رہے تھے۔ گویا عرصے بعد عسکری دھارے میں شامل ہوئے تھے۔

ایک روز ملٹری کالج آف جہلم میں سگنل آیا کہ سعودی عرب بھیجنے کے لئے ہمارا نام بھی زیر غور ہے۔ فلاں تاریخ کو جی ایچ کیو میں حاضر ہو جائیں۔ فوج کا قاعدہ یہ ہے کہ انٹرویو کے لئے جو بورڈ تشکیل دیا جاتا ہے اس کے سامنے مطلوبہ اہمیت اور تجربے کے افراد ایک اور تین کی نسبت سے پیش کئے جاتے ہیں یعنی اگر ایک فرد کو باہر بھیجنا ہو تو تین افراد انٹرویو کے لئے آئیں گے۔ بورڈ انٹرویو کے ذریعے ایک شخص کا انتخاب کرتا ہے اور ایک کو ریزرو میں رکھتا ہے کہ خدانخواستہ پہلے کو کچھ ہو جائے تو دوسرا اس کی جگہ چلا جائے۔ اس بے چارے کی حالت ٹیم کے بارہویں کھلاڑی کی سی ہوتی ہیں کہ پورے کھیل کے دوران اس کی دھڑکنیں زیر و زبر ہوتی رہتی ہیں' کھیل ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کی باری نہیں آتی۔ (اور آئی ہو تو آبھی جاتی ہے اور مختصر سے وقت میں بھی وہ کوئی نہ کوئی کام دکھا جاتا ہے) تو ہمارا نام جب انٹرویو کے لئے آیا تو یہی سمجھے کہ ہمیں تو پینل کی تعداد پوری کرنے کے لئے بلایا گیا ہے۔ بارہویں کیا' تیرہویں نمبر پر بھی نہ رکھے جائیں گے۔

جب ڈالر یا ریال صرف ایک انٹرویو کے فاصلے پر نظر آ رہے ہوں تو انسان پر بڑی گھبراہٹ

طاری ہو جاتی ہے۔ انٹرویو سے پہلے ہی پیشانی پسینے سے عرق آلود ہو جاتی ہے چاہے موسم سرما ہی کیوں نہ ہو۔ بندہ آئینے میں بار بار خود کو چیک کرتا رہتا ہے کہ اس کی وردی میں کوئی سقم تو نہیں آگیا۔ ہماری سوچ نے ہمیں باور کروا دیا تھا "میاں! تم اترانے کی کوشش نہ کرو تمہیں کیا"؟ اس لئے ہم انتظار گاہ میں آتے' عرق آلود افسروں کو انتظار کی چلہ کشی کاٹتے دیکھتے اور یہ جان کر کہ ہماری باری ابھی دور ہے' جی ایچ کیو میں کسی سے ملنے چلے جاتے۔ بالکل آخر میں ہماری باری آئی۔ انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوئے تو بورڈ کے معزز ارکان صاف تھکے تھکے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک آدھ نے تو جماہی بھی لی۔ سلوموشن میں انٹرویو شروع ہوا۔ ایک دو سوالوں کے بعد کسی نے ہمیں نظم وضبط پر عربی میں تقریر کرنے کو کہا۔ تازہ تازہ عربی سیکھی تھی۔ ملٹری کالج میں پڑھا بھی رہے تھے۔ فرفر چند جملے کہہ ڈالے۔ ایک جنرل نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے' ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا'

"کل شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں"۔

انداز بتا رہا تھا کہ ان کا مطلب ہے اس بات کو عربی میں کہا جائے لیکن ہم نے جیب سے قلم نکالتے ہوئے کہا" سر کیوں نہیں۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ ذرا اپنے دولت کدہ کا پتہ تو لکھائیں"۔

ہمارا جواب ایسے آیا جیسے سوکھے دھانوں پر بارش کی پھوار۔ ایک قہقہہ لگا۔ بورڈ کے ارکان کھل اٹھے اور وہ جو ماحول پر یبوست سی طاری تھی' یکدم کافور ہو گئی۔ بورڈ کے چیئرمین نے ہنستے ہوئے' جنرل سے کہا" پرانی یاری لگتی ہے' تم پتہ لکھاؤ پہلے' انٹرویو بعد میں ہوتا رہے گا"۔

ہم نے احتیاطاً فقرے کا عربی میں ترجمہ بھی کر دیا کہ کہیں جنرل صاحب ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد انٹرویو کیا ہونا تھا۔ ہمیں رخصت عطا ہوئی۔ بورڈ کے ارکان کو مسکراتا چھوڑ کر ہم باہر چلے آئے۔

کچھ دنوں بعد خبریں آنا شروع ہوئیں کہ فلاں صاحب جن کا انٹرویو ہوا تھا ریاض چلے گئے۔ آج فلاں صاحب تبوک کے لئے روانہ ہو گئے۔ آج فلاں ---------- ہم اپنی سوچ کے مطابق اپنی جگہ مطمئن کہ یہ سب کچھ تمہارے لئے تو تھا ہی نہیں۔

ایک شام کسی افسر نے ہمیں کسی کا پیغام دیا کہ ڈاکٹر لئیق بابری نے آپ کو خانہ کعبہ سے سلام بھجوایا ہے۔

"خانہ کعبہ سے ڈاکٹر بابری کا سلام؟ وہ وہاں کیا کر رہے ہیں اور ہمیں کیسے جانتے ہیں؟ معلوم نہیں۔ بتانے والے نے اتنا ہی بتایا ہے کہ باب عبدالعزیز کے قریب ان کی ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے خاص طور پر سلام بھجوایا ہے۔ ڈاکٹر لئیق بابری سے غائبانہ تعارف تو تھا لیکن یک طرفہ۔ وہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز میں فرانسیسی شعبے کے سربراہ رہے تھے لیکن ہمارے وہاں قیام کے دوران فرانس گئے ہوئے تھے اور ان سے ملاقات نہ ہو سکی تھی ان کی خبریں' پاکستانیت کے جذبے میں ڈوبی ہوئی باتیں' بابا بلھے شاہ کی کافیوں کے فرانسیسی ترجمے کی اطلاعات' ہمیں ملتی رہتی تھیں۔ اور ہم ان کے مداحوں میں شامل ہو گئے تھے لیکن وہ ہمیں کیسے جان گئے تھے کچھ پتہ نہ تھا۔ بہرحال جب ہمیں یہ پیغام ملا تو ہم کئی دن اسی سحر میں کھوئے رہے کہ رب کعبہ کے گھر میں ہمارا نام دہرایا گیا ہے۔ سلام آیا ہے عین خانہ کعبہ سے ---- فوج میں عام طور پر جب کوئی سینئر جونیئر افسر کو بلائے تو قاصد کے ہاتھ بس اتنا کہلواتے ہیں کہ فلاں صاحب کو ہمارا سلام بولو۔ فلاں صاحب سلام ملتے ہی 'نوٹ بک ہاتھ میں لئے فٹ سینئر افسر کے ہاں پہنچ جاتا ہے" "سامنے سلام' اٹن شن' یس سر"!

توکیا یہ اسی قسم کا سلام آیا ہے؟ ہم ٹھٹک گئے۔ یہ جو مذاق مذاق میں ہم ہلکا پھلکا سا انٹرویو دے آئے تھے اور اتنے دنوں سے یار لوگوں کو دل لگی کا موقع ہاتھ آیا ہوا تھا اور وہ مبارکبادیں دے دے کر مٹھائی کے تقاضے کر رہے تھے' کہیں سچ ہی نہ ہو۔ سرشاری کی ایک کیفیت تھی جو شرابور کر گئی۔

پھر کتنے ہی دن گذر گئے۔ ساتھی پوچھتے کہ انٹرویو کا کیا ہوا۔ ہمارا علم ان سے زائد نہ ہوتا۔ یہی جواب دیتے کہ شاید بلاوا نہیں آیا------ انہی دنوں ملٹری کالج کی کمانڈ تبدیل ہوئی بریگیڈیئر عنایت الرحمن صدیقی کمانڈنٹ بن کر آئے۔ ان دنوں ہم محمود غزنوی ہاؤس کے انچارج تھے۔ ایک رات بجلی گئی ہوئی تھی۔ ہم ہاؤس میں گشت پر تھے کہ کمانڈنٹ بھی وہاں آ نکلے۔ کالج کے مختلف امور پر گفتگو کرتے کرتے انہوں نے اچانک پوچھا'

"آپ سعودی عرب کے لئے انٹرویو دینے گئے تھے کیا ہوا؟"۔

"سر پتہ نہیں۔ شاید میں سیلیکٹ نہیں ہو سکا۔ جو سیلیکٹ نہ ہوا سے تو وہ خبر نہیں کرتے نا"۔

"میری جی ایچ کیو میں واقفیت ہے۔ کہو تو میں کسی سے بات کروں"۔

"نہیں سر! آپ بات نہ کیجئے گا"۔

"کیوں؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"سر! یہ فیصلے کہیں اور ہوتے ہیں۔ جب تک بلاوا نہ آئے کوئی وہاں جا نہیں سکتا اور اگر بلاوا آ گیا تو کوئی روک نہیں سکے گا۔ آپ خود مجھے دفتر میں بلا کر موومنٹ آرڈر میرے ہاتھ تھما دیں گے"۔

اندھیرا تھا۔ ہم کمانڈنٹ کے تاثرات نہ جان سکے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ اس جواب سے خوش نہیں تھے۔ فوج کا ایک بریگیڈیئر ایک جونیئر سے کپتان کو مدد کی پیشکش کر رہا تھا اور وہ آگے سے فلسفہ بگھار رہا تھا۔ آخر دنیا مسبب الاسباب ہے۔ اور یہ کوئی جواب تھا جو ایک کپتان کو دینا چاہئے۔

"ویسے جواب اس کا تھا صحیح"۔ بریگیڈیئر صدیقی تیسرے دن سٹاف روم میں سب افسروں کے سامنے یہ گفتگو دہرا رہے تھے اور خود اپنی ناراضگی کو بلا جواز قرار دیتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس کوئی اختیار نہ تھا ہمیں روکنے کا۔ اسی دن جی ایچ کیو سے ایک فوری سگنل وصول ہوا تھا کہ سعودیہ روانگی کے لئے ضروری کاغذات بنوا کر ہمیں فوراً اٹک بھیج دیا جائے۔ ہمیں اٹک پہنچ کر پتہ چلا کہ ہماری روانگی میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی تھی۔ ملٹری کالج جہلم میں ہم دو مضمون پڑھاتے تھے۔ سکول سیکشن کو انگریزی اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کے طلبہ کو عربی۔ ان دنوں پی ایم اے سے سائنس کے پینتیس طلبہ کو ملٹری کالج بھیجا جاتا تھا کیونکہ یہاں سائنس لیبارٹری کی سہولتیں میسر تھیں ہم جن طلبہ کو عربی پڑھا رہے تھے وہ ایک ٹرم کا امتحان دے چکے تھے اور تمام کے تمام کو جزوی طور پر فیل کر دیا گیا تھا کیونکہ انہوں نے عربی کا امتحان ہی نہیں دیا تھا جو ان دنوں لازمی مضمون تھا۔ کوئی انسٹرکٹر ہی میسر نہ تھا۔ ہم نے آ کر پہلے انہیں گذشتہ ٹرم کی تیاری کروا کے امتحان دلوایا اور اب اگلی ٹرم کا سلیبس ختم کرنے کو تھے۔ جی ایچ کیو میں ملٹری سیکرٹری برانچ کی مشکل یہ تھی کہ ہمیں سعودیہ کے لئے فارغ کرتے تو

انہیں ملٹری کالج کے لئے دو افسر مہیا کرنے پڑتے۔ انگریزی اور عربی پڑھانے کے لئے بہت کم لوگ ان متضاد تہذیبوں والی زبانوں پر یکساں مہارت رکھتے ہیں۔

ہم جس یونٹ کے ساتھ سعودیہ جا رہے تھے ان کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر خالد نکا (آج کل کرنل، گورنر پنجاب کے ملٹری سیکریٹری) نے ایک طویل چکر چلا کر ہمارا نام سلیکشن بورڈ کی منظور شدہ فہرست سے دریافت کیا اور پھر زبردستی ہمیں جی ایچ کیو سے چھینا۔ اس کی تفصیلات یہاں نہیں دی جا سکتیں کہ فوجی رازوں کے زمرے میں آتی ہیں۔

اٹک پہنچ کر پتہ چلا کہ آرٹلری کی جس یونٹ کے ساتھ ہمیں سعودیہ جانا تھا وہ تو گذشتہ ایک سال سے وہاں مقیم تھی اور ان جہازوں کی راہ تک رہی تھی جو انہیں سعودیہ لے کر جاتے اور یہ ہمارے پہنچنے کے تین چار روز بعد کی بات ہے کہ فلائٹ شیڈول آ گیا۔ ہم نے بھاگم بھاگ اپنے کاغذات مکمل کئے اور تین چار روز بعد خود کو خمیس مشیط میں پایا۔

وہاں پہنچتے ہی ہم بری طرح مصروف ہو گئے۔ ان مصروفیات کی چند جھلکیاں گذشتہ ابواب میں بیان کی جا چکی ہے۔ مصروفیت اپنی جگہ لیکن حال یہ تھا

گفتگو کسی سے ہو تیرا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا

نظریں شمال کی طرف لگی رہتیں (خمیس مشیط سے خانہ کعبہ شمال کی جانب ہے) "اب اتنا فاصلہ تو کٹ گیا، پھر بھی اتنی دوریاں؟ یہ کب مٹیں گی؟"۔

کچھ دنوں بعد یونٹ سے تین افسروں کا ایک مختصر سا قافلہ عمرے کے لئے گیا۔ اس میں میجر خالد نکا، میجر امجد اور میجر حفیظ (اب بریگیڈیئر) شامل تھے۔ انہوں نے آ کر خانہ کعبہ کی ایسی دلکش تصویر کھینچی کہ بے تابیاں اور بڑھ گئیں۔ ان کا بیان کوئی بیان غالب نہ تھا لیکن وہ جو کہتے ہیں "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ وہ جب خانہ کعبہ کی باتیں کرتے تو آنکھوں میں نمی کا غبار اتر آتا۔ اک ہوک سی اٹھتی۔

"اللہ! بندے ہم بھی تیرے ہی ہیں۔ کب؟"۔

کچھ جواب نہ ملتا۔ خاموشی سی طاری رہتی۔

ہماری یونٹ کی ایڈوانس پارٹی ہم سے ڈھائی سال پہلے سے وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ان کا کام

تھا کہ وہ یونٹ کے لئے رہائش کا بندوبست کرتے، اسلحہ، ساز و سامان وغیرہ ایشو کرواتے اور ہمیں بلواتے۔ کچھ کام انہوں نے کر لئے تھے، کچھ نہیں کر سکے تھے۔ جو توپیں ہمیں ملی تھیں، وہ ان پر تربیت حاصل کر چکے تھے اور نئے آنے والوں کو تربیت دینے کی خاطر چاہتے تھے کہ ان کے قیام میں توسیع ہو جائے۔ اور وجوہات بھی سننے میں آئیں۔

ایک دن ہم نے ایک این سی او کو نئے آنے والوں سے کہتے سنا۔ "میں ننانوے عمرے کر چکا ہوں۔ بس تھوڑا سا وقت اور مل جائے تو ایک عمرہ اور کر لوں۔ سنچری پوری ہو جائے"۔

اور ہم کانپ گئے۔ اس نے کس کے لئے یہ حساب کتاب رکھا ہوا تھا؟ اس کے لئے جس نے عمرے کا حکم دیا تھا؟ اسے تو اس حساب کتاب کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے جمع تفریق کے پیمانے کہیں زیادہ درست اور وقیع تھے۔ دور دور بھی کوئی امکان نہیں تھا کہ اس کے ہاں کوئی چیز تلنے سے رہ جائے؟ جانچ پڑتال، پیمائش، پرکھ اس سے بہتر کون کر سکتا ہے؟ تو پھر؟ دنیا کو بتانے کے لئے کہ میں عمروں کی سنچری کر کے آیا ہوں۔ مجھے متقی پرہیزگار، زاہد پارسا، پہنچا ہوا، ولی، قطب، او تار مان لو! قرآن میں ایک وارننگ موجود ہے "اے محمدؐ! ان سے کہو، کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خسارے میں کون ہیں؟ وہ کہ جن کی ساری سعی و جہد دنیا کی زندگی ہی میں گم ہو کر رہ گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیات کو ماننے سے انکار کیا اور اس کے حضور پیشی کا یقین نہ کیا۔ تو ان کے تمام اعمال ضائع ہو گئے قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔" (سورۃ الکھف۔ ۱۰۵)

اور مشکوۃ میں اسی سلسلے میں ایک حدیث بھی وارد ہوئی ہے۔

"قیامت کے دن جن لوگوں کا پہلے پہل فیصلہ سنایا جائے گا، ان میں ایک شہید ہو گا۔ اسے لایا جائے گا اور ان نعمتوں کا اظہار کیا جائے گا جو اس پر کی گئیں۔ وہ ان نعمتوں کو پہچانے گا اور اقرار کرے گا (کہ ہاں یہ نعمتیں تو مجھے دنیا میں دی گئی تھیں) سوال کیا جائے گا کہ اس سے کیا کام لیا۔ کہے گا۔ تیرے لئے قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ ارشاد ہو گا جھوٹ بولتے ہو۔ تم تو اس لئے لڑے تاکہ بہادر کہلاؤ تو وہ تو کہا جا چکا اور جس غرض کے لئے قتال کیا تھا وہ تو پوری ہو چکی۔ پھر اسے حکم سنایا جائے گا۔ (جس کے مطابق) اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال

دیا جائے گا۔ پھر ایسا شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا اور علم پھیلایا۔ اس پر جو انعامات کئے گئے ان کا اظہار کیا جائے گا۔ وہ اقرار کرے گا۔ پھر پوچھا جائے گا کہ ان نعمتوں سے کیا کام لیا تو کہے گا کہ تیرے لئے علم حاصل کیا' لوگوں کو پڑھایا اور انہیں قرآن سنایا۔ ارشاد ہو گا جھوٹ ہے۔ تو نے اس لئے پڑھا کہ عالم کہلائے' قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہلائے تو یہ کچھ تو کہا جا چکا۔ اسے حکم سنایا جائے گا اور منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ اور ایسا شخص لایا جائے گا جسے اللہ تعالیٰ نے کشادگی عطا فرمائی اور ہر قسم کا مال عطا کیا۔ اس سے نعمتوں کا اظہار کیا جائے گا وہ تسلیم کرے گا' تب پوچھا جائے گا کہ ان انعامات سے کیا کارگذاری کی ہے تو کہے گا کوئی ایسی راہ نہ تھی کہ تجھے اس راہ میں خرچ کرنا پسند ہو اور میں نے تیرے لئے اس راہ میں خرچ نہ کیا ہو ارشاد ہو گا جھوٹ۔ بلکہ تو نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ تو سخی کہلائے تو وہ تو کہا جا چکا۔ اس کو بھی حکم کے مطابق کھینچ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

اور ایڈوانس پارٹی میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ڈھائی سال کے عرصے میں ایک مرتبہ بھی' مکے گیا نہ مدینے۔ اس سے نہ جانے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ اسے اس کی ماں کی طرف سے اجازت نہیں ملی۔

اور ایسے بھی تھے جنہیں چپ لگی ہوئی تھی۔ حج انہوں نے بھی کئے تھے' عمرے وہ بھی کر کے آئے تھے۔ مدینہ منورہ میں حاضری ان کی بھی ہوئی تھی لیکن وہ بولتے نہ تھے۔ اللہ میاں کے ڈھنگ بھی نرالے ہیں۔ کہتا ہے کہ مجھے ڈھونڈو' پاؤ گے' میری طرف ایک قدم بڑھاؤ' میں دس قدم بڑھاؤں گا مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا' مجھے پکارو' مجھی کو پکارو' دنیا سے بے نیاز کر دوں گا' اس کی طرف جانے والے' جاتے رہتے ہیں' پکارنے والے پکارتے رہتے ہیں۔ چپکے چپکے بھی' علی الاعلان بھی لیکن کوئی کوئی اشتیاق میں مطالبہ کر بیٹھتا ہے کہ لو میں آتو گیا ہوں لیکن ملوں گا بغیر حجاب کے' ذرا سامنے تو آ۔ تو کھٹ سے بے اعتنائی کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے"۔ ارے رے رے نہیں' تم ہمیں دیکھ نہیں سکتے"۔

اس کے بھید کون پا سکا ہے۔ جسے اس کا بھید نہ ملے' اس کے ہاں شور بہت ہے پانے کی ترکیبوں کا۔ جسے اس کی جھلک سے سرفراز کیا جائے' وہ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ طور کو گواہ

بنا کر چاروں شانے چت۔ جو اس کا بھید پا لیتے ہیں انہیں چپ لگ جاتی ہے۔ بھید ملے تو کیوں کر۔ بولتے وہی ہیں جنہیں حکم ہو لیکن وہ بھی اتنا جتنا اذن ہو (وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی) (خدا کا رسول اپنی مرضی سے نہیں بولتا۔ وہ وہی کچھ کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کیا گیا۔)

تو ہر طرح کے لوگ تھے۔ یوں لگا جیسے اللہ میاں بلاوے سے پہلے مثالیں دے دے کر سمجھا رہے ہوں اور پوچھ رہے ہوں

کیا چیز لو گے
چمچہ کہ تھالی
چمچہ ہے چھوٹا
تھالی بڑی ہے۔
کیا چیز لو گے
پنسل کہ بستہ
پنسل ہے چھوٹی
بستہ بڑا ہے۔

بالآخر جانے کی تدبیر ہوئی۔ خمیس مشیط سے جدہ کے لئے جہاز کی ٹکٹ خریدلی۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ ٹکٹ اوکے نہ ہونے کی کیا وجہ تھی بس اتنا یاد ہے کہ ٹکٹ چانس پر تھی اور ہم اسے کبھی اوکے نہ کرا سکے۔ ہر ویک اینڈ پر ائیر پورٹ پہنچ جاتے اور چانس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے لیکن بات نہ بنی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایر پورٹ پر چانس والوں کے لئے کوئی نظام نہ تھا۔ "پہلے آیئے' پہلے پایئے"۔ کا اصول ہوتا تو ہم جمعرات کو چھٹی ہوتے ہی وہاں پہنچ جایا کرتے۔ لیکن وہاں کوئی قطار بنتی تھی نہ فہرست جب کنفرم سیٹیں بک ہو جاتیں تو فلائٹ سے چار پانچ منٹ پہلے کسی کونے سے شور اٹھتا۔ پتہ چلتا کہ یہاں چانس والوں کو بورڈنگ کارڈ ایشو کئے جا رہے ہیں۔ چانس والے جو اچھی خاصی تعداد میں ہوتے' وہاں ہجوم کرتے' بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاں کسی نئی فلم لگنے کے پہلے دن کھڑکی توڑ قسم کی دھکم پیل ہوتی ہے۔ ہم اتنے عرصے سے افسری فرما رہے تھے' ہجوم میں کیسے گھستے۔ افسرانہ وقار آڑے آجاتا۔ جو تین چار سیٹیں چانس والی ہوتیں مشٹنڈے قسم کے مسافر لے اڑتے' ہم منہ

تکتے رہ جاتے اور منہ بسورے یونٹ واپس آجاتے۔

یہ غالباً تیسری یا چوتھی دفعہ کا واقعہ ہے۔ ہم نے ائیرپورٹ پر کام کرتے "حکام" سے مذاکرات کے ذریعے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کوئی نظام تو اپنائیں۔ چانس والے لوگوں کی قطار بنائیں یا ایرپورٹ پر آنے والوں کے نام لکھتے چلے جائیں۔ پہلے آنے والوں کو چانس دیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ ہوں ہاں تو کرتے رہے لیکن عملاً کچھ نہیں کیا۔ ایک "رفیق" کی بات وہ بھلا کیونکر مان جاتے۔ اس دوران ایک پاکستانی نظر آیا جسے کسی نے "یا بشیر" کہہ کر پکارا تھا۔ وہ ایرپورٹ انتظامیہ کا کوئی رکن دکھائی پڑتا تھا۔ پکار کی جانب چل دیا۔ ہم نے بے بسی سے اس ہجوم کی طرف دیکھا جو چانس کے کاؤنٹر پر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ غترے، عقال اور گھڑیاں اتاری جا رہی تھیں۔ پرواز کا اعلان ہو چکا تھا اور چانس والوں کی باری آیا ہی چاہتی تھی۔

عصر کا وقت تھا۔ ہم نماز کے لئے ائیرپورٹ بلڈنگ سے باہر چلے گئے اور ایک کونے میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ نماز کے دوران بڑا غصہ آیا کہ ہم اللہ میاں کے گھر آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتا۔ مہینہ ہونے کو آیا ذلیل و خوار ہوتے ہوئے۔ ہر ویک اینڈ پر آتے ہیں اور یہ جاہلانہ تماشے دیکھ کر واپس چلے جاتے ہیں اب یہ دھینگا مشتی تو ہم سے ہونے سے رہی۔ آخر افسر ہیں اور یہ افسری بھی تو آپ ہی نے دی ہے۔

یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اس کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ ٹھیک ہے یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ لیکن عادتیں جو پختہ ہو چکی ہیں۔ ----- نہیں جی ------- ہم سے نہیں ہونے کا یہ ----- اور جانا بھی ہے -------- بلکہ آج ہی جانا ہے۔ ابھی اسی فلائٹ سے ------- بندوبست کیا جائے -------- ورنہ --------- ورنہ بھی بس جانا ہی ہے۔ کوئی اور آپشن نہیں ہے۔"

یوں لگا جیسے اللہ میاں ہم پر ہنس رہے ہوں اور ہنستے ہنستے انہوں نے عرضی منظور کر لی۔ ایک اطمینان سا ہوا۔ لیکن سلام پھیرا تو غصے کی کیفیت باقی تھی۔ ایرپورٹ بلڈنگ کے اندر آ گئے۔ چانس والے ایک کاؤنٹر کے اردگرد جمع ہو رہے تھے غالباً کسی نے قطار بنانے کو کہا۔ قطار

بننی شروع ہوئی۔

"قطار میں تو لگو"۔

"نہیں۔ نہیں لگنا ہم نے قطار میں۔ ہمیں چاہیے ہمیں بورڈنگ کارڈ۔ پہلے بڑی یہاں قطاریں بنتی رہی ہیں"۔ ہم منہ پھلائے کھڑے رہے۔ اتنے میں وہی پاکستانی جسے ہم نے کسی کو "یا بشیر" پکارتے سنا تھا۔ پانچ چھ بورڈنگ کارڈ لئے کاؤنٹر کے پیچھے نمودار ہوا۔ اس نے پہلے آدمی سے ٹکٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ قطار ٹوٹ گئی اور ٹکٹوں کی ایک جھاڑی سی اگ آئی۔ ہر کوئی اپنی ٹکٹ ہوا میں لہراتے ہوئے کاؤنٹر کے پار کھڑے ہوئے کارکن کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور جانے کب ہجوم کے اس طرف سے ہم نے باآواز بلند پکارا"۔ "بشیر صاحب"۔

بشیر صاحب نے ہمیں دیکھا اور ٹکٹوں کی جھاڑیوں میں سے ہاتھ ہماری طرف بڑھا دیا ہم نے پنجوں کے بل خود کو قدرے بلند کرتے ہوئے ہجوم کے اوپر سے ٹکٹ انہیں تھما دی۔ دوسرے لمحے بورڈنگ کارڈ ہمارے ہاتھ میں تھا۔

"ارے ---- یہ دوریوں میں لمحہ وصال کیسے آ گیا"؟

ہم نے حیرت سے بورڈنگ کارڈ دیکھا۔ چند لمحوں پہلے والی کیفیت یاد آئی تو ہنسی آ گئی۔

"اچھا! اچھا" ہم نے آسمان کی طرف دیکھا "تھینک یو اللہ میاں۔ لو ہم آئے"۔

ہجوم جانے کیا شور مچا رہا تھا۔ شاید احتجاج کہ پیچھے کھڑے ہوئے شخص (اور وہ بھی ایک رفیق!) کو بورڈنگ کارڈ دے دیا اور ہم جو اتنی توانائیاں صرف کرتے ہوئے سامنے موجود ہیں۔ بشیر صاحب نے غصے میں آکر بورڈنگ کارڈ ان کے سامنے لہرائے۔ پہلے ان کے دو ٹکڑے کئے، پھر انہیں ریزہ ریزہ کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور ایک دروازے کے پیچھے غائب ہو گئے۔ "کر لو جو کرنا ہے"۔ اس دن چانس والوں کے لئے صرف ایک بورڈنگ کارڈ ہی مقدر تھا جو ہمیں مل چکا تھا۔ پرواز کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسافروں سے التماس کی جا چکی تھی کہ وہ سگریٹ بجھا دیں اور جہاز پہ تشریف لے چلیں۔ مسافرت تو ہم نے کئی دنوں سے اختیار کر رکھی تھی لیکن سند آج ہی ملی تھی۔ ہم نے بیگ اٹھایا اور بھاگے جہاز پر تشریف لے جانے والے ہم آخری مسافر تھے کہ فوراً بعد سیڑھیاں ہٹالی گئیں۔ جہاز کے چلنے سے

پہلے باتھ روم میں جا کر وضو کیا' احرام باندھا اور اپنی نشست پر آ کر دو نفل نماز ادا کیے۔ تلبیہ پڑھتے ہوئے دل احسان مندی کے جذبات سے معمور تھا۔ "حاضر ہوں' اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تعریفیں' تمام نعمتیں اور ساری خدائی بس تیرے لئے ہے"۔

"شٹ اپ! ابھی تھوڑی دیر پہلے بات کیسے کر رہے تھے!"۔ اور ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔ اسی لہجے کی قبولیت سے تو ہم جہاز میں بیٹھے تھے اور اب اسی پر جھاڑ پڑ رہی تھی۔

"اللہ جی! آپ مان جو نہیں رہے تھے۔ سن کر ہی نہیں دے رہے تھے"

"میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں۔"

ہم نے پھر تلبیہ پڑھا "حاضر ہوں' اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔" (تیرے سوا کس سے مدد مانگتے۔ تو نے سن لی' اسی لئے تو میں حاضر ہوں۔ بے شک تمام تعریفیں' تمام نعمتیں اور بادشاہی تیرے لئے ہے (اب مان بھی جائیے نا!)

اور اللہ میاں مان گئے۔ ہم تلبیہ پڑھتے رہے۔

جدہ ایئر پورٹ پر اترے تو دیکھا یونٹ کے دو افراد ہمارے اردگرد منڈلا رہے ہیں۔ ان میں ایک تو نائک جاوید تھا' دوسرے کا نام بھول رہا ہے۔ ان کی ٹکٹیں کنفرم تھیں وہ جانے کب جہاز میں بیٹھے تھے۔ ایئر پورٹ پر دیکھا تو ساتھ ہو لئے۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور مکے روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور پاکستانی تھا۔ ابتدائی علیک سلیک کے بعد اس نے گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن ہم تلبیہ پڑھنے پر زور دیتے رہے۔ ہوتا یوں تھا کہ ہم تھوڑی دیر تلبیہ پڑھتے' ذرا دم لینے کو رکتے تو پھر گفتگو شروع کر دیتا۔

"کل کتنی فوج آئی ہے ہماری؟"۔

"انہیں ذرا دبا کر رکھنا"۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"۔

اس کی بات لمبی ہوتی تو ہم پھر تلبیہ پڑھنے لگتے۔ منزل سے رابطہ ٹوٹ نہ پائے

"پہلی دفعہ آئے ہو؟" ڈرائیور نے تنگ کر پوچھا۔

"ہاں! آئے تو پہلی دفعہ ہیں" اسے جواب تو ہم نے دے دیا لیکن پھر کانپ گئے۔ جو

دوسری' تیسری یا چوتھی یا سویں مرتبہ آتے ہیں کیا ان میں یہ ذوق و شوق باقی نہیں رہتا؟ دید کی تمنا' قربتوں کی خواہش' وصال کی چاہت' اپنائیت کے جذبے کم ہو جاتے ہیں' سرد پڑ جاتے ہیں؟ یہ بے تار' لاسلکی پیغاموں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے؟ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان............"۔

"اے اللہ میں حاضر ہوں" ہم نے خیالات کو جھٹک کر تلبیہ پڑھنا شروع کر دیا ساتھیوں نے ساتھ دیا۔ نور کا ایک جھپاکا ہوا اور گاڑی نے موڑ کاٹ لیا۔ ہم نے ڈرائیور سے پوچھا یہ کیا منظر تھا۔ اس نے بتایا کہ بیت اللہ کے مینار ہیں "اللہ! اللہ میں حاضر"۔

ڈرائیور نے باب عبدالعزیز کے سامنے اتار دیا۔ ہم نے اسے کرایہ دیتے ہوئے فارغ کیا تو وہ بھی ٹیکسی ایک طرف پارک کر کے چلا خانہ کعبہ کی طرف۔ "اب آیا ہوں تو طواف کر کے ہی جاؤں گا"۔

ہم نے پہلے ایک ہوٹل ڈھونڈا۔ سامان وہاں رکھا اور چلے خانہ کعبہ کی طرف۔ وہ گھڑی آنے کو تھی جس کا اشتیاق تھا۔ وہ گھر سامنے تھا جہاں سے بلایا گیا تھا۔ مرکز یقین' مرکز روح و شفا' مرکز مہر و وفا' ہم مقناطیس کی طرح اس کی طرف کھنچتے جا رہے تھے۔ ٹھیک اسی باب عبدالعزیز سے داخل ہوئے جہاں سے سلام آیا تھا اور چند قدموں کے بعد......... کائنات کا مرکز' مالک کون و مکان کا گھر' وہ صرف یہاں نہیں رہتا تھا' پوری کائنات کو محیط تھا لیکن اس جگہ کو' اس فرش کو' اس چار دیواری کو اس نے اپنا گھر قرار دیا تھا اور ہمیں اس گھر میں بلایا گیا تھا"

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے' یہ بڑے نصیب کی بات ہے

ہم برآمدے سے نیچے اتر آئے۔ رہا نہیں گیا' آنسو برساتی آنکھوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑے۔ بیت اللہ میں داخلے کے بعد افضل ترین عبادت طواف ہے۔ تحیۃ المسجد کی جگہ بھی بیت اللہ کا اکرم طواف ہی میں ہے یعنی تحیۃ المسجد کی جگہ بھی طواف ہی کرنا چاہیے لیکن یہ ایک بے اختیاری فعل تھا۔ وہ سارا جلال' وہ سارا جمال جو سنتے آئے تھے۔ ہمارے چاروں طرف موجزن تھا۔ اللہ اکبر' اللہ اکبر لیکن سر اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ مالک کائنات جو سب جہانوں کا رب ہے' کتنا عظیم ہے اور ہم کتنے حقیر' چھوٹے' بے مایہ' بے

حقیقت ذرا ذرا سی بات پر اس کے احکام بھلا بیٹھتے ہیں' جسارتیں کرتے ہیں 'گستاخیاں' بدتمیزیاں' خلاف ورزیاں' یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہروقت دیکھ رہا ہے۔ اس نے پھر بھی اپنے ہاں بلایا تھا۔ سبحان ربی الاعلی پاک تو صرف میرے رب کی ذات ہے جو اعلیٰ ہے' بلند و برتر--- اے اللہ معاف فرمادے۔ بلایا ہے تو مان بھی رکھ۔ معاف کردے۔ تو عظیم ہے' تو کریم ہے' تیری ذات جل جلالہ۔ دیر بعد سر اٹھایا تو آنسوؤں کے پیچھے سے خانہ کعبہ دھندلایا ہوا نظر آیا۔ آؤٹ آف فوکس۔ جیسے خوبصورت تصویر کے اوپر مہین کاغذ کا حجاب۔ بعض اوقات قربتیں بھی منظر کو دھندلا دیتی ہیں ؎

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا مجھے
کچھ دور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

آنکھیں میچ کر آنسو گرائے۔ منظر واضح ہو گیا۔ خوبصورتی اور نکھر گئی' حسن اور نمایاں' بلیک اینڈ وہائٹ' درمیان میں سیاہ غلاف میں ملبوس خانہ کعبہ تھا اور اس کے اردگرد' سفید سفید احرام اور عباؤں میں ملبوس پھیرے لیتے ہوئے انسانوں کا ہجوم' اجالے رقص کناں تھے' نکھار محو گردش۔ حسن مجسم' مرکوز' عشق بے تاب' سجدہ ریز۔ شوق فراواں' روشنی چار سو' اندر باہر' جاوید اور دوسرے ساتھی کو تھپکی دے کر سجدے سے اٹھایا اور اس طواف میں شامل ہو گئے جو نور کے ہالے کی مانند ہروقت گردش میں رہتا ہے۔ جانے اس طواف میں کیا مصلحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو یہ کائنات تخلیق فرمائی اس میں طواف کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہر ذرہ اپنے مرکز کے گرد گھوم رہا ہے۔ زمین خود اپنے محور پر بھی اور سورج کے گرد بھی گھوم رہی ہے چاند زمین کے طواف میں مصروف ہے ہمارے شمسی نظام کے تمام سیارے سورج کے اردگرد گھوم رہے ہیں اور سورج ہے کہ وہ بھی اپنے مدار میں کسی سمت رواں دواں ہے۔ کون جانے وہ بھی کسی مرکز کے طواف میں مصروف ہو لیکن اس کا مدار' اس کا راستہ اتنا طویل ہو کہ آج کے سائنسدانوں کو مدار نظر نہ آتا ہو جیسے دیکھنے میں تو یہ زمین چپٹی نظر آتی ہے لیکن ہے گول۔ سورج تو اس وقت بھی حرکت میں تھا جب اس صدی کے نصف تک سائنسدان اسے ساکن مانتے تھے۔ قرآن اسے چودہ صدیوں سے حرکت میں دیکھ رہا ہے والشمس تجری لمستقرلها. ذلک تقدیر العزیز العلیم ۔(اور سورج اپنے ٹھکانے کی

طرف چلا جارہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا مقرر کیا ہوا مضبوط حساب ہے۔)عربی میں جری یجری صاف چلنے' حرکت کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ جانے سرسید نے اس کی تشریح کرتے ہوئے کیسے یہ کہہ دیا کہ اس آیت سے سورج کا حرکت پذیر رہنا قطعاً لازم نہیں کیونکہ قرآن بنیادی طور پر سائنس کی کتاب نہیں۔ شاید وہ اس وقت رائج تھیوری کو سچ مان کر قرآن کو اس پر منطبق کرنا چاہتے ہوں ---------- خیر تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآن نے تو چاند' سورج اور دوسرے سیاروں کے بارے میں صاف کہا ہے...... وکل فی فلک یسبحون (سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں)

ماہرین فلکیات نے اب دریافت کیا ہے کہ نہ صرف سورج بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (Fixed stars) کہا جاتا ہے ایک رخ پر چلے جارہے ہیں ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۶ سے ۱۶۰ کلومیٹر فی سیکنڈ لگایا گیا ہے۔ سورج کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنے پورے نظام شمسی کو لئے ہوئے ۲۰ کلومیٹر فی سیکنڈ یعنی بہتر ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے حج کو زندگی میں ایک بار فرض قرار دیا اور اس میں طواف کو لازم قرار دیا اس میں کوئی مصلحت ہو گی۔ یہ دور کی کوڑی نہیں بلکہ غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام میں جو پانچ باتیں بنیادی ارکان کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے تین کے اوقات کا تعین براہ راست اس پورے نظام شمسی اور زمین کی گردش سے ہوتا ہے۔

اس نظام شمسی کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز سورج' زمین سے تین لاکھ گنا بڑا ہے۔ نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم دو ارب اسی کروڑ میل اور پلوٹو کا فاصلہ چار ارب ساٹھ کروڑ میل ہے اور یہ نظام شمسی ایک بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں میں ہمارا نظام شمسی شامل ہے اس میں تقریباً تین ہزار ملین یعنی تین ارب سورج پائے جاتے ہیں۔ ہر سورج کا اپنا ایک نظام شمسی ہے۔ ہمارے سورج کے علاوہ ہماری زمین سے قریب ترین آفتاب ہم سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی ہماری زمین تک پہنچنے میں چار سال صرف ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بیس لاکھ لولبی سحابیوں (SPIRAL NEBULAE) میں سے ایک ہے اور ان میں قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی

روشنی دس لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ رہے بعید ترین اجرام فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں تو ان کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں دس کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات جھانک لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جو اب تک انسان کے مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائع مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

ان تمام وسعتوں میں انسانی زندگی اب تک کے مشاہدے کے مطابق' صرف اسی زمین پر ہے جس پر ہم آباد ہیں۔ گرچہ قرآن حکیم سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہماری جیسی زمین اللہ تعالیٰ نے کوئی اور بھی تخلیق کر رکھی ہے لیکن بہرحال اب تک کے انسانی علم کے مطابق انسان تو اسی زمین پر آباد ہے اور اس پورے روئے زمین پر جب اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں پوری زمین کے لوگوں کو سال میں ایک بار سمٹ کر آنا تھا تو وہ جگہ اس نظام میں یقیناً کوئی اہم مقام رکھتی ہو گی۔ کون جانے پوری کائنات جو آج بھی پھیل رہی ہے' مسلسل بن رہی ہے' وسیع تر ہوتی جا رہی ہے' اس کا مرکزی مقام یہی بیت اللہ ہو اور کشش کا سارا نظام' توازن کی سب ترکیبیں یہیں سے کنٹرول ہوتی ہوں۔ روحانی دنیا کا مرکز تو یہ ہے ہی کون جانے مادی کائنات کا نیوکلیس (Nucleus) بھی یہی ہو۔ عرصہ ہوا ایک حدیث پڑھی تھی جس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ جب قیامت برپا ہو گی تو بیت اللہ کو اٹھا لیا جائے گا-------- کون جانے اس کی حیثیت کائنات کی مشینری میں اس بنیادی کیل کی سی ہو جس نے ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھا ہوا ہے۔

ایک اور پہلو قابل غور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو یہ کائنات تخلیق فرمائی اس میں ایک زبردست تناسب اور توازن پایا جاتا ہے۔ زمین پر انسانی زندگی اسی لئے ممکن ہے کہ اس کا سورج سے فاصلہ' اس کے اردگرد پھیلی ہوئی گیسیں' اس کی محوری اور سالانہ گردش' غرض سبھی عوامل انسانی زندگی میں تعاون کرتے ہیں---- ہمارے نظام شمسی کے مختلف سیارے ایک دوسرے سے خاص فاصلوں پر واقع ہیں۔ ان فاصلوں میں انسانی عقل کو حیران کرنے والی' چونکا دینے والی ایک خاص نسبت ہے۔ اس نسبت کا ایک انتہائی سادہ مگر حیران کن فارمولا ہے جسے سمجھنے کے لئے آپ ۳ ۶

۱۲ ۲۴ کے ہندسے لکھیں یعنی ہر نیا ہندسہ اپنے پہلے والے ہندسے سے دگنا ہو۔ دوسری سطر میں تمام ہندسوں میں چار جمع کریں۔ تیسری سطر میں انہیں دس سے تقسیم کر دیں۔ اب فلکیات کی کوئی سے کتاب اٹھا کر مختلف سیاروں کا سورج سے فاصلہ معلوم کریں اور زمین اور سورج کے درمیانی فاصلے کو ایک اکائی تصور کرتے ہوئے دوسرے سیاروں سے موازنہ کریں تو ان میں یہی نسبت نظر آئے گی۔ بات طویل ہو گئی۔ کہنا محض یہ تھا کہ جب مختلف ثوابت اور سیاروں کی حرکت اور گردش کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص قوانین مقرر کئے تو انسان کو جس عمارت کے طواف کا حکم دیا گیا وہ یونہی تو ایک عمارت نہیں ہو سکتی۔ اس پورے نظام شمسی' کہکشاں بلکہ کائنات میں یہ یقیناً کوئی اہم مقام رکھتی ہے۔ آنے والا وقت یقیناً ہمارے موقف کی سچائی کی گواہی دے گا۔

تو ہم طواف کر رہے تھے۔

بے خودی کے عالم میں ہم نے طواف مکمل کیا۔ مقام ابراہیم کے پاس آ کر دو نفل پڑھے سلام پھیرا تو ایک مسکین صورت پاکستانی کو اپنے پاس بیٹھے پایا۔ سلام کر کے اس نے مصافحہ فرمایا اور پھر بتایا کہ اس کی جیب کٹ گئی ہے' پاسپورٹ گم ہو گیا ہے' واپسی کے لئے پیسے نہیں ہیں وغیرہ وغیرہ کوئی مدد! تو انہوں نے اللہ کے گھر کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ وہاں تو سوائے اللہ کے کسی سے نہ مانگنا چاہیے۔ بس یقین کی بات ہے' وہ تو عام جگہوں پر عام دنوں میں دعاؤں کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ خالی نہیں لوٹاتا' یہ تو پھر اس کا گھر ہے۔ کرنل قادری نے ہمیں بتایا کہ ان کی بیگم کا اللہ تعالیٰ پر بڑا پختہ ایمان ہے۔ عمرے کے لئے گئے ہوئے تھے جب ان کا پرس کھو گیا۔ کرنل صاحب کو تو لینے کے دینے پڑ گئے لیکن ان کی بیگم انہیں سمجھاتی رہیں' تسلی دیتی رہیں کہ فکر نہ کرو جس کے ہاں آئے ہیں وہی بندوبست کر دے گا تم عبادت میں دل لگاؤ اور جب وہ باہر نکلے تو عین دروازے پر انہیں ایک واقف مل گیا جس نے انہیں دس ہزار ریال دیئے کہ ان کے مساوی روپے پاکستان میں ان کے گھر والوں کے حوالے کر دیئے جائیں۔

اور ایک یہ شخص تھا جو خدا کے گھر میں بھی اس کے بندوں کو کہانیاں سنا سنا پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔ غصہ تو بڑا آیا لیکن مقام ادب تھا۔ گھر اس کا تھا' اس کے گھر میں آنے والے اسی کے مہمان تھے۔ وہ جانے کون کیا' کیسا ہے۔ ایک بہانہ آ رہا تھا اللہ کے گھر میں نیکی کمانے کا۔ توفیق

ہو تو کر گذرو۔ ورنہ چپ سادھ لو۔ کسی کو کہنے سننے کا حق نہیں

مقام ابراہیم سے اٹھ کر آب زم زم پیا۔ جیسے ایک تسکین روح کی گہرائیوں تک اتر گئی ہو۔ ننھے اسماعیل کی ایڑیاں کتنی بابرکت تھیں کہ ان کے طفیل اب تک کروڑوں آدمی آب زم زم سے فیض یاب ہو چکے ہیں اور چشمہ ہے کہ اس کی روانی میں کوئی کمی ہے نا پانی کے ذائقے میں تبدیلی۔ روح کی شفا' جسم کی غذا۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے بی بی ہاجرہ کی بے تابیاں خود بخود نظروں میں گھوم جاتی ہیں دونوں ٹیلوں کی درمیانی جگہ نشیب میں ہے۔ بی بی ہاجرہ یہاں آتیں تو ان کا لخت جگر ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ تب وہ بے تاب ہو کر دوڑتی تھیں۔ تا وقتیکہ دوسرے ٹیلے کی چڑھائی سے انہیں ان کا بچہ پھر نظر آنے لگتا۔ میرا خیال ہے کہ مائیں اس کرب کو زیادہ بہتر طریقے سے محسوس کر سکتی ہیں جس سے بی بی ہاجرہ اس وقت گذری ہوں گی۔ یہ ماں کی مامتا ہی تو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے امر کر دیا۔

حج کی تمام ادائیں ایک چھوٹے سے کنبے کی کہانی کے اردگرد گھومتی ہیں۔ چھوٹا سا کنبہ' اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا۔ سراپا اطاعت' وفا شعار' تسلیم و رضا کے پیکر۔ عمر کا آخری حصہ تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں بی بی ہاجرہ سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اتنی دعاؤں اور تمناؤں کے ساتھ پیدا ہونے والا بچہ کتنا لاڈلا' کتنا پیارا' دل کے کتنا قریب ہو گا۔ حکم ہوا اسے یہاں چھوڑ جاؤ' وادی بے نمود میں' جہاں دھوپ سے بچنے کے لئے کسی شجر کا سایہ تھا نہ پیاس بجھانے کے لئے پانی کا کوئی بندوبست۔ سورج آگ برساتا تھا اور تپتی ہوئی ریت کسی سبز پتے کو پنپنے نہ دیتی تھی۔ پانی کا جو مشکیزہ چھوڑ چلے تھے۔ وہ کتنے دن چلتا--- ایثار و وفا کے اس پیکر پر ہزار محبتیں قربان' جب وہ اپنی بیوی اور بچے سے منہ موڑ کر چلا ہو گا تو فطری طور پر تقاضائے بشریت سے دل میں اک ہوک سی تو اٹھی ہو گی' دھڑکنیں منتشر تو ہوئی ہوں گی شفقت پدری نے پیچ و تاب تو کھائے ہوں گے لیکن وہ جس مقام پر فائز تھے اس کے وقار کا تقاضا تھا کہ لب خاموش رہیں لہجہ پر سکون ۔

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

پیغمبروں کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کبھی دہشت ناک حد تک آزمائشوں کے دہکتے الاؤ' سینا پر لہراتے' بل کھاتے اژدہے' ننگی تلواروں کے بیچ سے گذرتے غار ثور کے راستے کبھی لا تخف' لا تحزن کی تسلیاں اور کبھی کبھی بے تکلف گفتگو۔

ایک دفعہ ابراہیم علیہ اسلام نے کہا۔

"ربی! تو مردوں کو زندہ کیسے کرے گا"؟

"تجھے یقین نہیں ہے"؟

"یقین تو ہے لیکن دل کے اطمینان کو پوچھتا ہوں"۔

"اچھا! تو چار پرندوں کو خود سے مانوس کرو۔ پھر انہیں ذبح کر کے سامنے کے پہاڑ پر رکھ دو ---- پھر انہیں اپنی طرف بلاؤ۔ دیکھو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے"۔

جس کے لئے دہکتی آگ' گل و گلزار میں بدل دی گئی تھی' وہ تپتی ہوئی ریت سے کیا ڈرتا' جس نے ذبح شدہ پرندوں کو اپنی آنکھوں زندہ ہو کر اپنی طرف آتے دیکھا تھا اسے ایک لمحے کے لئے بھی شک پڑتا تو کیسے کہ اس آگ برساتی وادی میں اس کے بال بچے ضائع ہو جائیں گے۔ اسے اپنے رب کی حکمت پر بھروسہ تھا۔ یقین کامل تھا۔ پوچھا بھی نہیں کیوں۔ بس چھوڑ کر چلے گئے۔

ایک عرصہ کے بعد لوٹے تو باصبر بیوی نے دھڑکنیں فرش راہ کر دیں۔ بیٹا نہ صرف سلامت تھا بلکہ قد کاٹھ بھی نکال چکا تھا۔ ابھی اسے دیکھ دیکھ جی بھی نہ بھرا تھا۔ جب پرپیچ سوالات سے مشکل ترین سوال اترا "اسے ہمارے لئے ذبح کرو گے"؟" بلا چون و چرا بیٹے کو ساتھ لے ویرانے کو چل دیے۔ اور اطاعت گذار بیٹے کو دیکھو' کہتا ہے "ابا جان! آپ اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ شفقت پدری سے احکام الٰہی کی تعمیل میں ہاتھ کانپ جائے"۔ اللہ۔ اللہ

سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

یونہی تو انہیں یہ شرف حاصل نہیں ہو گیا کہ رہتی دنیا تک ان کے نقوش پا کی پیروی لازم ٹھہری۔ کعبہ کے اردگرد جن چیزوں کو' جن حرکات و سکنات کو محفوظ کیا گیا' دوام عطا ہوا' ان کا تعلق اس گھرانے کے قدموں سے ہے۔ مقام ابراہیم پر حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے پاؤں کا

نشان ثبت ہے۔ آب زم زم اس جگہ سے پھوٹا جہاں دودھ پیتے اسماعیل اپنی ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ اور سعی بھی اسی جگہ حکم ہوئی جہاں بی بی ہاجرہ اپنے قدموں پر بے تابانہ دوڑتی تھیں۔ منیٰ میں حج کے دنوں میں جہاں جہاں رمی ہوتی ہے یعنی "شیطان" کو کنکر مارے جاتے ہیں۔ وہی جگہیں ہیں جہاں شیطان باپ بیٹے کے قدم روک کر انہیں ورغلانے کی کوشش کرتا رہا۔ بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسا مقام حاصل ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں اور وہ یہ کہ آج دنیا میں جو لوگ بھی 'اللہ' وحی 'کتاب اور نبوت کو مانتے ہیں وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشوائی کو مانتے ہیں اور ان میں مسلمان' عیسائی اور یہودی سبھی شامل ہیں۔ یہ الگ بات کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے گھرانے کے نقوش پاکی پیروی 'لغوی اور روحانی' دونوں معنوں میں اگر کوئی کرتا ہے تو صرف مسلمان۔ آج مکہ اور اس کے اردگرد جو خوش حالی' آسودگی' طمانیت' امن و امان اور فراوانی نظر آتی ہے وہ سب کچھ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ وہ جب اپنے بیٹے کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو ان کے لبوں پر یہ دعا تھی۔ اے رب! اس شہر کو امن والا شہر بنانا' اس کے رہنے والوں میں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھیں۔ انہیں پھل عطا کرنا اور ان میں ایک رسول بھیجنا جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے' انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے"۔

رب کا میلہ

بیت اللہ کی دنیا عجب دنیا ہے۔ اس کے دروازوں سے داخل تو لوگ گروہ در گروہ ہوتے ہیں۔ مجموعوں کی شکل میں' انبوہ کثیر کی صورت' لیکن صحن میں اترتے ہی ہر شخص فرد واحد رہ جاتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی تمنائیں ہوتی ہیں' اپنی دعائیں' اپنی مرادیں' اپنی منتیں' اپنی چاہتیں۔ سارے مطالبے ایک سے ہونے کے باوجود' ہر زندگی مختلف ہوتی ہے جس میں محرومیاں بھی ہوتی ہیں۔ حسرتیں بھی' کردہ گناہوں پر پشیمانیاں' ناکردہ گناہوں کی سزائیں بھی' ہر کوئی اپنے گناہوں کا پشتارہ' خواہشوں کی گٹھڑی اور تمناؤں کی کانفیڈنشل فہرست ساتھ لاتا ہے اور چپکے چپکے' سرگوشیوں میں اللہ میاں کے حضور پیش کرتا ہے۔ کچھ راز ایسے ہوتے ہیں کہ لب پر بھی نہیں آتے۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں نا۔ یہ راز ایسے ہوتے ہیں کہ بیت اللہ کی دیواروں کو بھی ان کا امین نہیں بنایا جا سکتا۔ براہ راست اللہ میاں کی خدمت ہی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ بغیر زبان پر لائے۔ "اے اللہ! تو جانتا ہے' تو علیم ہے' تو حلیم ہے"۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ہزاروں میل کا سفر جن کی سنگت میں طے کر کے بیت اللہ پہنچتے ہیں' طواف کے دوران' ہاتھ تو ان کے تھامے ہوتے ہیں لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ان سے بھی نہیں کی جاتیں' ان پر ذاتی' پرسنل' کانفیڈنشل' خفیہ' سیکرٹ' بلکہ ٹاپ سیکرٹ کے لیبل لگا کر رب کعبہ کے حضور پیش کی جاتی ہیں۔ اقبالؒ خود تو وہاں نہیں جا سکے۔ گھر بیٹھے بیٹھے درخواست بھجوادی

گر تو می خواہی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفےٰ پنہاں بگیر

اگر تو مجھ سے حساب کتاب لینا ہی چاہے تو محمد مصطفےٰ ﷺ کے سامنے نہ لینا۔ ان سے چھپ کر لینا (کہ ان سے محبت کے مدعی کے ایسے ایسے گناہ؟)

اور اللہ میاں کی عظمت تو دیکھو۔ گھر ہے اس کا لیکن کوئی انتظار گاہ نہیں' کوئی ڈرائنگ روم نہیں' کوئی بیڈ روم' پرائیوٹ چیمبر' کمرہ خاص' کچھ نہیں۔ زنان خانے' مردانے کی کوئی تمیز نہیں۔ دیوان خاص بھی کوئی نہیں۔ ہاں دیوان عام ہے' کھلی کچہری' جس میں داخلے کے لئے کسی پہریدار سے پوچھنا پڑتا ہے نہ کوئی زنجیر کھینچنی پڑتی ہے۔ کوئی منشی' کوئی پی اے' کوئی

سیکریٹری کوئی پی ایس سی ہوئی نہیں۔ اس کے باوجود جو کوئی دیوان عام میں داخل ہو جاتا ہے وی وی آئی پی ہو جاتا ہے' سٹیٹ گیسٹ' جو جو کچھ کہتا ہے' بڑی احتیاط کے ساتھ' باریک بینی کے ساتھ نوٹ کیا جاتا ہے۔ اللہ میاں ہر شخص کو الگ الگ ٹریٹ کرتے ہیں۔ ذاتی توجہ کے ساتھ۔ اور بہت سے لوگ گواہی دیں گے کہ جو دعا دل کی گہرائیوں سے کی جاتی ہے' پورے یقین کے ساتھ' اعتماد کے ساتھ' اس کا جواب وہیں' اسی وقت مل جاتا ہے۔ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ درخواست منظور کر لی گئی۔ یہ PEND کر دی گئی اور یہ مسترد۔ اس کی مصلحتیں وہی جانے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے پورے چمن کے مجموعی انتظام کی بہتری کو سامنے رکھ کر کرتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے۔ وہی وقت کی بہترین تدبیر ہوتی ہے۔ ہماری نگاہ کوتاہ بیں' وقتی طور پر اس کی مصلحت سمجھنے سے قاصر رہتی ہے' اس لئے وارننگ دے دی گئی ہے'

"زمانے کو برا مت کہو۔ میں زمانہ ہوں"۔ (حدیث قدسی)

تو جب خانہ کعبہ میں ہوتے تو اطمینان سے کسی کونے میں بیٹھ جاتے اور ان تمام افراد کو یاد کرتے جو سن شعور سے اب تک ہمارے حلقہ تعارف میں آئے تھے۔ ان کے لئے دعا کرتے۔ اس بہانے ایک تو اللہ میاں سے راز و نیاز کا موقع مل جاتا' دوسرے بک اکاؤنٹ میں کچھ نہ کچھ جمع ہوتا رہتا کہ دعا کسی حال فائدے سے خالی نہیں جاتی۔ اگر منظور نہ بھی ہو تو اس کے بدلے آنے والی کوئی آفت ٹال دی جاتی ہے یا آخرت میں کوئی اجر محفوظ کر دیا جاتا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اتنا شاندار ہو گا کہ انسان تمنا کرے گا کہ کاش دنیا میں اس کی کوئی دعا قبول نہ ہوئی ہوتی۔ انسان صرف اپنی ذات کے لئے دعا کرے تو اس کی تمناؤں کا سٹاک جلد ختم ہو جاتا ہے۔ آخر کیا کیا کچھ مانگے اپنے لئے؟ پس چاہیے کہ دعاؤں میں دوستوں کو' رشتہ داروں کو بلکہ مخالفوں کو بھی (مثبت دعاؤں کے ساتھ) یاد رکھے۔ دعا کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ مانگو دوسروں کے لئے' جھولی اپنی بھرتی رہتی ہے۔ دینے والے کی رحمت بے پایاں جو ہوئی۔ پھر اسی کا در ایسا ہے جہاں سے بار بار مانگتے رہو' کبھی ڈانٹ نہیں پڑتی۔ پس چاہیے کہ اسی کو پکاریں' اسی سے مدد مانگیں' صرف اسی سے۔ اور اس کے لیے یہ شرط تو نہیں کہ خانہ کعبہ ہی جائیں تو یہ سلسلہ قائم ہو' دعاؤں کا سلسلہ تو کہیں بھی' کسی بھی وقت قائم ہو سکتا ہے۔ ہم وہاں تھے' جہاں

لذیذ بود حکایت' دراز تر گفتم

اللہ میاں سے باتیں کرنے میں زیادہ لطف آتا'

"اے اللہ! وہ بچپن کا ساتھی......... جانے آج کل کہاں ہے۔ جہاں کہیں بھی ہے اسے اپنی امان میں رکھنا"۔

"ہماری امان میں ہے"۔

"اس کی مشکلات آسان فرما"۔ ------------ "او کے۔"

"اور وہ فلاں۔ ہم نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ معافی عطا ہو"۔

"او کے"۔

"اسے اپنے پاس سے بدلہ عطا فرما"۔

Granted

فلاں کے کاروبار کا آغاز ہے۔ برکت فرما"۔

"چل جائے گا"۔

"فلاں مدیر کتنے خلوص سے محنت کر رہے ہیں۔ ان کے پرچے کو فروغ عطا کر"۔

"او کے"۔

"اور وہ جوانی کی لغزشیں' تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے بھید جانتا ہے' معافی"

آئندہ محتاط رہنا' چلو آگے"۔

"یا اللہ کمزور ہوں' خود پر اعتماد نہیں۔ بھول چوک ہو سکتی ہے۔ پھر نہ غلطی کر بیٹھوں ------------------------ پیشگی معافی۔"

"اچھا؟ لائسنس چاہیے؟"

"نہیں اللہ میاں بس خود سے ڈر لگتا ہے۔"

"او کے۔ او کے"

"اور وہ جو ہم سے بچھڑ گئے' انہیں سکون سے رکھنا۔"

"وہ سکون سے ہیں"۔

وہ سب لوگ جن سے ہم نے علم سیکھا۔ ماسٹر غلام نبی' خالد سلطان' عبدالرحمٰن..............

جن سے دین سیکھا فلاں، فلاں......... ان کے درجات بلند فرما۔"

Agreed

"فلاں کی بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ مالی مشکلات ہیں۔ کوئی تدبیر!"

"نکل آئے گی"۔

"فلاں اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہے۔ اس کے غم کا مداوا!"

"ہو جائے گا"۔

خانہ کعبہ میں رحمت خداوندی جوش میں ہوتی ہے۔ درخواستیں فٹافٹ پاس ہوتی ہیں۔ ایک بار مسترد ہوتے بھی محسوس ہوئی۔

"اللہ! ہمارے فلاں دوست بے اولاد ہیں۔ انہیں اولاد عطا فرما"۔

خاموشی

"اللہ! فلاں صاحب بڑے اچھے ہیں۔ انصاف پسند ہیں۔ 'خوش اخلاق'۔

"کسے بتا رہے ہو؟"

"اچھا سوری، تو بات یہ ہے کہ ان کے پاس تیرا دیا باقی تو سب کچھ ہے، ایک اولاد کی نعمت سے محروم ہیں........"

"وہ خود کیوں نہیں آئے؟"۔

"ہم سے کوئی جواب نہ بن پڑا"۔ شاید...... شاید کوئی مجبوری ہو"۔

"کیا مجبوری ہے؟"۔

ہمارے علم میں تو واقعی انہیں کوئی مجبوری نہیں تھی۔ کیا وکالت کرتے۔ جب ان کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ انکاؤ محسوس ہوا، جیسے موسم کی خرابی سے تصویر دھندلا جائے، آواز غائب ہو جائے۔ پاکستان واپس آکر انہیں اشاروں کنایوں میں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حج کے لیے جائیں۔

اللہ میاں کے ساتھ ہاٹ لائن پر تو کسی بھی وقت بات کی جاسکتی ہے (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان) لیکن اس کے گھر میں بیٹھ کر اس سے بات کرنے کا لطف ہی اور ہے۔ پھر اس کے کلام کو وہاں بیٹھ کر پڑھا جائے تو معانی اور واضح، مفہوم اور بہتر طریقے سے سمجھ میں آتا ہے۔

کچھ آیتیں تو ہیں ہی ایسی کہ ان کا پورا اور صحیح مفہوم ادا ہی تب ہوتا ہے جب انہیں مکے یا خانہ کعبہ کے عین بیچ بیٹھ کر پڑھا جائے جیسے

فلیعبدوا رب هذا البیت الذی اطعمهم من جوع و آمنهم من خوف

(پس چاہیے کہ وہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں جس نے بھوک کی حالت میں انہیں کھلایا اور خوف کی حالت میں انہیں امن دیا۔)

والتین ○ والزیتون ○ وطور صینین وهذا البلد الامین ○

قسم ہے انجیر کی، زیتون کی، طور سیناء کی اور اس امن والے شہر کی۔

ان آیتوں میں جو اسمائے اشارہ استعمال کیے گئے ہیں وہ قریب کی چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور ان آیتوں کو پڑھنے کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب آپ مکہ میں ہوں اور بیت اللہ آپ کی آنکھوں کے عین سامنے۔

بیت اللہ کے اردگرد واقع مکے کے انہی گلیوں میں تیرہ سال تک قرآن نازل ہوا۔ اور جب ہٹ دھرم کافروں نے اسے ماننے سے انکار کیا تو صاحب وحی نے انہی گلیوں، محلوں میں گذاری ہوئی زندگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا تھا، لقد لبثت فیکم عمراسنین۔ (میں نے اپنی عمر کے کتنے ہی سال تمہارے ساتھ گذارے ہیں)۔ کتنی خوبصورت بات ہے اور کتنا بڑا دعویٰ۔ بھرپور اپنائیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ کل تک تو میں تمہارا ہی ساتھی تھا، تمہارے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔ چلتا پھرتا تھا۔ تمہارے دکھ، میرے دکھ تھے۔ تمہاری میری خوشیاں سانجھی تھیں۔ کبھی مجھے جھوٹ بولتے، لاف زنی کرتے، یاوہ گوئی کرتے سنا؟ کوئی ہے تم میں جو میرے کردار پر انگلی اٹھاسکے؟ نہیں اور یقیناً اس کا جواب نہیں میں ہے تو مان لو کہ آج جن حقیقتوں کی خبر تمہیں دے رہا ہوں ان میں بھی چنداں کوئی جھوٹ شامل نہیں۔ تمہارے ساتھ گذارے ہوئے ماہ و سال میرے دعوے کی صداقت کے گواہ ہیں۔ تمہارا خیر خواہ رہا ہوں اور اب بھی تمہارے بھلے کی بات پیش کر رہا ہوں۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ پر انہی گلی کوچوں میں ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ ایک دفعہ ہوٹل سے ظہر کی نماز کے لئے خانہ کعبہ کی طرف آنے لگے تو سوچا آج ننگے پاؤں چلیں۔ ان گلیوں کی تپش تو محسوس کریں جہاں سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو محض اس جرم میں سزا دی

جاتی تھی کہ وہ ایک خدا کو کیوں مانتا ہے۔ سیڑھیوں سے سڑک پر قدم کیا رکھا یوں لگا جلتے توے پر پاؤں رکھ دیا۔ فوراً دوسرا قدم زمین پر رکھتے ہوئے پہلا اٹھالیا۔ یہ محض ایک اضطراری کیفیت تھی۔ ورنہ دوسرا قدم کسی چمن کی روش پر تھوڑا ہی پڑنا تھا یوں سمجھو دہکتے کوئلوں پر قدم رکھتے تیز تیز چلے جا رہے تھے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت خباب بن الارت یاد آتے رہے۔ ان کی یاد میں ہم نے بھی احد احد کرنے کی کوشش کی لیکن زبان سے اف اف نکلتا تھا۔ باب عبدالعزیز سامنے ہی تھا لیکن نگاہیں نیچی کئے چلتے رہے کہ نظر اٹھانے پر وہ دور لگتا تھا۔ چند منٹوں کا وہ فاصلہ جانے کیسے طے کیا اور سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی استقامت کو خراج تحسین پیش کرتے مسجد میں داخل ہو گئے۔ تکبیر ہو چکی تھی۔ ہمارے برآمدے میں داخل ہوتے ہی اللہ اکبر کہا گیا قریبی صف میں جہاں جگہ ملی، وہیں کھڑے ہو کر نیت باندھ لی۔ اللہ اکبر کہا تو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی یاد ساتھ تھی۔ واقعی اللہ بہت بڑا ہے کہ اس نے اپنے کیسے کیسے شیدائی پیدا کئے کہ وہ اتنے دکھ اٹھانے کے باوجود بھی اس کی توحید کا اعلان کرتے رہے۔ ہم فرش پر کھڑے تھے اور فرش کی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ پاؤں بدلی کرتے رہیں لیکن نماز کے احترام میں ضبط کئے کھڑے رہے۔ اچانک کسی نے ہمیں نرمی سے کھینچ کر بائیں طرف کر لیا ہم ننگے فرش سے قالین پر آگئے۔ یوں لگا جیسے نرم نرم رواں پاؤں سے لپٹ کر اسے سہلا رہا ہو۔ سورہ فاتحہ میں رب العلمین .... الرحمٰن الرحیم پڑھتے ہوئے اس سے پہلے شاید اتنا لطف کبھی نہ آیا تھا۔

چھوٹی چھوٹی آیتیں مکے اور مدینے کی گلیوں میں چلتے ہوئے، نئے معانی سے آشنا کرتی ہیں بشرطیکہ انسان نے تھوڑی بہت عربی سیکھ رکھی ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ان اساتذہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے کہ جن کی بے لوث کوششوں کے نتیجے میں ہم نے عربی سیکھی اور قدم قدم پر ہمارے کام آئی۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کی طرف سے بھی سال میں دو بار ابتدائی عربی سکھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے جس کے مطابق پاکستان بھر میں معمولی پڑھے لکھے لوگ گھر بیٹھے ریڈیو پر اور یونیورسٹی کی طرف سے متعین اساتذہ کی مدد سے عربی سیکھ سکتے ہیں۔ اس پروگرام کی اشاعت گاہے بگاہے اخبارات میں ہوتی رہتی ہے۔ وہ قارئین جو عربی نہ جانتے ہوں اس نیت سے عربی سیکھنے کا اہتمام کریں کہ اس سے ایک تو قرآن فہمی بڑھتی ہے،

روز مرہ زندگی میں قدم قدم پر ربانی ہدایت ملتی رہتی ہے دوسرے کل کلاں، زندگی کے کسی موڑ پر مکے مدینے جانا ہوا تو وہاں کا قیام، قرآن کی تلاوت اور عبادت کے حوالے سے پر لطف اور دوبالا ہو جائے گا۔ ویسے بھی نیت کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس کے ہاں تو نیت بھی کار ثواب ہے۔ اجر ملتا ہے، کیوں چھوڑتے ہو!

تو ہم بیت اللہ کی بات کر رہے تھے۔ عمرہ پورا ہوا اور اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً حاضری کی سعادت ملتی رہی۔ خانہ کعبہ کے بارے میں جو باتیں پیش آئیں۔ انہیں۔ یہیں رقم کر رہے ہیں۔ ان کی ترتیب کوئی نہیں واقعاتی نہ زمانی کہ اس موضوع پر کبھی قلم اٹھانے کا سوچا ہی نہ تھا۔ کبھی نوٹ لئے نہ ان واقعات کو ذہن نشین رکھنے کی کوشش کی جس کی دعوت پر وہاں جایا کرتے تھے اس نے ذرہ ذرہ برابر عمل کا بھی حساب رکھنے کی تسلی دی ہوئی ہے۔

اللہ کے گھر میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف، علم اور سطح کے مطابق بامراد لوٹتے ہیں۔ ایک دفعہ حطیم میں بیٹھے تھے کہ قریب سے آواز آئی ”اللہ اچبر“۔ دیکھا کہ ادھیڑ عمر کا ایک ترک ہے، نفل کی نیت کئے نماز پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے قدرے بلند آواز سے تلاوت شروع کر دی۔ سورہ فاتحہ کے بعد اس نے سورہ اخلاص یعنی قل ھو اللہ پڑھی اور پھر ”اللہ اچبر“ کہتے ہوئے رکوع میں چلا گیا۔ اس کے ہر اللہ اچبر پر ہمارا دھیان بٹتا لیکن وہ تھا کہ دھڑا دھڑ نفل پہ نفل پڑھے جا رہا تھا اور چونکہ سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں تلاوت کرتا تھا اس لئے یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ہر رکعت میں صرف سورہ اخلاص ہی پڑھ رہا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ کوئی منت مان کر آیا تھا کہ اس نے سورہ اخلاص کے ساتھ اتنی نفلیں پڑھنی ہیں یا نبی رحمتؐ کا یہ فرمان اس کے پیش نظر تھا کہ سورہ اخلاص سے محبت اس کے پڑھنے والے کو جنت کا مستحق بنا دیتی ہے یا اسے بس یاد ہی ایک سورت تھی۔ دوسرے وہ اللہ اکبر کو اللہ اچبر کیوں کہہ رہا تھا۔ ہماری صحافیانہ حس ہمیں انٹرویو پر اکسا رہی تھی لیکن وہ تھا کہ اپنے اردگرد سے بے نیاز اپنے اللہ سے راز و نیاز میں مصروف تھا۔ اگر ہمیں توجہ حاصل نہیں ہو رہی تھی تو اس کا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا کہ ہم دوسروں کی حاضری میں بھی مخل ہوتے۔ اپنے لئے اس کے سے انہماک کی دعا کرتے ہوئے ہم حطیم سے اٹھ آئے اور کسی اور کونے میں جا بیٹھے۔

اور یہ واقعہ حافظ ادریس نے سنایا کہ لاہور کا ایک سرپھرا باب ملتزم سے لپٹا دعا کر رہا تھا"اللہ میاں! ہے تو تیرا گھر، ہم کچھ کہہ تو نہیں سکتے پر تو جانتا ہے کہ لاہور لاہور ہے۔ بس واپسی کی ٹکٹ کا بندوبست کر دے"۔

جانے بیچارہ کب سے واپسی کی ٹکٹ کے لئے دھکے کھا رہا تھا۔

ایک اور بدو کا قصہ سناتے ہیں کہ خانہ کعبہ سے لپٹا رو رو کر پکارتا تھا

"یا اللہ! گنا یا اللہ! گنا"۔

حافظ ادریس کافی دیر تو حیران ہوتے رہے کہ خانہ کعبہ میں یہ شخص محض گنے مانگنے آیا ہے لیکن پھر یاد آیا کہ مصری مقامی بولی میں جیم کو گاف بولتے ہیں۔ اپنے جمال عبدالناصر کو بھی گمال عبدالناصر کہتے تھے تو وہ اللہ میاں سے جنہ طلب کر رہا تھا جو اس کی زبان میں گنا ہی تھی۔

خانہ کعبہ میں جہاں اپنے آپ سے بے خبر، اس کی دھن میں ڈوبے ہوئے، نشے سے سرشار لوگ نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی دکھائی پڑتے ہیں جو اپنی انا کا لبادہ اپنے اردگرد لپیٹے رہتے ہیں اور اس کے دربار میں بھی خود سے جدا نہیں ہوتے حالانکہ وہاں تو سب کچھ اسی کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ ایک دفعہ وضو خانوں میں وضو کرنے گئے۔ ان دنوں وہاں ایسے نلکے لگے ہوئے تھے جنہیں پانی حاصل کرنے کے لئے دبانا پڑتا تھا۔ غالباً حج کا موقع تھا۔ سخت رش تھا۔ جانے یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ ہم نے نلکا دبانے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو عربی لباس میں ملبوس ایک شخص نے ہمیں دھکا دے کر پرے کر دیا اور خود نلکے پر جھک گیا۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے یہ کیا ہوا کہ قریب ہی کھڑے ایک صحت مند پاکستانی نے اسے کندھے سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "سر! تسی وضو کرو"۔ اس نے ہمیں سر کہہ کر مخاطب کیا تھا، شاید ہماری یونٹ کا کوئی فرد تھا یا بس ایک پاکستانی جو اپنے ہم وطن کی مدد کے لیے عین خانہ کعبہ میں مرنے مارنے پر اتر آیا تھا۔ عرب نے سنبھلتے ہی مغلظات بکنا شروع کر دیں اور پاکستانی کو پیچھے دھکیلنے کو ہی تھا کہ اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے خالص پنجابی میں جوابی کارروائی شروع کر دی۔ "او تیری میں ...." ہم نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"سر! آپ نہیں سمجھتے انہیں۔ یہ اپنے آپ کو پھنے خان سمجھتے ہیں۔ خانہ کعبہ ان کے باپ

کا ہے؟ میں نکالتا ہوں ابھی اس کے کس بل"۔

میں نے پھر اسے سمجھایا کہ احرام کی حالت میں لڑائی جھگڑے سے منع کیا گیا ہے اور اگر یہ جہالت پر اترا ہوا ہے تو ہمیں تو اپنے اعمال ضائع نہیں کرنے چاہئیں۔

"سر! لیکن وضو پہلے آپ کریں" غیرت کے ہاتھوں مجبور پاکستانی نے پھر اس عرب کو پیچھے کھینچا جو ہماری گفتگو کے دوران پھر نلکے پر حاوی ہو چکا تھا۔ اسے سمجھایا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے عرب کو وضو کرنے کا اشارہ کیا۔ اور اس کی مدد کے لئے نلکا دبانے کو ہاتھ آگے بڑھائے۔ اس نے ہمارے ہاتھ جھٹک دیے۔

"میں تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا" ہم نے وضاحت کی۔

"مجھے نہیں ضرورت تمہاری مدد کی" اس نے بھی وضاحت فرمائی اور وضو کرنے لگا۔

پاکستانی کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا لیکن ہمارے اشارے پر خاموش کھڑا رہا۔

عمرے کے فوراً بعد ہی حج کا مہینہ آ گیا۔ طے یہ ہوا کہ یونٹ کے آدھے افسر اس سال حج کو چلے جائیں۔ آدھے اگلے سال۔ مترجم ہونے کے ناتے ہماری یہ ڈیوٹی ٹھہری کہ دونوں سال حج پہ جانا ہو گا۔

حج کا سیزن آیا تو یونٹ کے تین چار افسروں کی ایک ٹیم مکہ گئی کہ مختلف معلمین سے معلومات حاصل کر کے کسی مناسب معلم سے شرائط طے کر آئے۔ سعودی عرب سے باہر سے آنے والے حاجیوں کو تو معلمین ایئرپورٹ پر ہی وصول کرنے کے پابند ہیں لیکن اندرون ملک لوگوں سے معاملات طے کرتے ہوئے کوئی ایک جگہ مقرر کر لی جاتی ہے۔ اس کے بعد معلم نہ صرف ایک سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے گاڑیاں مہیا کرتا ہے بلکہ منیٰ اور عرفات میں قیام و طعام بھی اسی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ہماری انتظامی کمیٹی کے افراد جس معلم سے بات چیت کر کے آئے وہ پاکستانی تھا اور اس کا نام مسکین بتایا گیا۔

۷ ذوالحج کو ہم جدہ میں پرانے ایئرپورٹ کے قریب کھڑے تھے۔ میجر خالد نکا اور ایک دو افسر اپنی بیگمات اور بچوں کے ہمراہ تھے۔ کیپٹن سعید نے اپنے والدین کو بلوا کر اپنے نام کی لاج رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ظاہر ہے یہ ایک بہت بڑی سعادت تھی جو اس کے حصے میں آ رہی تھی۔ البتہ وہ انتظامی کمیٹی کا فعال رکن تھا اور اس ناتے حج کے دوران جو مشکلات پیش آنے

والی تھیں اس کا گناہ اور عذاب اسی کے ذمے تھا کہ حج کرنے والوں میں کیپٹن اختر (اب لیفٹیننٹ کرنل) بھی شامل تھا جو پٹھان ہونے کے ناتے پیسوں کے علاوہ کسی اور معاملے میں ادھار کا قائل نہیں تھا اور ہر حساب عین موقع پر چکانے کا عادی تھا۔ معافی' عفو' اغماض یا درگذر جیسے الفاظ اس کی لغت میں شامل نہیں تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ معاف کرنا اللہ کی صفت ہے اور ہم جیسے کمینے (یعنی اختر اور اس کے ہم نوا) لوگوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ کی نقل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ اپنے ہر مخالف کو ایک نہ ایک دن گولی مارنے کے پروگرام بنائے ہوئے تھا اور اس کی ہٹ لسٹ خاص طویل تھی بلکہ روز بروز طویل تر ہوتی جا رہی تھی۔

تو ہم سب جدہ کے پرانے ایرپورٹ پر معلم کی گاڑیوں کے منتظر تھے۔ سڑک پر گاڑیاں شائیں شائیں بلکہ آئیں بائیں شائیں کر کے گذر رہی تھیں لیکن ہمارے معلم کی گاڑیاں اب آتی تھیں نا تب۔ عشاء کی نماز بھی گذر گئی۔ جب انتظار نے طول کھینچا تو انتظامی کمیٹی کے افراد اپنے طور پر ایک کوسٹر کرایے پر لے آئے۔ اس میں بیٹھ کر مکے کی طرف چلے۔ جوں جوں مکہ قریب آتا گیا' گاڑیوں کی رفتار سست ہوتی گئی بلکہ پھر ٹریفک جام ہو گئی۔ خانہ کعبہ سے کافی پہلے ہی اتر گئے۔ لوگوں کا ایک اژدہام تھا جو بیت اللہ کے چاروں طرف ٹوٹا پڑ تا تھا۔ آج رات تک طواف کر کے کل لوگوں نے منیٰ پہنچنا تھا۔ سڑکوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہجوم میں سے جگہ بناتے' ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے معلم مسکین کے دفتر پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ اور بہت سے لوگ دفتر میں' دفتر کے باہر' نیچے سڑک پر' ہر طرف ڈیرے ڈالے بیٹھے ہیں اور معلم کی جان کو رو رہے ہیں۔ سب لوگ اپنے اپنے طور پر ہی مکہ پہنچے تھے۔ رات کے کسی وقت ہم نے طواف کیا۔ نور کا ایک سیلاب تھا جو ہلکورے لے لے کر گردش کر رہا تھا۔ خانہ کعبہ کے قریب جانے کی تو ہمت ہی نہ ہوئی۔ باہر والے سرے پر رہتے ہوئے طواف مکمل کیا۔ سعی ختم کی تو تھک کر چور ہو چکے تھے۔ معلم کے دفتر آئے تو پتہ چلا موصوف کی کوئی خبر نہیں۔ جانے وہ رات کیسے بتائی۔ صبح پھر اپنے طور پر کرایے کی گاڑی لے کر منیٰ پہنچے۔ انتظامی کمیٹی کے افراد ہمیں ایک سڑک کے کنارے بٹھا کر خود معلم کا کیمپ ڈھونڈنے چلے گئے۔ سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا اور تپش بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے تو یہی سوچا کہ سعید اور کلیم ابھی کہیں سے کیمپ کی خبر لے آئیں گے لیکن کچھ دیر

گذری تو گذشتہ تجربے کے پیش نظر یہی سوچا کہ سر چھپانے کی کوئی تدبیر کی جائے۔ جن جن کے پاس فالتو چادریں تھیں' جمع کیں' خواتین سے درخواست کی کہ وہ اپنے پرس ٹٹولیں اور ان سے چادریں جوڑنے کے لئے جو کچھ مل سکے' مہیا کریں۔ بالوں میں لگانے والی پنیں' کلپ اور چند بکسوئے مل گئے۔ ایک جگہ خاردار تار لگی ہوئی تھی۔ چادروں کے ایک طرف کے سرے ان تاروں سے باندھے۔ دوسری طرف ادھر ادھر سے اکٹھی کی گئی شاخیں گاڑیں دوسرے سرے ان سے باندھے اور انہیں آپس میں پنوں' کلپوں اور بکسوؤں سے جوڑ دیا۔ عارضی سا انتظام تھا لیکن اتنا سایہ مہیا ہو گیا کہ عورتیں اور بچے اس میں سما سکتے تھے۔ ایک صاحب کہیں سے برف لے آئے' معلوم نہیں کون کہاں سے برتن مانگ لایا' پانی بھی میسر آ گیا۔ ٹھنڈا پانی بنا کر جو پینا شروع کیا تو کافی دیر تک اس کے جام چلتے رہے۔ اسی دوران ظہر کا وقت ہو گیا۔ نماز بھی پڑھ ڈالی لیکن معلم اور اس کے کیمپ کی تلاش میں گئے ہوئے افراد واپس نہ آئے۔ اختر پیچ رہا تھا۔

"یہ کیا انتظام کیا ہے۔ کدھر ہے معلم؟ ذرا ہاتھ آ جائے میں اسے گولی مار دوں گا"۔

اسے بتایا گیا کہ حالت احرام میں اس طرح کی حرکتیں منع ہیں۔

"میں اس کی شکل تو دیکھ لوں۔ اب نہ سہی' پھر سہی"۔

اختر نے اپنی ہٹ لسٹ میں اضافہ کرنا چاہا۔ ہم نے از راہ مذاق کہا کہ شاید ہمارے گناہ زیادہ ہیں۔ تبھی سارے انتظامات ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان سے محروم کر دیا ہے اور یوں تپتی دوپہر میں ہمیں چاروں طرف سے سینک سینک کر ہمارے گناہ جلا رہا ہے۔ اختر اور بھر گیا'

"یہ باقی سب لوگ زاہد و پارسا ہیں۔ ایک ہمیں رہ گئے ہیں گناہ جلوانے کو؟"

منیٰ میں ہر طرف انسان ہی انسان بکھرے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر' میدان میں' ٹیلوں پر' پہاڑیوں پر' چوٹیوں پر' ہر طرف' ہر جگہ۔ آگ برساتے سورج سے پناہ کے لیے کئی لوگوں نے چھتریاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ کوئی چادر تان کر بیٹھا تھا' کوئی کسی جھاڑی کے مختصر سے سایے میں سمٹنے کی کوشش کر رہا تھا تو کوئی کسی بڑے ٹرک' ٹریلر کے نیچے پناہ لئے ہوئے تھا۔ ایسے بھی تھے جو ایر کنڈیشنڈ کوچز کے اندر ٹھنڈے' آرام دہ سیلونوں کے اندر تشریف فرما تھے۔

دوپہر ڈھل چکی تھی جب انتظامی کمیٹی کے افراد یہ خوشخبری لے کر واپس لوٹے کہ معلم کا کیمپ مل گیا ہے۔ ہم نے اپنا "کیمپ" اکھاڑا' چادریں اور چٹنیں واپس کیں۔ ایک ویگن کرایے پر لی اور کیمپ کی جانب چلے۔ اب جو گھومنا شروع کیا تو پورے منیٰ کا چکر لگالیا لیکن معلم کا کیمپ ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ ویگن والا ایک سمت سے چلتا تھا' گاڑی تیزی سے بھگاتے ہوئے دوسرے سرے پر جاتا تھا' ایک پل کراس کر کے دوسری سمت میں چل نکلتا اور پتہ چلتا کہ ہم پھر اسی سڑک پر ہیں جہاں سے چلے تھے۔ جب رہا نہ گیا تو ہم نے مداخلت کی اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ پتہ چلا کہ کیمپ تو وہ رہا سامنے لیکن ٹریفک کا نظام اس طرح ترتیب دیا گیا تھا کہ سڑکوں پر گاڑیاں صرف ایک سمت کو جا سکتی تھیں۔ جگہ جگہ پل بنے ہوئے تھے جنہیں مقامی زبان میں کبری کہتے ہیں۔ ان کبریوں سے گذر کر آپ مطلوبہ سڑک پر جا سکتے تھے لیکن ویگن ڈرائیور اتنی دیر سے چکر لگانے کے باوجود مطلوبہ سڑک پر نہ پہنچ پایا تھا۔ کبھی وہ کیمپ سے اگلی والی سڑک پر جا نکلتا اور واپس آتا تو بہت پیچھے۔ ایک پولیس والے سے رہنمائی حاصل کی۔ عصر کا وقت ہو گا جب ہم تھکے ماندے' نڈھال' کیمپ میں داخل ہوئے۔ خیال تھا کہ یہاں تو آرام ملے گا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ ہمارے گناہ واقعی زیادہ تھے کہ اللہ میاں گن گن کر بدلے لے رہا تھا۔ سچی بات ہے کہ ہمیں تو بڑا لطف آ رہا تھا۔ مصیبت میں بھی لذت تھی۔ زحمت میں راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس سے ایک تعلق جو بندھا لگ رہا تھا۔ اگر اس نے ہمیں تکلیف ہی میں رکھنے کا فیصلہ کیا تھا تو سر تسلیم خم تھا' جو مزاج یار میں آئے۔ یہ وعدہ بھی تو اسی کا تھا نا کہ جو پورے خلوص سے حج کرے' اس میں لڑائی جھگڑا نہ کرے' ان چیزوں سے باز رہے جن سے روکا گیا تھا تو حج کی تکمیل پر انسان گناہوں سے یوں پاک ہو گا جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ چند گھڑیوں کے صبر اور قناعت کا اتنا بڑا اجر بہت ہی سستا سودا تھا اور ہم طے کیے ہوئے تھے کہ یہ سودا چکانا ہے' کاروبار نبھانا ہے

بنا کے تجھ کو مولا' خود کو بندہ کر لیا میں نے
یہ مہنگا ہو کہ سستا ہو' یہ سودا کر لیا میں نے

اللہ میاں بھی شرطیں بڑھاتے جا رہے تھے۔ معلم کا اب بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کا کیمپ تو موجود تھا لیکن سب خیموں پر کوئی نہ کوئی قابض تھا۔ ہمارے نام کی کوئی چٹ تھی نا خیمہ اور ہم

اکیلے ہی نہ تھے' ہماری طرح اور بہت سے افراد بے خانماں تھے۔ پہلے آنے والوں نے پورے کیمپ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ ہم تو بالکل دن کے آخری حصے میں پہنچے تھے ہمیں جگہ کہاں ملتی۔ اس کیمپ کے قریب ہی' ذرا ہٹ کر' ایک شامیانہ لگا ہوا تھا' نیچے صاف ستھری دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دم بھر کو وہاں جا کر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر میں ہمارے قافلے کے باقی افراد بھی وہیں سمٹ آئے۔ پہلے بیٹھے' پھر نیم دراز ہوئے' پھر بید۔ کھلے' کسی نے چادر نکالی' کسی نے تولیہ' کسی نے احرام ہی کا تکیہ بنایا اور لیٹ گیا۔ فارسی کی کہاوت ہے' خانہ خالی را دیواں می گیرند۔ خالی گھروں پر جن' دیو قبضہ کر لیتے ہیں' خالی شامیانوں کے لئے بھی کوئی محاورہ ایجاد ہو کہ خالی شامیانے بے خانماں زائرین گھیر لیتے ہیں۔ منیٰ کی یہ رات بھی یونہی گذری۔

صبح ہوئی تو حج کے رکن اعظم' وقوف عرفات کی فکر تھی۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں' کیا نہ کریں کہ ایک طرف سے شور اٹھا۔ پتہ چلا کہ معلم مسکین تشریف لے آیا ہے۔ لوگوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور اسے سخت صلواتیں سنا رہے تھے اور سنانے پر اکتفا نہ کر رہے تھے بلکہ دھول دھپا بھی کر رہے تھے۔ اپنے معلم سے ہماری پہلی ملاقات اس حال میں ہوئی کہ وہ بیچارہ اپنی کمر کے گرد باندھے ہوئے احرام کو تھامے کھڑا تھا۔ دوسری چادر اس کی گردن میں لپٹی ہوئی تھی۔ کوئی اسے کھینچ رہا تھا' کوئی دھکا دے رہا تھا' کوئی آنکھیں نکال رہا تھا' کوئی گالیاں' نحیف و نزار سنگل پسلی والا یہ معلم اپنے نام کی طرح مسکین نظر آ رہا تھا۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اپنی نحیف و نزار آواز میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کوئی سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ اسی دوران کوئی پولیس والے کو بلا لایا اور اسے سارا ماجرا کہہ سنایا کہ کیسے اس نے لوگوں کے پیسے کھالئے ہیں اور پچھلے دو دنوں سے غائب ہے اور اب بھی عرفات پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں۔ قریب تھا کہ شرطہ بے چارے مسکین کو پکڑ کر لے جاتا اور اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذلت اور مسکنت طاری ہو جاتی کہ ہم نے مداخلت کی۔ شستہ عربی میں شرطے سے بات کی کہ ہم حالت احرام میں ہیں اور ان زائرین میں شامل ہیں جنہوں نے معلم کو پیسوں کی ادائیگی کی ہے لیکن جو تکلیف ہمیں اٹھانا پڑی تھی وہ تو منجانب اللہ تھی۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہماری وجہ سے معلم کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے "متاثرین مسکین" کو جب یہ پتہ چلا کہ ہم مسکین کو چھڑوانے کی کوشش میں ہیں تو وہ ہمارے

بھی خلاف ہو گئے۔ اختر ابھی ابھی کہیں سے آنکھیں ملتا آیا تھا اور مسکین کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے۔ اس کا بس چلتا تو ایک ہی بار مسکین کو مسکنت سے نجات دلا دیتا۔ اس نے جلد ہی لوگوں کی قیادت سنبھال لی۔ ہم نے کچھ سمجھایا' کچھ ڈانٹ بتائی کہ احرام باندھ کر کیوں اپنے حج خراب کرنے پر تلے ہو۔ حج تو نام ہی صبر اور استقامت کے مظاہرے کا ہے۔ اپنی غلطیاں اور گناہ بخشوانے آئے ہو' ایک شخص کی غلطی معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ (شرم کرو) شرطے نے بیچ کا رستہ نکالا۔ اس نے ہمارا اقامہ (یعنی سعودیہ میں قیام کا سرکاری اجازت نامہ) چیک کرتے ہوئے ہمیں بھی مسکین کے ساتھ ذمہ دار ٹھہرایا کہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر تمام مہمانوں کو عرفات پہنچاؤ۔ ورنہ .... ورنہ وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ہمارا تجربہ تھا کہ سعودی پولیس کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں۔ ہم نے اللہ کا نام لے کر ذمہ داری اٹھالی حالانکہ بے چارے مسکین سے تو ابھی تعارف تک نہ ہوا تھا۔ اسے ہم نے مار پیٹ سے بچاتے ہوئے بمشکل لوگوں کے نرغے سے نکالا تھا کہ شرطہ پہنچ گیا۔ شرطے کے جانے کے بعد وہ ہمارے پاس آیا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "" آپ کو نہیں معلوم آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے' یہ اگر مجھے لے جا کر جیل میں ڈال دیتا تو میری نسلوں کو بھی پتہ نہ چلتا کہ میں کہاں گیا"۔

اس نے بتایا کہ ہر سال حج کے لئے اس کے انتظامات مثالی ہوتے تھے لیکن اس مرتبہ اس کے خلاف گہری سازش ہوئی ہے کہ ٹرانسپورٹ والے اس سے معاہدہ کر کے غائب ہو گئے۔ وہ دو دن انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے کوئی فراڈ نہیں کیا تھا۔ منیٰ میں لگا ہوا کیمپ' کھانا پکانے کے انتظامات آخر اس نے زائرین ہی کے لئے کئے تھے۔ ہم نے اسے یاد دلایا کہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے کچھ دیر بعد شرطے نے پھر نازل ہو جانا تھا اور اس کے آنے سے پہلے پہلے زائرین کو لے کر ہمیں رفو چکر ہو جانا چاہیے۔ اس نے درخواست کی کہ کرایے پر بسیں لینے میں اس کی مدد کی جائے۔ شاید بات پھیل گئی تھی۔ ڈرائیوروں کو اس کی مجبوری کا علم ہوا تو انہوں نے عرفات جانے کے دام بڑھا دیے۔ مرتا کیا نہ کرتا' معلم اضافی داموں پر ہی کرایہ چکانے پر رضامند ہو گیا۔ اس سلسلے میں میجر خالد نکا نے بھرپور کردار ادا کیا۔ جو تھوڑی بہت عربی انہوں نے سیکھ لی تھی' اسے اس روانی سے لوگوں پر آزماتے تھے کہ کسی کو شک نہ

پڑتا تھا کہ ان کا ذخیرہ الفاظ بس انہی چند لفظوں پر مشتمل ہے۔ تھوڑی سی دیر میں انہوں نے کئی بسیں جھانکیں' کتنوں سے مذاکرات کئے اور دو بسیں کیمپ کے سامنے لا کھڑی کیں۔ زائرین ان میں سما گئے۔ خود مسکین ایک بس کے پائیدان پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ہم اس کے پیچھے والی بس میں تھے۔

عرفات پہنچ کر بھی ہمارے ساتھ وہی کچھ ہوا جو منیٰ میں ہو چکا تھا۔ یعنی کیمپ موجود تھا لیکن اس کا سراغ نہ ملتا تھا۔ کیمپ کا انچارج معلم ہمارے ساتھ تھا لیکن راستہ بھلا بیٹھا تھا۔ زائرین اس کی جان کو آئے ہوئے تھے۔ بوکھلایا بوکھلایا مسکین پہلے تو بسیں ادھر ادھر دوڑاتا رہا' پھر اس نے بسیں ایک جگہ کھڑی کروائیں اور پیدل اپنے کیمپ کی تلاش میں نکلا۔ زائرین کا ایک گروپ اس کے ساتھ ہو لیا کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔

سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ تپش میں شدت آتی جا رہی تھی۔ ہم میں سے کچھ لوگ اپنی بسوں کے سایے میں چادریں بچھائے بیٹھے تھے۔ لیکن یہ سایہ تیزی سے سمٹ رہا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہم نے پھر بے امان رہ جانا تھا۔ ہمارا دل عرفات کی رونقوں میں اٹکا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جبل رحمت کی طرف رواں دواں تھے۔ قافلے تھے کہ آئے چلے جا رہے تھے' ذکر کرتے ہوئے' اپنے رب کو پکارتے ہوئے۔ ہم کچھ بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ اطمینان تو تھا کہ حج نام ہے وقوف عرفات کا۔ جو شخص نو ذوالحج کو زوال کے بعد سے دسویں کی صبح صادق تک میدان عرفات کی متعین حدود میں داخل ہو گیا' اس کا حج ہو گیا' بھلے سے اس کا قیام ایک لمحے ہی کا کیوں نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہم مقام وقوف میں داخل تو ہو چکے تھے لیکن یہ مقام شوق بھی تو تھا' مقام عبادت' مقام دعا' مقام قرب' مقام مقبولیت' میرا خیال ہے اللہ میاں جان بوجھ کر اپنے بہت سے بندوں کو کسی نہ کسی چکر میں الجھا دیتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے۔ تھوڑی دیر کے لئے ادھر ادھر جاتے' اللہ کے لگائے ہوئے میلے کی رونقیں دیکھتے اور پھر لوٹ آتے۔ ایک بار جو واپس آئے تو دیکھا کہ ایک بس جا چکی ہے۔ پتہ چلا کہ مسکین میاں کو اپنے کیمپ کا سراغ مل گیا ہے اور وہ اس بس کو وہیں لے گئے ہیں۔ دوسری بس کی سواریاں اکٹھی کر کے ساتھ ہی کیوں نہ لے گیا۔ کچھ پتہ نہ چل سکا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد ہماری بس کے ڈرائیور نے بھی شور مچانا شروع کر دیا

کہ اسے فارغ کیا جائے۔ کرایہ وہ معلم سے وصول کر چکا تھا۔ ہمارے صرف بیگ ہی پڑے تھے بس میں' ہم خود تو سڑکوں پر ہی پڑے تھے۔ بیگ نکال لئے گئے۔ بس چلی گئی۔ جب تک آدھا دن گذر چکا تھا۔ سورج عین سر پر بلکہ یوں کہئے' سوا نیزے پر تھا۔

کچھ پریشانی' کچھ تجسس' ہم ادھر ادھر پھر رہے تھے کہ ایک سڑک کے کنارے ایک شامیانہ نظر پڑا۔ سورج سے پناہ کے لئے سایہ بھی تھا' دریاں بھی بچھی ہوئی تھیں لیکن خالی پڑا تھا۔ لاکھوں افراد کے ہجوم میں ایک خالی شامیانہ------- پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی کہ کس کا ہے' کہاں ہے اس کا معلم کہ کرایے پر لے لیں۔ کچھ پتہ نہ چل سکا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ شاید کسی شہزادے نے یہ شامیانے لگوائے تھے اپنے مہمانوں کے لئے پتہ نہیں کیوں نہیں آئے۔ "تو ہم آئے جاتے ہیں۔ ہم بھی تو آخر کسی کے مہمان ہی ہیں"۔ واپس آئے' اپنے قافلے کو سمیٹا اور اس خوبصورت شامیانے تلے ڈیرے ڈال دیے جس کے مالک کا کچھ پتہ نہ تھا۔ جانے ہمارے ساتھ ہو تا کیا رہا' وہ معلم جسے ہم نے یہ ساری سہولتیں مہیا کرنے کے لئے اچھی بھلی رقم دی تھی' اور جس سے امیدیں لگائے بیٹھے تھے کہ قدم قدم پر ساتھ دے گا۔ ہم سے بچھڑا رہا۔ ملا بھی تو کچھ مدد نہ کر سکا۔ پھر بچھڑ گیا۔ جب سارے آسرے ٹوٹ جاتے تو اللہ ایک سائبان مہیا کر دیتا۔ اقبال نے سچ ہی تو کہا تھا"

بتوں سے تجھ کو امیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

ہمیں خدا سے نو امیدی تو بالکل نہیں تھی خواہ مخواہ ہم سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا ہاں معلم سے کچھ امیدیں ضرور تھیں اللہ میاں کو شاید یہ بھی پسند نہیں آئیں۔ وہ ہمیں پورے کا پورا بس اپنی طرف متوجہ دیکھنا چاہتا تھا۔

جب ہم اللہ میاں کے دیے گئے سائبان کے نیچے براجمان ہو گئے تو باقی ضرورتیں بھی خود بخود پوری ہو گئیں۔ مسز خالد نکا جانے کہاں سے پلاؤ کی بھری ہوئی ایک پرات لے آئیں اور بولیں' لو کھاؤ۔ اختر کو شاید بھوک زیادہ لگی تھی۔ بولا "بہن' یہ چاول ہیں تو مزیدار لیکن پورے نہیں پڑیں گے"۔

"بھائی! آپ کھائیں تو سہی اور لے آؤں گی"۔

اور وہ واقعی ایک پرات اور لے آئیں۔ جانے کہاں سے۔ اس وقت تو تھکن اور بھوک کا عالم ہی کچھ ایسا تھا کہ آم گننے بلکہ یوں کہئے کہ چاول گننے کی کسی کو فرصت ہی نہ تھی لیکن بعد میں بھی کسی نے پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ آج یہ سطریں لکھتے ہوئے یہ بات یاد آئی ہے۔ خیر جی لائیں ہوں گی کہیں سے۔ آخر ہم اللہ کے مہمان تھے۔ اس نے ہمیں بھوکا تھوڑا ہی رکھنا تھا۔ اور اگر بھوکے بھی رہ جاتے تو کون سی قیامت آجاتی لیکن وہ تو ہمیں آزما آزما کے دے رہا تھا۔

کھانا کھا کر ہم سے رہا نہیں گیا۔ گرچہ مرغن پلاؤ کھا کر آنکھیں مندنے کو تھیں لیکن شوق دامن کھینچ رہا تھا۔ یہ دن تو زندگی میں کبھی کبھار ہی آتا ہے کون جانے آخری بار ہی آیا ہو' پھر آئے نہ آئے' اپنے رب سے باتیں بھی کرنا تھیں اور میلہ بھی دیکھنا تھا۔ رب کا میلہ۔

شامیانے کی جگہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر کے ہم میلے کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔ اکیلے' تنہا۔

عرفات کا میدان خوب بھرا ہوا تھا۔ جس طرف نگاہ اٹھتی تھی' سفید سفید احرام میں ملبوس انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے۔ بوڑھے' بچے' جوان' نوجوان لڑکیاں' خواتین' ہر ملک کے لوگ' ہر قوم کے افراد۔ مصری' ترکی' اور ایرانی بڑے بڑے قافلوں کی صورت میں آتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ منظم ہوتے ہیں مصریوں کا ایک کیمپ دیکھا۔ کافی بڑا کیمپ تھا۔ ڈھائی تین ہزار کا مجمع تو ہو گا۔ سٹیج پر ایک نوجوان قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھائے بڑے خشوع و خضوع سے دعائیں کر رہا تھا اور پورا مجمع اس کے ساتھ ساتھ دعائیں دہرا رہا تھا۔ گونج تھی' جیسے عرش ہل رہا ہو "ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین○"

(اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں کے لیے بڑا ظلم کمایا ہے۔ اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا' ہم پر رحم نہ کیا تو ہم تو بڑے سخت گھاٹے میں رہیں گے)

ہم ان کے دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا لئے' "اللہ! جو کچھ یہ مانگ رہے ہیں' مجھے بھی ان میں شریک رکھ۔ جو کچھ انہیں عطا ہوتا ہے' مجھے بھی عطا ہو۔ مجھے تو مانگنا بھی نہیں آتا۔ دعاؤں کے آداب تک سے واقف نہیں۔ تو رحیم ہے' تو عظیم ہے۔ ان کی دعاؤں میں' میری شمولیت ہی کو قبولیت عطا ہو"۔

کافی دیر ہم ان کے ساتھ رہے۔ پھر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نکل آئے۔ منیٰ سے چلے

ہوئے پیدل قافلے ابھی تک پہنچ رہے تھے۔ اچانک بنگلہ دیش کے ایک قافلے نے ہمارے قدم تھام لئے۔ چالیس پچاس افراد پر مشتمل گروپ ہو گا۔ وہ دعائیں پڑھتے چلے آ رہے تھے' اپنے رب کو پکارتے ---- ایک لیڈر تھا جو دعائیں پڑھ رہا تھا باقی سب مرد اور خواتین اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے' سر جھکائے دعائیں پڑھتے جا رہے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں وہ جانے کب سے چل رہے تھے۔ ان کے احرام پسینے سے شرابور تھے' چہرے بھی عرق آلود تھے لیکن گرمی سے بے نیاز' سر جھکائے چلے جا رہے تھے' پڑھے جا رہے تھے۔ "کاش یہ قافلہ پاکستان کا قافلہ ہوتا"۔ ہم ان کے ساتھ ہو لئے اور اس بنگلہ دیشی کو اپنا رہنما مان لیا جو دعائیں پڑھوا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ شاید اس جگہ پہنچے جہاں ان کا کیمپ ہونا چاہیے تھا۔ لیڈر کھڑا ہو گیا۔ دعائیں پڑھتے پڑھتے اس نے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو اپنے اردگرد دائرے کی شکل میں کھڑا کر لیا۔ کچھ دیر بعد وہ رکا اور بنگالی میں اس نے کچھ کہا۔ دو تین افراد دائرے سے نکل کر باہر چلے گئے۔ شاید لیڈر نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ جائیں اور کیمپ کا پتہ کریں۔ اس کام کے لئے شاید ایک منٹ کا وقفہ آیا ہو گا۔ لیڈر نے پھر دعائیں پڑھنا شروع کر دیں۔ وہ ایک ایک لمحہ استعمال کر رہے تھے۔ انہیں دھوپ کی پروا تھی نا بھوک کی۔ رویے سے لگ رہا تھا کہ کیمپ مل گیا تو خیر ورنہ یونہی کھڑے' دعائیں پڑھتے پڑھتے اپنے رب سے ہمکلام' دوپہر سے شام کر دیں گے ---- ہم نے دعا کی' اللہ ان کے انہماک' للہیت اور خشوع و خضوع کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا ہو۔"

اور یوں ہم نے ایک سٹال سے دوسرے سٹال' ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تانک جھانک' ونڈو شاپنگ کرتے دوپہر سے شام کر دی۔ باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے کیمپ واپس آئے۔ لوٹا اٹھایا اور کسی مناسب سی جگہ کی تلاش میں نکلے لیکن وہاں ویرانہ کہاں تھا' ہر طرف انسان ہی انسان تھے۔ پریشانی کے عالم میں جا رہے تھے۔ کہ ایک کیمپ کے قریب افریقہ کی ایک سیاہ فام' باوقار خاتون نے ہاتھ کے اشارے سے خیمے کی ایک جانب اشارہ کیا۔ ہم روبوٹ کی طرح اس جانب گئے۔ صاف ستھری لیٹرین بنی ہوئی تھی۔ واپسی پر ہم نے اس خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بس مسکرا دی۔

ایک سرکاری نلکے پر گئے۔ لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہم منتظر رہے۔ بھیڑ چھٹی تو ہم وضو کرنے

بیٹھ گئے۔ ابھی ہاتھ بڑھایا ہی چاہتے تھے کہ ایک ہیولا سا ہم پر جھکا۔ نظریں اٹھائیں تو دیکھا ایک سعودی دوشیزہ ہے۔ سر تا پا سیاہ لبادے میں ملبوس۔ بس اس کا سفید سفید ہاتھ باہر تھا۔ بلکہ سفید کہاں' مہندی سے بھرا ہوا تھا۔ کلائی پر سنہری چوڑیاں بھی نظر آئیں۔ ہم نے نظریں جھکا لیں اور وضو کرنے لگے۔ وہ جھکی کھڑی تھی منتظر کہ کب ٹونٹی خالی ہو وہ اپنا تھرموس بھر لے۔ اس کا مہندی بھرا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ ہم وقوف عرفات کے موقع پر اللہ میاں سے مذاکرات کے آخری راؤنڈ کی تیاری کے لئے وضو کرنے آئے تھے اور عین وضو کے درمیان ہی توجہ بٹ رہی تھی۔ بڑا جی چاہا کہ اس کے سراپے پر ایک نظر ڈال لیں لیکن وہ جو اللہ میاں سے سودا کیا تھا' جسے بچا بچا کر رکھ رہے تھے' اس کے منسوخ ہونے کا خطرہ تھا۔ ضبط کر گئے۔

جلووں کے اس ہجوم میں لازم ہے احتیاط
سہو نظر معاف ہے' قصد نظر حرام

سر جھکائے جھکائے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا' اس نے تھرموس ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم نے اسے پانی سے بھرا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے تھرموس لیا اور چلی گئی۔ ہم نے پھر سے شروع کر کے اطمینان سے وضو کیا' پوری حضوری کے ساتھ۔ پھر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے جہاں سے پورا میدان عرفات نظر آ رہا تھا۔ دور جبل رحمت پر ابھی تک لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سڑکوں پر چہل پہل بدستور قائم تھی۔ خیموں کا شہر پوری طرح آباد تھا۔ ہم جس پہاڑی پر چڑھے تھے' اس پر بھی لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ ہم نے قدرے تنہائی والا ایک کونہ ڈھونڈا' قبلہ رخ ہوئے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیے۔ عرفات کا بھرا پرا شہر اپنی تمام رعنائیوں سمیت نظروں سے معدوم ہو گیا۔ لاکھوں کے مجمع میں ہمیں پوری تنہائی میسر تھی۔ پشیمانیاں' پچھتاوے' حسرتیں آنسوؤں کے ساتھ بہہ رہی تھیں۔ دوست' احباب' اپنے پرائے' ملک و ملت' جو جو یاد آتے گئے ہم ان کے لئے دعا کرتے گئے۔ جب سورج ایک تھال کی صورت افق سے جا لگا تو ہم درود پڑھتے ہوئے نیچے اتر آئے اور اپنے قافلے سے آ ملے۔

سامان سمیٹا جا رہا تھا۔ سعید اور کلیم پھر کسی ویگن کی تلاش میں گئے ہوئے تھے۔ لوگ اپنا اپنا سامان گاڑیوں میں لاد' چلنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی قطاریں پہلے سے لگ چکی تھیں۔ سورج غروب ہوا۔ ایک توپ داغی گئی' میدان عرفات کی حدود پر متعین

رکاوٹیں ہٹادی گئیں اور ٹریفک نے رینگنا شروع کر دیا۔

یہ واحد موقع ہے جب نماز کا وقت ہو جانے کے باوجود حکم ہے کہ نماز یہاں نہیں پڑھنی۔ اور نماز کا نہ پڑھنا ہی اطاعت ہے۔ حکم ہے کہ یہ نماز مزدلفہ جا کر عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھنی ہے۔ سعید ویگن لے آیا تھا۔ ہم نے چھت پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ رات گئے مزدلفہ پہنچے۔ ویگن والے سے درخواست کی کہ وہ صبح آ کر ہمیں لے جائے۔ اذان دے کر مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھیں۔ رمی کے لئے کنکریاں اکٹھی کیں اور کمر سیدھی کرنے کو لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک بڑا سا ٹریلر ہمارے قریب آ کر رکا۔ کوئی ترک فیملی تھی۔ انہوں نے جانے کیا اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی۔ ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ کچھ دیر بعد ٹریلر سے پانی گرنا شروع ہو گیا جو سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہم اپنا مختصر سا بستر سمیٹ کر ان سے بات کرنے گئے۔ پتہ چلا کوئی خاتون اندر بیٹھی برتن دھو رہی تھیں۔ ٹرک کے پچھلے حصے کے قریب ایک اور خاتون کھڑی تھی جسے ہم نے سمجھانے کی کوشش کی کہ ان کی وجہ سے کتنے لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں پانی تو بند ہو گیا لیکن جگہ گیلی ہو چکی تھی۔ قدم قدم پر لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے ایک اور جگہ ملی۔

فجر کی نماز پڑھ کر منیٰ روانگی تھی۔ کچھ دیر تو کسی گاڑی کے انتظار میں رہے لیکن پھر یہ فیصلہ ہوا کہ چونکہ آج کے دن کی مصروفیات زیادہ ہیں اس لئے جو جانا چاہیں چلے جائیں۔ اہل خانہ والے حضرات آرام سے آتے رہیں گے۔ کیپٹن بشیر اور اختر کے ساتھ ہم منیٰ روانہ ہوئے۔ کیپٹن بشیر ماشاء اللہ طویل قامت ہیں۔ لمبے تڑنگے۔ ان کے قد کا ہمیں فائدہ ہوا۔ پیچھے رہ جاتے یا بھیڑ میں گم ہو جاتے تو وہ مینار کی طرح دور سے نظر آ جاتے۔ ہم پھر ان سے آ ملتے۔ صبح کی خنکی ابھی باقی تھی جب ہم زائرین کے ریلے میں بہتے بہتے منیٰ آ پہنچے اور اپنا کیمپ ڈھونڈنے میں بھی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ سیدھے کیمپ آئے۔ اور تو اور، معلم مسکین بھی اپنی تمام تر مسکینی کے ساتھ موجود تھا اور بنفس نفیس زائرین کی خدمت کر رہا تھا۔ پورے کیمپ کا نقشہ بدلہ ہوا تھا۔ سب کے ناموں کی چٹیں لگی ہوئی تھیں۔ ہمارا نام بھی شامل تھا۔ معلوم ہوا کہ گذشتہ سے پیوستہ روز کچھ اور لوگوں نے کیمپ خالی دیکھا تو چٹیں پھاڑیں اور قابض ہو گئے جنہیں منیٰ کے رستے معلوم تھے۔ انہیں کوئی دقت پیش نہ آئی تھی۔ لاہور سے

ہمارے پرانے آشنا ظہیر الاسلام اپنے بال بچوں سمیت پہلے دن بڑے آرام سے کیمپ میں مقیم رہے۔ نو ذوالحج کو بھی انہوں نے معلم کا انتظار نہ کیا۔ بال بچوں کا ہاتھ پکڑا اور عرفات میں سیدھے کیمپ میں جا اترے۔ وہ حیران تھے کہ کیمپ خالی پڑا رہتا ہے، اتنے بہت سے لوگ کہاں غائب رہتے ہیں۔ وہ برسوں سے جدہ میں مقیم ہیں اور منیٰ اور عرفات کے تمام رستے ان کے دیکھے بھالے ہیں۔

تو مسکین صاحب زائرین کی خدمت کر رہے تھے۔ اختر نے مسکین کو دیکھا تو مرنے مارنے پر تل گیا۔ بڑی مشکل سے اسے روکا، سمجھایا۔ اختر ضبط تو کر گیا لیکن ضبط کرتے کرتے بھی دانت کچکچا کر کہہ گیا

"او ظالم مسکین! تو نے عید والے دن بھی ہمیں روزہ رکھا دیا ہے"۔

"بسم اللہ! بسم اللہ۔ افطار کریں"۔ مسکین نے نہایت نرمی سے جواب دیا اور قریب پڑی ہوئی ایک ٹرے اٹھا کر ان کے سامنے لا رکھی۔ پتہ چلا کہ اس نے نہایت شاندار ناشتے کا اہتمام کر رکھا ہے۔ حلوہ پوڑی، سری پائے، نان، ٹھنڈا یخ پانی، مزیدار گرم گرم چائے ----- عید کا دن تھا نا! خوشی کا دن ----- اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنکھ مچولی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ آج نعمتوں کے نزول کا دن تھا۔

بھرپور ناشتے اور ذائقے دار چائے نے مزدلفہ سے آنے کی تھکن اتار دی۔ اب رمی اور قربانی کے لئے جانا تھا۔ اسی سال ایک بڑی سی کمپنی کی طرف سے یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ اس نے حج سے بہت پہلے یہ مہم شروع کی تھی کہ تین سو ریال جمع کروا دیں۔ وہ ایک رسید جاری کریں گے۔ قربانی والے دن آپ قربان گاہ میں پہنچیں۔ رسید دکھائیں، کمپنی کے کارندے آپ کو ایک جانور فراہم کر دیں گے۔ آپ اسے ذبح کر ڈالیں۔ اس طرح آپ بکروالوں سے مول تول کی زحمت سے بچ جاتے ہیں۔ ہم نے بھی اس کمپنی کی پیش کش سے فائدہ اٹھایا تھا۔ رمی سے واپس آئے تو رسیدیں سنبھالیں اور قربان گاہ کو روانہ ہوئے، کیپٹن اختر اور کیپٹن بشیر کی معیت میں--- قربان گاہ ہمارے کیمپ سے کافی دور اور اچھی خاصی چڑھائی پر تھی۔ پہنچتے پہنچتے سانس پھول گیا۔ قربان گاہ میں پہنچے تو عجب افراتفری کا عالم پایا۔ کمپنی نے انتظام تو ٹھیک کر رکھا تھا۔ ہزاروں جانور باڑوں میں بند تھے۔ کمپنی کے کارندے رسیدیں وصول کر کر کے لوگوں کو

باڑے میں جانے کی اجازت دیتے کہ وہ جانور نکال لائیں۔ اور قربان گاہ میں جا کر ذبح کر دیں لیکن لوگوں کو اتنی فرصت تھی نا ان میں اتنی ہمت کہ جانوروں کو قربان گاہ لے جاتے۔ انہوں نے باڑوں کے صحن ہی میں جانوروں کو ذبح کر ڈالا اور چلتے بنے جب ہم وہاں پہنچے تو لوگ چھریاں لہراتے باڑوں کی دیواروں سے اندر کود رہے تھے اور عین باڑوں ہی میں جانوروں کو ذبح کئے جا رہے تھے۔ زیادہ تر دنبے اور بھیڑیں تھیں۔ جانور صحت مند تھے لیکن لوگوں کے سیلاب بلاخیز کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے اور مسلسل ممیا رہے تھے۔ اختر نے اس بد انتظامی پر پھر اپنے خیالات عالیہ کا اظہار پوری فصاحت و بلاغت سے کرنا چاہا لیکن ہم نے روک دیا۔

کیپٹن بشیر بھی فکر مند تھے کہ آخر اس افراتفری میں قربانی کیسے ہو گی۔ ہم نے اپنی خدمات پیش کیں۔ قریب ہی سے ایک چھری خریدی۔ اختر اور بشیر کی رسیدیں لیں، کمپنی کے کارندے کو رسیدیں دے کر ٹوکن حاصل کئے اور چھری منہ میں دبائے، ایک باڑے کی دیوار پر چڑھ گئے کہ عام دروازوں پر لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ اندر کودے تو ایک ذبح شدہ بھیڑ پر اترے۔ پورا فرش خون سے لت پت ہو رہا تھا۔ ذبح شدہ جانور ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے اور انہی کے درمیان زندہ جانور ہانپتے ہوئے جان بچانے کو ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

زائرین پیچھے پیچھے، جانور آگے آگے۔ ہم نے ایک دنبہ پکڑا۔ ابھی اس کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ ثابت سالم ہے، کان کٹے ہوئے تو نہیں، کہیں سے زخمی تو نہیں کہ وہ بے چارہ خود ہی لیٹ گیا جیسے کہہ رہا ہو کہ لو پھیرو چھری، مجھے اس عذاب سے نجات دلواؤ۔ بڑا ترس آیا تکبیر پڑھتے ہوئے اسے ذبح کر دیا۔ پھر کیپٹن اختر اور کیپٹن بشیر کی طرف سے دو جانور قربان کئے۔

جب تک ہمارا احرام خون آلود ہو چکا تھا۔ فارغ ہو کر باہر جانے لگے تو ایک صاحب نے درخواست کی کہ اس کا جانور ذبح کر دوں۔ اسے ذبح کیا تو ایک اور صاحب آ گئے۔ پھر ایک اور، ایک اور ---- ہمارے خون آلود احرام کو دیکھ کر شاید وہ ہمیں قصائی ہی سمجھ بیٹھے تھے کہ ہر کوئی اپنا جانور ذبح کروانے کے بعد ریال ہماری طرف بڑھاتا لیکن ہم دل ہی دل میں ان اجری الا علی اللہ (بے شک میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمے ہے) پڑھتے ہوئے انکار کر دیتے۔ جب چھری کند اور ہمارے اعصاب شل ہو گئے تو ہم نے چھری ایک اور صاحب کو تھمائی۔ اسے ہدایت کی کہ اسے تیز کر کے استعمال کرے اور خود باہر آ گئے۔ بشیر اور اختر منتظر کھڑے تھے۔

واپس روانہ ہوئے۔ پیاس سے حلق سوکھ رہا تھا۔ پانی کی بوتل کے دام بھی بڑھے ہوئے تھے۔ ایک جگہ سے شائد دس ریال کی ایک بوتل لی اور پیاس بجھائی۔ قریب ہی پاکستانیوں کی ایک اور ٹولی کھڑی تھی۔ ایک نوجوان بڑے فخر سے اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا۔

"آج میں نے بڑا ثواب کمایا۔ پیسے تو میں نے ایک جانور کے جمع کروائے تھے لیکن باڑے میں کوئی پوچھنے والا ہی نہیں تھا۔ میں نے دس بارہ بھیڈو ذبح کر دیے۔ ابا کے نام کا، اماں کے نام کا............ ثواب ہی ثواب، نیکیاں ہی نیکیاں"

اس کے ساتھی بڑی عقیدت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

قربانی کے بعد واپس آئے۔ بال کٹوائے اور ایک ٹیوب ویل پر جا کر خوب نہائے۔ کیمپ واپس آئے کپڑے بدل کر جو نظر اٹھائی تو پورے منیٰ میں بہار آئی ہوئی تھی۔ کل تک ہر طرف سفید ہی سفید رنگ تھا۔ آج جیسے اللہ میاں نے رنگ بھری پچکاری چلا دی ہو۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ بکھر رہے تھے۔ سفیدی معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ رنگ بڑھتے جا رہے تھے۔ ہر قوم کا اپنا اپنا پہناوا ہے اپنا اپنا لباس اور یہاں ہر قوم کی نمائندگی تھی۔ کل تک سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، آج انہیں شناخت عطا کر دی گئی تھی۔ یہ سبق پڑھا کر کہ تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں محض اس لئے بانٹا گیا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

افریقہ کے لوگ جتنے سیاہ ہوتے ہیں اتنے ہی بھڑکیلے، شوخ، تیز رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ پورے ماحول کو رنگ دیتے ہیں۔ رنگوں کے یہ دھارے آج ہر طرف بہہ رہے تھے۔ منیٰ سے مکہ تک۔ طواف زیارت بھی آج ہی کرنا تھا۔ رمی کر کے لوگ مکہ کی طرف جا رہے تھے۔ بیت اللہ کا طواف کرنے۔ اختر کے ساتھ ہم ایک ویگن میں مکہ پہنچے تو دیکھا منیٰ کی رونق خانہ کعبہ میں سمٹ آئی تھی۔ پہلے طواف کے وقت بیت اللہ کا غالب منظر بلیک اینڈ وہائٹ تھا۔ بیچ میں سیاہ غلاف میں ملبوس خانہ کعبہ اور اردگرد سپیدیوں کے دھارے، نور کی گردش، آج سارا منظر ٹیکنی کلر ہو گیا تھا۔ جیسے شادی کے موقع پر دلہن کے اردگرد زرق برق کپڑوں میں ملبوس سہیلیوں کا جھرمٹ۔ نچلے والے فرش پر تو قدم رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پہلی منزل پر جا پہنچے۔ طواف کا پہلا چکر ہی اتنا طویل لگا جیسے میلوں کی مسافت طے کی ہو۔ ہم نے ہنستے ہوئے، اختر کو خبردار کیا کہ چکروں کا حساب رکھنا اگر بھول گئے تو حکم یہ ہے کہ پھر سے شروع کرو۔ اختر

چلتے چلتے کھڑا ہو گیا" "کیا؟"۔

"جی ہاں، حکم یہی ہے کہ بھول جاؤ تو نئے سرے سے شروع کرو"۔

بندہ خانہ کعبہ کے بالکل قریب طواف کر رہا ہو تو بھول بھی جائے تو خیر نئے سرے سے طواف شروع کر سکتا ہے لیکن ایک تو یوم عید جو حاجیوں پر ویسے ہی بڑا بھاری گذرتا ہے۔ منہ اندھیرے مزدلفہ سے چلنا' منیٰ پہنچ کر رمی کرنا' قربانی دینا' طواف زیارت کے لئے مکہ آنا اور پھر پہلی منزل پر طواف۔ اچھا بھلا نوجوان' صحت مند' توانا آدمی تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ اللہ میاں سپیشل توانائی عطا کرتے ہیں اس دن۔ قوت و ہمت کا خاص کوٹہ۔

رات گئے ہم نے طواف مکمل کیا۔ بیت اللہ سے باہر آئے۔ ایک دکان سے جی بھر کے جوس پیا اور منیٰ جانے کے لئے ایک ویگن میں سوار ہو گئے۔ ہمیں چھت پر جگہ ملی۔ معلم مسکین کا کیمپ ایک خاص پل یعنی کبری کے بالکل قریب تھا۔ ہم نے ڈرائیور کو خاص طور پر تاکید کی کہ وہ ہمیں فلاں کبری کے قریب اتار دے۔ وہ اثبات میں سر ہلاتا رہا اور انشاء اللہ انشاء اللہ فرماتا رہا۔ ویگن جب مکہ کی بھیڑ سے نکل کر فرانٹے بھرنے لگی تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے تھپکیاں دینی شروع کر دیں۔ ہم ویگن کی چھت پر بالکل سکرین کے اوپر بیٹھے تھے' آلتی پالتی مارے اور یہ نشست خاص طور اس لئے حاصل کی تھی کہ راستہ نظر میں رہے اور ہم ٹھیک اپنے سٹاپ پر اتر جائیں۔ پہلے تو چوکنے بیٹھے رہے لیکن جب ویگن منیٰ میں داخل ہوئی تو سارے دن کی تھکن کام دکھا رہی تھی۔ ہم کوشش کر کر کے آنکھیں کھلی رکھتے رہے لیکن وہ زبردستی بند ہوئی جاتی تھیں۔ منیٰ کی روشنیاں بھی یاد ہیں کہ آئی تھیں لیکن پھر جانے ہم کب سو گئے۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ڈرائیور منیٰ کی ساری سواریاں اتار کر "مکہ' مکہ' بیت اللہ" کی آوازیں لگا رہا تھا۔ اختر کو اٹھایا اور اسے بتایا کہ وہ کچھ ہو گیا ہے جس کا ڈر تھا۔ اس کا پارا چڑھنے میں کیا دیر لگتی تھی۔ اس نے ڈرائیور کو بے نقط سنائیں انگریزی میں۔ ظاہر ہے وہ اس کے اوپر سے گذر گئیں۔ ہمیں کیمپ جانے کے لئے کافی چلنا پڑتا۔ پہلے تو یہی سوچا کہ بیٹھے رہتے ہیں۔ مکہ چلتے ہیں اور پھر گھوم کر کبری پر آ اتریں گے لیکن پھر ویگن سے اتر گئے اور پیدل چلتے ہوئے کیمپ پہنچے---------- کسی نے اختر کی فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو اس سے منیٰ کی کبریوں کا حال پوچھ لے وہ سعودیوں کے پورے حسب نسب کے ساتھ' معلم

مسکین کے خاص حوالے سے' اس کبری کا حال سنائے گا جس پر کھڑے ہو کر پہلے دن ہم معلم مسکین کا کیمپ دیکھتے رہے تھے لیکن وہاں پہنچنے میں ہمیں زمانے لگ گئے تھے۔ وہ حج کے دنوں میں تو ذرا ضبط کر کے لیکن حج کے بعد ذرا کھل کے' اکثر ہم سے پوچھتا'

"یار یہ کبری بنائے کس.................نے تھے؟"

"آخر ان کا فائدہ کیا ہے۔ سوائے لوگوں کو چکر دینے کے؟" پل تو ظاہر ہے ٹریفک کے نظام کو بہتر کرنے کے لئے بنائے گئے تھے۔ ان پلوں کا فائدہ یہ تھا کہ دائیں بائیں مڑنے یا کسی چوک کو کراس کرنے کے لئے گاڑیاں رکتی نہیں تھیں۔ ٹریفک ہر دم رواں دواں رہتی تھی لیکن نقصان یہ تھا کہ ایک غلط ٹرن سے گاڑی کو میلوں کا چکر کاٹنا پڑتا تھا' تب وہ دوبارہ اس پل پر آسکتی تھی اور مطلوبہ سڑک پر جا سکتی تھی۔ تو غلطی کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے' کبھی جلدی' کبھی دیر سے۔

دس ذوالحج کے بعد حاجیوں کو کم از کم دو روز اور منیٰ میں رکنا ہوتا ہے۔ کوئی چاہے تو تیسرے روز بھی رک سکتا ہے۔ حکم یہ ہے کہ ان دنوں میں اپنے رب کو خوب یاد کرو۔ اسلام سے پہلے یہاں مختلف قبیلوں کی منڈلیاں جمتی تھیں جس میں اپنے اپنے قبیلے کے آباء و اجداد کے کارناموں کو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا' ان کی شان میں قصیدے کہے جاتے' زور دار تقریریں ہوتیں اور سارا زور بیان اسی میں صرف ہو جاتا کہ انہی کا قبیلہ سب سے برتر' شجیع' افضل ترین تھا۔ اب رب کے ذکر کی محفلیں جمتی ہیں' اس کی تسبیح بیان ہوتی ہے' اسی کی بڑائی اور عظمت کے گن گائے جاتے ہیں یا اس کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ کی محفلیں برپا ہوتی ہیں۔ نفل گذارے جاتے ہیں' راتوں کو اٹھ اٹھ کر' پچھلے پہر۔ جو لوگ کچھ نہ کر سکیں' کچھ نہ پڑھ سکیں' بس نیت رکھیں' خلوص کے ساتھ' خالی ہاتھ وہ بھی نہیں لوٹائے جاتے۔

لیفٹننٹ کرنل منصور رشید نے یہ واقعہ سنایا۔ ان کے کیمپ میں لوگ حسب توفیق عبادت میں مصروف تھے۔ کوئی نماز پڑھ رہا تھا' کوئی قرآن۔ کوئی تسبیح پھیر رہا تھا کوئی مراقبے میں تھا۔ ان کے سامنے والے خیمے میں ایک بڑھیا تھی جو بالکل بے علم دکھائی پڑتی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ایک سمت تکتی' کبھی دوسری سمت' آخر گھبرا کر اس نے اپنے میاں کو جھنجھوڑا

جو بے سدھ ہو کر سویا پڑا تھا۔

"ارے اٹھ، دیکھ وقت نکلا جا رہا ہے"۔

بڑے میاں ہڑبڑا کر اٹھے۔ پوچھا کیا بات ہے۔ بڑھیا پھر بولی،

"دیکھ پوری دنیا عبادت میں مصروف ہے۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ پڑھ رہا ہے۔ ہمیں تو کچھ پڑھنا بھی نہیں آتا۔ ہمارا کیا بنے گا؟"۔

بڑھیا کی آواز میں اتنا درد، اتنا سوز، اتنی فکر تھی کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بوڑھے نے اطمینان سے جواب دیا،

"فکر کیوں کرے ہے، جس نے بلایا ہے، وہی ہمارا بھی مالک ہے۔ خالی ہاتھ تھوڑا ہی بھیج دے گا"۔

اس کا ایمان، اس کا یقین، اطمینان، سننے والوں کو سرشار کر گیا۔

ہم سے کیمپ میں بیٹھا نہ جاتا تھا۔ اللہ میاں کی وہ بستی جو اس نے دو تین دنوں کے لئے بسائی تھی، ہمیں پکارتی تھی اور ساری تھکن کے باوجود ہم اٹھ کھڑے ہوتے۔ رمی کے بعد تو یہ حالت ہوتی تھی جیسے ٹانگوں میں جان ہی نہیں ہے لیکن ہم شوق میں چل نکلتے۔ شروع شروع میں پاؤں دکھتے، ٹانگیں درد کرتیں لیکن پھر ایک مرحلہ ایسا آجاتا کہ درد، دکھن، تکلیف سب رفع ہو جاتی ہم روبوٹ کی طرح چلتے رہتے، چلتے رہتے ٹانگیں سن ہو جاتیں، احتجاج کے حق سے دستبردار

کسی نے ہمارے ہاتھ میں منیٰ کا نقشہ تھما دیا تھا جس میں تمام سڑکیں، پل اور کیمپ دیے ہوئے تھے۔ یہ نقشہ ہمیں جلد ہی ازبر ہو گیا اور پھر منیٰ کی سڑکیں ہمارے لئے یوں ہو گئیں جیسے اپنے ہاتھ کی لکیریں۔ تب ہم یہ کرتے کہ مختلف شاہراہوں پر مٹرگشت کرتے رہتے اور اللہ کی عبادت میں مصروف لوگوں کا نظارہ کرتے۔ کئی لوگ ملتے جو راستہ بھول کر کہیں کے کہیں آنکلے ہوتے۔ ہم انہیں ان کے کیمپ پہنچا آتے۔ ایک دفعہ ایک ہم وطن نوجوان ملا۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

"یار میں صبح سے چل چل کر سو ریال کا تو پانی ہی پی گیا ہوں لیکن کیمپ ہے کہ ملتا ہی نہیں"۔

ایک دفعہ بنگلہ دیش کے دو بوڑھے ملے۔ انہوں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ وہ صبح رمی کے لئے گئے تھے اور جب سے اپنا کیمپ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں لیکن ملتا نہیں۔ (جب وہ مجھے ملے ہیں تو غالباً عصر کا وقت تھا) میں نے ان سے کیمپ کا نمبر پوچھا تو ان کی اردو ختم ہو گئی۔ ایک بوڑھے نے مایوسی میں اوشوودش کہا۔ اور ہم سمجھ گئے۔ ہم نے انگلیوں پر گن کر ان سے تصدیق چاہی کہ ان کے کیمپ کا نمبر اٹھارہ ہی ہے نا۔ ان کی آنکھوں میں چمک آگئی، امید کی ایک کرن جاگ اٹھی، وہ اپنے کیمپ سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ہم نے انہیں پتہ سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ التجا کرنے لگے کہ ہم انہیں چھوڑ آئیں۔ ہم تو تھے ہی اسی مشن پر۔ انہیں ساتھ لیا اور تھوڑی دیر میں انہیں ان کے کیمپ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ایک بوڑھے نے دائیں بائیں دیکھا اور بولا "اس سڑک پر سے تو ہم کئی دفعہ گذرے ہیں۔ یہ تو نا ہی ہے اوشوودش"۔ ہم نے گیٹ کی پیشانی پر لگا ہوا بینر پڑھا اس پر معلم کا نام اور کیمپ نمبر اٹھارہ ہی لکھا تھا۔ ہم نے بینر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہی ہے اوشوودش۔ دوسرا بوڑھا بڑا ملنسار اور ہنس مکھ تھا۔ وہ راستے میں بھی ہم سے اٹکھیلیاں کرتا آیا تھا۔ اس نے ہم سے کہا "پوری دوپہر سورج اس بڈھے کے سر پر چمکتا رہا ہے۔ لگتا ہے اس کا دماغ چل گیا ہے"۔ اس نے ہاتھ سے دماغ چلنے کا اشارہ بھی کیا۔ ہم نے اجازت چاہی اور پھر بھیڑ میں گم ہو گئے۔ رہی یہ بات کہ ہمیں اوشوودش کا مطلب کیسے پتہ چلا تو بات یہ ہے کہ ہمیں بنگالی زبان میں صرف ایک فقرہ اور گنتی کا ایک لفظ آتا ہے۔ فقرہ ہے، آمی تمار جنو بوت ای چنتی تو (ہم تمہارے بغیر بہت اداس رہے) اور گنتی میں صرف ایک لفظ "اوشوودش"۔ مشرقی پاکستان کی جدائی سے پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں طلبہ کی ایک تنظیم کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں اچھی خاصی تعداد میں بنگالی طلبہ بھی شریک تھے۔ یہ ان کا اٹھارہواں سالانہ اجلاس تھا اور بار بار اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی میں "اوشوودش برشگھ شوے لون" کا اعلان ہوتا تھا۔ برسوں پہلے سیکھا ہوا لفظ شائد آج ہی کے لئے یاد رہ گیا تھا۔

منیٰ میں قیام کے بعد حج مکمل ہو جاتا ہے۔ مقامی لوگ تو اپنے اپنے گھروں کو سدھار جاتے ہیں، باہر سے آنے والے مکہ پہنچ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپسی کی دوڑ دھوپ میں لگ جاتے ہیں یا مدینے چلے جاتے ہیں۔

جانب بطحا

ایک حدیث ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو حج یا عمرے کے لئے آیا لیکن سلام کے لئے مجھ تک نہ آیا تو اس نے مجھ پر ظلم کیا۔ اس حدیث کی موجودگی میں کون مسلمان ہو گا کہ وہ مکہ آئے اور مدینے نہ جائے۔ مدینے میں رش کم رکھنے کے لئے انتظام یہ کیا گیا ہے کہ زائرین جو حج سے بہت پہلے آئیں انہیں سیدھا مدینے بھیج دیا جاتا ہے اور جو لوگ حج سے بالکل دو چار دن پہلے پہنچتے ہیں' انہیں حج کے بعد۔ ایک رواج سا ہو گیا ہے کہ مدینہ جانے والے وہاں کم از کم آٹھ دن ٹھہرتے ہیں اور مسجد نبوی میں چالیس نمازیں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وقت ہو تو انسان وہاں ایک مہینہ ٹھہر رہے' نہ ہو تو کم از کم ایک دن کے لئے جائے۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دے' سلام کرے اور لوٹ آئے۔

تو ہوا یوں کہ حج کی تکمیل کے بعد ہم جدہ آئے۔ باوجود کوشش کے کوئی ایسا ٹھکانہ نہ ملا جہاں ایک رات رہ کر نیند پوری کر لیتے یا تھکن اتار لیتے۔ اکیلے ہوتے تو نکل جاتے لیکن باقی لوگ بھی ساتھ تھے۔ یہی صلاح ٹھہری کہ واپس چلتے ہیں اور کچھ دن ٹھہر کر مدینے چلیں گے۔ آنے کو تو آگئے لیکن دل مدینے میں اٹکا رہا۔ ہر وقت ایک ہی ادھیڑ بن' کیسے نکلیں' کیسے جائیں۔ حدیث یاد آتی تو دل اور ہولتا"۔ کیا ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم کیا؟"۔

مولانا جامیؒ کا یہ شعر کتنا حسب حال تھا۔

نسیما جانب بطحا گذر کن۔
زاحوالم محمد را خبر کن

بالآخر چند دنوں بعد ہی ایک موقعہ مل گیا۔ کیپٹن محمد یونس پہلے پہل گاڑیاں خریدنے والے

افسروں میں سے تھے۔ پہل کا مادہ (Initiative) ان میں بہت تھا۔ ابھی لوگ خمیس مشیط کی سڑکوں بلکہ یونٹ کے جغرافیائی محل وقوع سے واقف نہیں ہوئے تھے اور وہ شاپنگ کے لئے جدہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ جدہ ہمارے ہاں سے سات سو کلومیٹر تو ہو گا۔ یونس کو ہم سفر کے طور پر ایک ایسے افسر کی تلاش تھی جس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہو تاکہ طویل سفر کے دوران ڈرائیونگ میں ہاتھ بٹا سکے۔ سعودیوں کے ہاں ڈرائیونگ لائسنس جاری کرنے کے قوانین بڑے سخت تھے۔ ان کے سرکاری ڈرائیونگ سکول میں داخلہ ضروری تھا۔ جہاں چار ہفتوں کی تربیت کے بعد ٹسٹ ہوتا۔ فیل ہونے پر پندرہ دن اور حاضری بھرنا پڑتی۔ اور ٹسٹ اصلی ٹسٹ ہوتا تھا۔ انسپکٹر گاڑی میں بیٹھ کر ساتھ چلتا' ڈھلوانوں پر گاڑی رکواتا' انجن بند کرواتا' گاڑی پیچھے سرکے بغیر آگے لے جانا ہوتی کبھی گاڑی رکواتا اور شرط یہ ٹھہرتی کہ ہینڈ بریک استعمال کئے بغیر ڈھلوان پر اوپر کی سمت جانا ہے۔ سب سے مشکل شرط یہ تھی کہ سڑک کے کنارے گاڑی ایسی جگہ پارک کی جائے جہاں آگے پیچھے گاڑیوں کے قطار کے درمیان آپ کی گاڑی کی لمبائی سے ایک آدھ فٹ ہی جگہ زائد ہوتی۔ ایک خاص ٹیکنیک ہے جس کی مدد سے آپ گاڑی' دوسری گاڑیوں کو چھوئے بغیر ایسے پارک کر سکتے ہیں کہ دیکھنے والا یہ کہے جیسے کسی نے کرین سے اٹھا کر یہ گاڑی درمیان میں رکھ دی ہے۔ اسی ٹیکنیک سے اسے نکالا بھی جا سکتا ہے۔ پاکستانیوں کو یہ رعایت تھی کہ اگر ان کے پاس پاکستان کا ڈرائیونگ لائسنس ہوتا تو سکول میں داخلے کے بغیر وہ ٹسٹ دے سکتے تھے لیکن فیل ہونے کی صورت میں داخلہ ضروری تھا اور چار ہفتوں تک حاضری بھی۔ فیل ہو جانے والے افسروں کے ساتھ ہمیں کئی بار سکول جانا پڑا وہاں سکھائے جانے والے گر ہم نے دیکھ دیکھ ہی سیکھ لئے اور جب ڈرائیونگ ٹسٹ دیا تو پہلی ہی کوشش میں نہ صرف پاس ہو گئے بلکہ انسپکٹر کی داد و تحسین کے مستحق بھی ٹھہرے۔

تو کیپٹن یونس نے جب ہمیں ساتھ چلنے کی پیش کش کی تو ہم نے جھٹ حامی بھرلی۔ جمعرات کا دن تھا جب ہم جدہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک افسر اور تھے ساتھ' شاید کیپٹن فاروق ---- یونس نے لینے کو تو ہمیں ساتھ لے لیا تھا اور ظاہر ہے اس میں ان کی محبت اور احترام بھی شامل تھا لیکن جب وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے تو انہیں مطلق یاد نہ رہتا کہ انہوں

نے تھکنا بھی ہے۔ خمیس مشیط سے جو چلے ہیں تو یلملم جا کر رکے جو کعبہ کے جنوب سے آنے والوں کے لئے میقات ہے یعنی جو حج اور عمرے پر جا رہے ہوں وہ یہاں سے احرام باندھتے ہیں۔ ہم نے غسل کر کے احرام باندھے اور چل پڑے۔ یہاں سے مکے کا فاصلہ آدھ پون گھنٹے کا ہے۔ مکہ پہنچے، عمرہ کیا اور جب واپس پاکستان ہاؤس کے قریب پہنچے تو ہم نے اپنے ارادوں کا اعلان کیا کہ ہم ذرا مدینے جا رہے ہیں۔ کل شام آپ کو یہیں ملیں گے۔ آپ جدہ شاپنگ کر آئیں۔ یونس نے اس پر سخت احتجاج کیا، ساتھ چلنے کو کہا لیکن ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہماری وجہ سے اس کا شاپنگ کا پروگرام ادھورا رہ جاتا۔ ہم نے اپنا بیگ بھی گاڑی میں چھوڑا اور با اصرار ان سے اجازت لی۔ طے ہوا کہ دوسرے دن عصر کی نماز ہم سب خانہ کعبہ میں پڑھیں گے اور پھر یہیں، اسی جگہ ملیں گے۔

جان بوجھ کر ہم نے کوئی سامان ساتھ نہ لیا تھا کہ دربار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں پہنچیں تو کوئی اور فکر دامن گیر نہ ہو۔ بس تن کے کپڑے تھے، کرتہ اور شلوار، پاؤں میں ہوائی چپل۔ جیب میں کچھ نقدی اور پاسپورٹ یا شاید اقامہ کہ راستے میں جگہ جگہ چیکنگ ہوتی ہے اور غیر ملکیوں کے سفری کاغذات بڑی باریک بینی سے چیک کئے جاتے ہیں۔ ایک اڈے سے ایک ویگن میں بیٹھے۔ غیر ملکی مسافر ہوں تو ڈرائیور کو ایک خاص جگہ پر ان کا اندراج کروانا پڑتا ہے۔ ضروری کارروائی میں کافی دیر ہو گئی اور ہم مغرب کے بھی کافی بعد مکہ سے روانہ ہو سکے۔

در حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر جانے کی خوشی بھی تھی، ملال بھی، ملال اس بات کا کہ اتنی دیر سے کیوں جا رہے تھے لیکن یہ اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ کو بھی ہماری مجبوریوں کا علم تھا اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تو اپنے امتی کا عذر قبول فرما ہی لیں گے۔ ہم تصور میں روضے کی جالی تھامے، درود پڑھتے رہے، سلام پیش کرتے رہے۔ نہیں معلوم ویگن کب مکے سے نکلی اور کب بڑی شاہراہ پر پہنچ کر مدینے کی طرف دوڑنے لگی۔ ہوش تب آئی جب کسی نے ہمیں جھنجھوڑ کر ہم سے فیصلہ چاہا۔ کیسا فیصلہ؟

پتہ چلا جب سے مکے سے چلے ہیں، مسافروں اور ڈرائیور میں ایک جھگڑا چل رہا تھا۔ ویگن میں ہمارے علاوہ سبھی مسافر مصری تھے اور جیسا کہ ان کی بعد کی گفتگو سے پتہ چلا، کسان تھے۔

ان میں ایک دو شاید پہلے بھی حج پر آ چکے تھے یا وہ بریفنگ لے کر آئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم کرایہ مدینے پہنچ کر دیں گے جب کہ ڈرائیور کا اصرار تھا کہ کرایہ اسے فوراً ادا کیا جائے۔ جانے کب اور کیوں انہوں نے ہمیں حکم مان لیا تھا اور طے یہ ہوا تھا کہ ہم جو فیصلہ دیں گے انہیں قابل قبول ہو گا۔

ڈرائیور تو کرایہ مانگنے میں حق بجانب تھا لیکن ان مسافروں کو کیا ضد تھی کرایہ نہ دینے کی۔ ہم نے ان سے پوچھا تو وہ بولے کہ اسے کرایہ ابھی ادا کر دیا تو یہ ہمیں راستے میں تنگ کرے گا "مثلاً کیسے تنگ کر سکتا ہے"۔ ہم نے پوچھا۔ وہ بولے ہماری خواہش ہے کہ فجر کی نماز مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں جا کر ادا کی جائے لیکن یہ ڈرائیور تنگ کرتے ہیں راستے میں گاڑی کھڑی کر کے کہیں سو جائے گا اور ہم وقت پر نہ پہنچ سکیں گے۔ ہم نے ڈرائیور کا موقف سنا لیکن وہ ایسے لہجہ میں بول رہا تھا کہ کچھ پلے نہ پڑا کیا فرما رہا ہے۔ اس کے لہجے میں غصے کی جھلاہٹ تھی۔ اسے کرایہ چاہیے تھا اور بس۔

"بھائیو! کرایہ تو تم نے دینا ہی ہے، اس میں دیر کیا کرنی۔ لاؤ اس کا حق اس کے حوالے کرو۔ جس کے پاس جا رہے ہو اس نے کبھی کسی کا حق دینے میں تاخیر نہ کی تھی۔ رہا فجر کی نماز کا ثواب تو دینے والا تو نیتوں پر بھی ثواب دے دیتا ہے حقوق اللہ کی ادائیگی کے لئے حقوق العباد روکے نہیں جاتے"۔ یہ کہتے ہوئے ہم نے کرایہ نکالا اور ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا۔ باقی لوگوں نے خاموشی سے ہماری تقلید کی۔ ہم پھر درود و سلام پڑھتے ہوئے مدینے کی گلیوں میں کھو گئے۔

کسانوں کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ جب مدینہ چند کوس کے فاصلے پر رہ گیا تو ڈرائیور نے ویگن ایک ہوٹل کے باہر کھڑی کی اور بولا کہ مجھے نیند آ رہی ہے، تازہ دم ہو لوں تو چلتے ہیں۔ آپ لوگ بھی چائے وائے پی لیں۔ قدرے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ ویگن سے اترے کہ تھوڑا چل پھر لیں، چائے پی لیں لیکن چلتے پھرتے، ٹہلتے ہوئے تنگ آ گئے لیکن ڈرائیور واپس نہ آیا۔۔۔ تمام لوگوں نے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی، ہوٹل کے اندر، باہر، ہر طرف اسے دیکھ لیا لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔۔۔ آخر ایک مسافر چلایا۔ ڈرائیور اپنی ویگن کے نیچے سویا پڑا تھا۔ کسی نے اسے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ اس نے کپڑے جھاڑے، ایک ڈرم سے پانی لے

کر منہ پر چھینٹے مارے اور بڑبڑاتا ہوا اسٹیرنگ پر آ بیٹھا۔

ہم نے فجر کی نماز راستے ہی میں ادا کی۔ جب مدینے پہنچے تو سورج طلوع ہوا چاہتا تھا اجالے پھیل رہے تھے۔ نور بکھر رہا تھا۔ ویگن سے اترے گنبد خضریٰ دور سے نظر آ رہا تھا بس اسی کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قریب آئی تو دیکھا بہت سے لوگ مسجد کے قریب ہی' فٹ پاتھ پر ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ ایک ترک فیملی تھی جنہوں نے گاڑی پارک کر کے دروازے کھول دیئے تھے اور انہی سے چادریں باندھ کر فٹ پاتھ پر خیمہ سا بنا لیا تھا۔ لگتا تھا رات یونہی گذاری ہے۔ مکہ میں جلال کی سی کیفیت طاری رہتی ہے۔ خانہ کعبہ کے اردگرد گاڑیاں بالکل نہیں کھڑی کرنے دیتے۔ ہاں تکبیر ہو جائے تو نماز کے اختتام تک تھوڑی دیر کو اجازت دیتے ہیں لیکن ذرا دیر ہو جائے تو فورک لفٹر (Fork Lifter) سے گاڑی اٹھا کر لے جاتے ہیں' ڈھونڈتے پھرو کون' کہاں لے گیا ہے۔ یہاں مدینے کی فضا میں پیار ہی پیار تھا' محبت ہی محبت۔ شفقت ہی شفقت' نرمی ہی نرمی۔ مسجد نبوی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ' فٹ پاتھ پر' پارکنگ کی جگہوں پر لوگ یوں مطمئن مطمئن بیٹھے تھے' لیٹے تھے جیسے کسی نے امان دے رکھی ہو' کسی کی پناہ میں ہوں۔ پروانہ امن پر دستخط کروائے بیٹھے ہوں۔

رات بھر کے سفر سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ دانت بھی صاف نہیں تھے۔ خیال آیا کہ ایک ہینڈ بیگ ہی ساتھ لے آتے جس میں برش اور ٹوتھ پیسٹ بھی رکھ لیتے۔ یہ سوچا ہی تھا کہ سامنے ایک مسواک والا نظر پڑا۔ اس سے مسواک خریدی اور اسے چباتے ہوئے غسل خانوں کی طرف پلٹ گئے۔ اچھی طرح دانت صاف کئے' جی بھر کر نہائے اور تازہ دم ہو کر مسجد نبوی کی طرف چلے اور پھر دونوں جہانوں کی نعمتیں ہیچ تھیں اس سعادت پر جو ہمیں حاصل ہوئی۔ مسجد میں داخل ہوئے۔ تحیۃ المسجد کے نفل ادا کئے۔ اشراق کی نماز پڑھی۔ پھر چاشت کی۔ پتہ نہیں' نمازوں کا شوق بڑھ گیا تھا یا روضے کے سامنے جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ یہ کیفیت خانہ کعبہ میں تو نہ ہوئی تھی۔ جب ہوٹل سے چلے تھے تو بلا جھجک خانہ کعبہ میں داخل ہو گئے تھے۔ ہماری کم مائگی' گناہگاری اور چھوٹے پن کے باوجود جب اس نے اپنے گھر بلا لیا تھا تو بس پہنچ گئے تھے اس کے پاس۔ بڑا مزہ آیا تھا اس کے گھر میں بھی۔ اس کے دروازوں سے لپٹ لپٹ کر

روئے تھے۔ اس کے گھر کے اردگرد طواف کیا تھا۔ گناہوں کی معافی مانگی تھی۔ اس سے دوبدو باتیں بھی کی تھیں لیکن وہاں قدم یوں رکے نہ تھے' نظر جھکی نہ تھی۔ مسجد الحرام میں صورت حال ہی کچھ ایسی ہے' ماحول کی ترتیب ہی کچھ یوں ہے' کرنے والے کام کئے ہی تب جاتے ہیں جب نظریں اٹھا کر رکھی جائیں۔ طواف کرتے ہوئے خیال رکھنا پڑتا ہے' کب حجر اسود آ گیا' اس کی سیدھ میں آ گئے کہ استلام کریں۔ سعی کرتے ہوئے نشان زدہ علاقوں کے درمیان قدرے تیز بلکہ دوڑ کر چلنے کا حکم ہے' ان نشانوں کو دیکھنے کے لئے نظریں کھول کر بلکہ اٹھا کر رکھنا پڑتی ہیں کہ نشانیاں ٹیوب لائٹس کی صورت قدرے بلندی پر لگی ہوئی ہیں۔ اور جب فارغ ہوں تو بیت اللہ کو دیکھتے رہنا بھی ایک عبادت ہے اور دیکھنے کے لئے نظریں اٹھانا پڑتی ہیں۔ بیت اللہ صاف سامنے موجود ہوتا ہے' غلاف میں چھپ کر بھی نمایاں' حاضر' موجود --------- یہاں مدینے میں معاملہ غیب کا ہے' حجاب کا' مزار مقدس سامنے ہے نا تعویذ۔ نظریں اٹھاؤ بھی تو دیکھو گے کیا؟ لیکن تمام تر حجاب اور پردوں کے باوجود یقین کا عالم یہ ہوتا ہے کہ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ شرمساری کا عالم بھی تھا' غمگساری کی توقع بھی اور انہی توقعات پر شرمندگی اور بڑھ رہی تھی کہ وہ تو رحمۃ للعلمین ہیں' معاف کر دیں گے' مسکرا دیں گے' تم بتاؤ' کردار کے ان دھبوں کے ساتھ' گناہوں کے ان پشتاروں کے ساتھ' ان سے محبت کا دعویٰ کیونکر کر سکتے ہو؟ محبت کے دعویدار ایسے ہوتے ہیں؟ کچے وعدے کرنے والے' کہہ کر مکر جانے والے' عشق کے تقاضے پورے کرنا تو درکنار' ابتدائی آداب محبت سے بھی صرف نظر کرنے والے؟

نماز پڑھ کر ریاض الجنۃ کی طرف آئے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ مسجد کے منبر اور میرے حجرے کے درمیان جو جگہ ہے وہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے تو جنت ہمارے قدموں تلے تھی لیکن منزل ابھی چند قدم اور آگے تھی۔ لوگ روضے پر کھڑے ہو کر جنت کی سفارش مانگتے ہیں' ہم جنت سے گذر کر روضے کے سامنے جا رہے تھے۔ بالآخر رکے رکے قدموں اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ ہم مواجہ شریف جا پہنچے۔ روضہ رسولؐ کے سامنے۔ لوگوں کے پیچھے جگہ ملی یا شاید ہم خود ہی چھپ رہے تھے' ہاتھ باندھ کر سلام عرض کیا۔

"الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ"

الصلوۃ والسلام علیک یا رحمتہ اللعلمین

الصلوۃ والسلام علیک یا شفیع المذنبین

پھر جانے کب الفاظ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ دل کی گہرائیوں سے اٹدتا ہوا احترام غلطیوں اور گناہوں پر ہونے والی پشیمانیاں' شفاعت کی توقعات دربار رسالت پر بلاوے روضہ رسولؐ پر حاضری کی سعادت بخشنے پر احسان مندی کے احساسات سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ کب کا رکا ہوا آنسوؤں کا سیلاب آنکھوں کی راہ بہ نکلا۔ کتنی ہی دیر کھڑے رہے۔ کسی نے روکا نہ ٹوکا۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ بجائے لوگوں کے پیچھے کھڑے ہونے کے ہم عین روضہ اطہر کی جالی کے سامنے کھڑے ہیں۔ لوگ دھکم پیل میں کہاں کے کہاں پہنچ جاتے ہیں اور ہمیں یہ سعادت مل گئی تھی کہ روضے کے عین سامنے کھڑے تھے۔ جب دل کا غبار ہلکا ہوا' ایسے جیسے کسی کے دامن سے لپٹ کر رو لئے ہوں تو دو قدم اور آگے بڑھ گئے۔ رسالت مآب ﷺ کے یار غار' رفیق جلوت و خلوت' سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ کا مزار سامنے تھا" آپ پر لاکھ لاکھ سلام ہوں یا سیدنا ابوبکرؓ! حق رفاقت کی ادائیگی کوئی آپ سے سیکھے۔ زندگی میں تو آپ قدم قدم رسول خدا کے ساتھ رہتے ہی رہے لیکن انتقال کے بعد بھی آپ انہی کی رفاقت میں ہیں۔ اللہ ۔ اللہ جب لوگ ٹھٹھا اڑاتے تھے' مذاق کرتے تھے۔ فقرے تولتے تھے تو آپ تصدیق فرماتے تھے۔ آپ کو نبوت کی صداقتوں پر کتنا یقین تھا۔ گھر کا سارا مال و اسباب لا کر قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ آپ کی استقامت کے قربان۔ آپ نے نظام اسلام کی عمارت میں کوئی رخنہ نہ پڑنے دیا۔ جب لوگ رعایت کی بات کر رہے تھے تو آپ نے کس ثابت قدمی سے فرمایا تھا کہ اگر کوئی بکری باندھنے کی جلی ہوئی رسی بھی زکوۃ میں دیتا تھا تو میں نہ چھوڑوں گا۔ جب آپ خلیفہ تھے تب بھی مدینے کے باہر رہنے والی وہ بڑھیا آپ کی توجہ کی مستحق رہی جس کی بکریوں کا دودھ آپ جا کر دوہ آتے تھے۔---- یا سیدنا ابوبکرؓ! ہم نے آپ کی تعلیمات کو بھلا دیا۔ آپ کی استقامت' ثابت قدمی' استقلال مشعل راہ ہے لیکن ہم نے آنکھیں بند رکھی ہیں اور پوری دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔"

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مزار سے آگے بڑھے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے مزار کے سامنے پہنچ گئے۔ نیاز مندی سے سلام پیش کیا۔ جلال عمر رضی اللہ عنہ کی کتنی ہی

تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ دور جہالت کا وہ عزم جب تلوار سونت کر "نئے نبیؐ" کو نعوذ باللہ "قتل کرنے چلے تھے اور اسلام لاتے ہی اس عزم کا اظہار کہ جب ہم حق پر ہیں تو چھپ چھپ کر نمازیں کیوں پڑھیں' عین خانہ کعبہ میں جا کر پڑھیں گے۔ ہجرت انہوں نے بھی کی تھی لیکن اس شان سے کہ ڈنکے کی چوٹ کھڑے ہو کر یہ اعلان کیا کہ عمر ہجرت کر کے مدینے جا رہا ہے۔ جو اپنی عورتوں کو بیوہ اور اپنے بچوں کو یتیم کرنا چاہے' وہ عمر کی راہ روک لے۔

لاریب' انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ خاتم النبینؐ کی دعا تھے۔ کسی مؤرخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ دس پندرہ برس اور حکومت کر جاتے تو پورے روئے زمین کا مذہب صرف اسلام ہوتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر رضی اللہ عنہ ہوتے۔

کتنی ہی دیر ہم انہیں ہدیہ عقیدت پیش کرتے رہے۔ پھر آگے بڑھے۔ چکر کاٹ کر اصحاب صفہ کے چبوترے کے سامنے آ گئے۔ پھر ریاض الجنتہ میں۔ یہاں مختلف ستون بنے ہوئے اسطوانہ حنانہ' اسطوانہ وفود' اسطوانہ سریر' اسطوانہ جبرئیل' اسطوانہ عائشہ رضی اللہ عنہا ---------- قدم قدم پر تاریخ بکھری پڑی ہے۔ ہم ہر جگہ دو رکعت نماز نفل پڑھتے کہ ان جگہوں کو بھی اپنے نامہ اعمال کی گواہی میں شریک کر لیا جائے

بھوک چمک اٹھی تھی۔ سوچا باہر چلتے ہیں' ناشتہ کر کے لوٹ آئیں گے۔ باہر نکلے کچھ پتہ نہ تھا' بازار کس طرف کو ہیں' ہوٹل کہاں ہوں گے' دل پسند ناشتہ کہاں ملے گا۔ نقاہت سی محسوس رہی تھی۔ بھرپور ناشتے کا پروگرام تھا لیکن جی بھر کے ناشتہ آپ تبھی کر سکتے ہیں جب ذوق یا عادت کے مطابق کچھ کھانے کو ملے----- ہم نے زیادہ تردد نہیں کیا۔ گنبد خضریٰ پر نظر پڑی تو اطمینان سا ہو گیا کہ جس کے مہمان ہیں وہی رہنمائی بھی کرے گا۔ بس ایک طرف کو چل دیے۔ ایک ہوٹل پر جا بیٹھے اس طرح کہ گنبد خضریٰ عین سامنے تھا۔ ناشتہ توقع کے عین مطابق ملا' چٹپٹا' لذیذ' ذائقے دار۔ چٹپٹے چنے اور گلگلے نرم نان' ویٹر نے تیل میں بھیگے ہوئے زیتون بھی سامنے لا رکھے اور ہم نے تبرکاً" چکھے بھی کہ ان کا ذکر قرآن میں بھی ہے اور پھر اہل مدینہ کی غذا بھی۔ لیکن زیادہ نہ کھائے جا سکے۔ چائے اور بھی لذیذ تھی۔ تیز گرم' لب

سوز۔ جب تک چائے گرم نہ ہو اسے پینے کا لطف ہی کیا۔ اکثر پارٹیوں دعوتوں اور محفلوں میں ہم چائے' پینے کو تو پی لیتے ہیں لیکن تمام تر تکلفات کے باوجود اگر چائے پیالی میں آنے تک ٹھنڈی ہو جائے تو لطف نہیں دیتی۔ لیکن یہاں یوں لگا کہ جس کے مہمان تھے' اس نے ذوق کا خاص خیال رکھا ہے۔ بڑے اہتمام سے چائے بنوائی گئی ہے۔ رنگت میں خوبصورت' پینے میں ذائقہ ہی ذائقہ۔ چسکیاں لے لے کر پیتے رہے اور گنبد خضریٰ کو دیکھتے رہے۔ کیا حسین نظارہ تھا اور کتنے قیمتی لمحات۔ اے کاش وقت وہیں رک جاتا' تھم جاتا۔

ناشتہ کر کے واپس آئے۔ غسل خانوں میں جا کر وضو کیا اور پھر دربار نبویؐ میں حاضر ہو گئے۔ ابھی رش زیادہ نہیں تھا اس لئے اچھی طرح گھوم پھر کر ایک ایک نقش کو جی بھر کر دیکھا۔ منبر۔ مآذن' ستون' ریاض الجنتہ' اصحاب صفہ کے بیٹھنے کی جگہ۔ پھر مواجہ شریف میں جا کر حاضری دی۔ سلام پیش کیا پھر گھوم کر ریاض الجنتہ میں آ گئے اور قرآن شریف پڑھنے لگے۔ نشست اس طرح سے ملی کہ روضہ اطہر کی بغلی دیوار بائیں ہاتھ تھی یہ کبھی حضورؐ کا حجرہ مبارک رہا ہو گا۔ قرآن جو کھولا تو ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے جیسے خانہ کعبہ میں قرآن پڑھنے کا ایک خاص لطف ہے۔ اسی طرح مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر قرآن پڑھنے کی لذت بھی کچھ اور ہے۔ اگر عربی سے معمولی سے واقفیت بھی ہو اور انسان اس کشمکش سے تھوڑا سا واقف ہو جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے آتے ہی برپا ہو گئی تھی تو قرآن کی مدنی آیات اس کا ایسا نقشہ کھینچ کر رکھتی ہیں کہ یوں لگتا ہے سارے واقعات آپ کی نظروں کے سامنے رونما ہو رہے ہوں۔ مسجد نبویؐ ان مکالموں سے گونج اٹھتی ہے جو مختلف وفود اور رسول اللہؐ کے درمیان ہوئے۔ یہیں صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین پروانہ وار رسولؐ خدا پر نثار ہوتے تھے۔ ان سے حکمت سیکھتے تھے اور تزکیہ نفس کی دولت سے مالا مال ہوتے تھے۔ یہیں غزوہ تبوک کی تیاریاں ہوئی تھیں۔ اور یہیں کسی کونے میں ابوبکر صدیق نے اپنے گھر کا سارا اسباب لا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا تھا اور یہیں انہی ستونوں کے درمیان ابولبابہ بن عبدالمنذر اور ان کے ساتھیوں نے خود کو رسیوں سے باندھ لیا تھا کہ جب تک معافی نہ ملے گی میں یہیں بندھا رہوں گا۔ تب رحمت خداوندی جوش میں آئی۔ سورہ توبہ کی آیت ۱۰۲ سے ۱۰۶ ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کرتی ہوئی نازل ہوئیں---- رہتی دنیا تک کے

لئے معاشرتی' تمدنی' سیاسی' معاشی اصول یہیں نازل ہوئے اور شارحؑ نے انہیں اپنے ساتھیوں کو سمجھایا' ذہن نشین کرایا۔ حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ اس مسجد نبویؐ میں شانہ مبارک پر چڑھ جایا کرتے۔ مسجد میں ہوتے اور حسن رضی اللہ عنہ یا حسین رضی اللہ عنہ پشت مبارک پر سوار ہو جایا کرتے تو آپ سجدے طویل کر دیا کرتے' اسی مسجد میں حضور ﷺ نے اعتکاف بھی فرمایا اور یہیں سے سر مبارک حجرے کی طرف بڑھا دیا کرتے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تیل ڈال کر کنگھی کر دیتی تھیں------ چھوٹے چھوٹے واقعات قرآنی آیات کے ساتھ ابھرتے رہے۔ یوں لگا جیسے ابھی کل کی بات ہو------ جمعے کا دن تھا' دس بجے سے ہی مسجد بھرنا شروع ہو گئی اور جمعے کا وقت ہوتے ہوتے تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ ہم قرآن پڑھتے رہے۔ آنسوؤں کا سیل رواں جاری رہا۔ اسی دوران ہمیں یوں لگا جیسے کوئی ہمیں بلا رہا ہے سر اٹھا کر دیکھا تو دھندلائے ہوئے منظر میں ایک نورانی چہرہ شخص روضہ مبارک کی دیوار کے پاس کھڑا تھا اس کے اور ہمارے درمیان پانچ چھ افراد تھے۔ وہ جھک کر ہاتھ ہماری طرف بڑھا رہا تھا۔ اس نے اشارہ کیا تو ہم بھی قدرے اس کی طرف جھک گئے۔ اس نے خوشبو بھرا ہاتھ ہمارے سینے پر مل دیا۔ زبردست خوشبو سے پورا ماحول مہک اٹھا۔ یوں لگا جیسے خوشبو کا یہ تحفہ خاص طور پر ہمارے لئے اندر سے آیا ہے۔ ورنہ خوشبو لگانے والے اور ہمارے درمیان اور بہت سے افراد بھی تو تھے۔ اس نے جھک کر' ہاتھ بڑھا کر ہمیں خوشبو لگانے پر کیوں اصرار کیا۔

جمعے کی نماز کے بعد ایک بار پھر مواجہ شریف گئے۔ سلام پیش کیا اور رخصت کی اجازت چاہی---- واپسی کے لئے ڈبل ڈیکر بس میں نشست ملی۔ دوسری منزل میں سب سے آگے والی سیٹ پر جا کر بیٹھے کہ راستے کے مناظر اچھی طرح نظر آئیں۔ عصر تک ہم مکہ پہنچ چکے تھے۔

ان بستیوں کا حال جو حد سے گذر گئیں

ان امتوں کا ذکر جو رستوں میں مر گئیں

نجران------تاریخ کا بحران

لاہور میں جب واپڈا ہاؤس تعمیر ہوا تھا تو اس کے بہت چرچے ہوئے تھے۔ تربیلا ڈیم تو پہلے سے بنا ہوا تھا۔ خیال تھا کہ تربیلا ڈیم اور واپڈا کے تال میل سے ملک روشن ہو جائے گا لیکن ہوا یوں کہ تربیلا ڈیم سے بجلی چلتی تو واپڈا ہاؤس کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی۔ کسی سیکشن آفیسر کی میز سے سر اٹھاتی تو وہ اسے فائلوں میں قید کر کے پینڈ (PEND) کے خانے میں ڈال دیتا۔ واپڈا ہاؤس سے احکام چلتے تو تربیلا ڈیم کے پانیوں میں ڈوب جاتے۔ عام آدمی کو کیا ملا؛ بجلی کی آنکھ مچولی۔ حبیب جالب نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا"

بجلی آتی ہے کبھی
بجلی جاتی ہے کبھی
واپڈا ہاؤس بنا
جشن وہ سال منا

ایوب خان اور ان کے مشیر بڑی بڑی عمارتوں کی تعمیر کے حوالے سے مصر تھے کہ ملک میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ یہ اصرار انہیں لے ڈوبا۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران پتہ چلا کہ وہاں اور اردگرد کے ممالک میں چاروں طرف ایسی بستیوں کے آثار بکھرے پڑے ہیں جن میں وقت کی خوشحال ترین قومیں آباد تھیں۔ انہوں نے بھی واپڈا ہاؤس اور تربیلا ڈیم تعمیر کیے تھے وہ بھی جشن مناتے تھے۔ ہزاروں برس پہلے بھی یہ صورت حال رہی ہے کہ

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

لیکن جب ترقی کی منزل کوئی نہ ہو‘ ہدایت ضلالت میں‘ مقصدیت بے راہ روی میں اور للہیت‘ دہریت میں بدل جائے تو اللہ میاں کو ناراض ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ پھر وہ بس ایک بٹن دباتے ہیں اور واپڈا ہاؤس خالی‘ تربیلا ڈیم زمیں بوس۔ قرآن میں جگہ جگہ ارشاد ہے کہ ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں کو خوشحالی عطا کی لیکن جب انہوں نے ہمارے احکامات سے روگردانی کی تو تباہی ان کا مقدر ٹھہری۔ تم زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام

ہوا۔

سعودی عرب میں قیام کے دوران ہم ایسی بستیوں کے کوائف جمع کرتے رہے جن کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔ جب واپسی کا وقت قریب آیا تو جی چاہا کہ ان بستیوں کا مشاہدہ کیا جائے۔ سعودی عرب سے واپسی پر دو ماہ کی چھٹی مل رہی تھی۔ جی ایچ کیو کو لکھا کہ ہمیں یہ دو ماہ پاکستان سے باہر گذارنے کی اجازت عطا ہو۔ وہاں سے گھڑا گھڑایا جواب آیا کہ سروس کے تقاضوں کی وجہ سے فی الحال چھٹی نہیں دی جا سکتی۔ چھٹی ہمیں مل چکی تھی ہم نے فقط یہ چاہا تھا کہ چھٹی پاکستان میں گذارنے کی بجائے سعودی عرب اور اردگرد کے ممالک کے مطالعاتی سفر میں گذاری جائے۔ وقت کم تھا وضاحتوں میں پڑتے تو خدشہ تھا کہ میسر وقت بھی خط و کتابت کی نذر ہو جائے گا چنانچہ کمانڈنگ آفیسر سے درخواست کی کہ وہ کم از کم سعودی عرب کے مطالعاتی سفر کی خاطر ہمیں دس دنوں کے لئے فارغ کر دیں۔ ان کے پاس ہمیں چھٹی نہ دینے کی معقول وجوہات تھیں۔ یونٹ کی واپسی کا مرحلہ درپیش تھا۔ بہت سے کام مکمل کرنا تھے۔ ان میں سے ایک پاسپورٹوں پر خروج لگوانے کا بھی تھا۔ خروج ایک طرح کی اجازت ہوتی ہے جو وزارت داخلہ کی طرف سے ملک چھوڑنے کے لئے دی جاتی ہے اس کے لئے پاسپورٹ وزارت داخلہ کے مقامی دفاتر میں جمع کروا دیے جاتے ہیں اور دو تین دنوں کے بعد واپس مل جاتے ہیں۔ ایمرجنسی کی شکل میں چوبیس گھنٹوں میں بھی خروج لگ جاتا ہے۔ اس کام پر ہمارے شاگرد رشید کیپٹن سعید مامور تھے اور وہ اتنی تیزی سے خروج لگوا رہے تھے کہ ہماری جگہ آنے والی یونٹ کی ایڈوانس پارٹی کے پاسپورٹ ان کی زد سے بال بال بچے۔ وہ تو وقت پر کسی کی نظر پڑ گئی ورنہ ان پر بھی خروج لگ چکا ہوتا۔ سعید ہمارے شریک سفر تھے اور ان کی کوشش تھی کہ جانے سے پہلے جس حد تک ممکن ہو کام نبٹا لیا جائے تاکہ عین وقت پر ان کی چھٹی منسوخ نہ ہو جائے۔

مالی معاملات پر گفت و شنید براہ راست ہمارے ذمے تھی۔ یونٹ کے افراد کو تنخواہوں اور الاؤنسز کی ادائیگی کا طریق کار یہ تھا کہ سعودی فوج کے اکاؤنٹس کے محکمے کا ایک کارندہ جو محاسب کہلاتا تھا' عید کے چاند کی صورت یونٹ میں طلوع ہوتا۔ صورت انجم' دو تین نائب اس کے ساتھ ہوتے جو بڑے بڑے بکسوں میں ریال بھر کر لاتے۔ ہر شخص کو اس کے واجبات

کیش میں ادا کیے جاتے۔ کبھی کبھار محاسب کے آنے میں تاخیر ہو جاتی تو لوگوں کے چہروں پر ایسی اداسی چھا جاتی جیسے رمضان کی انتیس کو چاند نظر نہ آنے پر روزہ خوروں کے چہروں پر دکھائی دیتی ہے۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ واپسی کی خبروں کے ساتھ ہی ہر شخص نے اپنی جمع کردہ پونجی کا جائزہ لیا تو وہ کم نظر آئی۔ قناعت کی دولت سے کم کم لوگ سرفراز ہوتے ہیں ورنہ روپے پیسے کی ریل پیل آنکھوں کو اندھا اور دلوں کو مردہ بنا دیتی ہے۔ پیسہ جتنا بڑھتا ہے اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے۔ لوگ جمع تفریق میں مشغول تھے۔ سیر سپاٹے محدود کر دیے گئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ دولت واپس لانے کی فکر دامن گیر تھی۔ جو کمی رہ گئی تھی ان کی خواہش ہوتی کہ ہم محاسب سے مذاکرات کے ذریعے پوری کر دیں۔ یہ مذاکرات پورے مہینے جاری رہتے تھے۔ کوئی صاحب ڈیوٹی پر کسی دوسرے شہر گئے۔ کام مکمل ہونے میں ایک آدھ دن زیادہ لگ گیا تو ظاہر ہے ان کا مطالبہ ہوتا کہ ان کا سفری الاؤنس بھی بڑھے۔ اس کے لئے ہمیں خاصے پاپڑ بیلنے پڑتے کیونکہ اس زائد دن کی منظوری لینا پڑتی تھی۔ مختصر یہ کہ پورے مہینے کے دوران چلنے والے مذاکرات پہلی تاریخ کو رنگ لاتے تھے۔ اب جب صرف ایک "پہلی" باقی رہ گئی تھی تو پورے دس دنوں کے لئے ہماری غیر حاضری بہت سے لوگوں پر بھاری گذر رہی تھی لیکن کمانڈنگ آفیسر سے مذاکرات کامیاب رہے۔ ایڈوانس پارٹی کے مترجم کو کام پر لگانے کا فیصلہ ہوا اور ہمیں فارغ کر دیا گیا۔ سفر کے چرچے عام ہوئے تو بہت سے افسر ہمارے ساتھ چلنے پر تل گئے۔ خدشہ تھا کہ تعداد زیادہ ہو گئی تو مقصد سفر فوت نہ ہو جائے۔ بڑی مشکلوں سے ٹالا۔ کیپٹن سعید اور کیپٹن افضال شریک سفر ٹھہرے۔ کیپٹن سعید خوش پوش اور پڑھنے لکھنے سے دلچسپی رکھنے والے افسر تھے۔ سعودی عرب میں قیام کے دوران صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ پڑھتے رہے تھے ان کے ذہن میں جب بھی چبھتے ہوئے سوالات جنم لیتے تو ہماری شامت آتی۔ یونٹ کے سپورٹس آفیسر اور کرکٹ ٹیم کے روح رواں تھے۔ انہوں نے آسانی سے خود کو ہم پر مسلط کر لیا۔

کیپٹن افضال پڑھائی لکھائی سے بھاگا ہوا' مہذب' ذہین اور شوخ و شنگ جوان تھا۔ فاسٹ باؤلر اور بہترین فیلڈر۔ آسمان کو چھو کر آنے والی گیند کیچ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ کبھی

کبھار دایاں ہاتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتا تو کیچ چھوٹ جاتا اور پھر پوری شام اس کا وہ ریکارڈ لگتا کہ احتجاجاً کرکٹ سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیتا لیکن ہمارے پاس کھلاڑیوں کی تعداد اتنی محدود تھی کہ اس اعلان کے متحمل نہ ہو سکتے چنانچہ آئندہ جمعے سے پہلے پہلے کیپٹن افضال کو نہ صرف اپنے اعلان سے رجوع کرنا پڑتا بلکہ اس "بھونڈی حرکت" پر جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا۔ گاڑیوں کا مزاج آشنا تھا اور اس کی ذمہ داری تھی کہ سفر کے دوران نصیب دشمناں گاڑی کی طبیعت ناساز نہ ہونے پائے۔

ہم نے دس دنوں کا تفصیلی پروگرام مرتب کیا اور وعدہ لیا کہ اس پروگرام پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔ کسی شہر کی رونقیں آنکھوں کو خیرہ کریں تو اس میں ترمیم کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا البتہ مقصد سفر کی مناسبت سے کوئی تبدیلی ناگزیر ہوئی تو غور کیا جا سکے گا۔

مارچ کی ایک خوشگوار صبح تھی جب ہم خمیس مشیط سے نجران کی طرف روانہ ہوئے۔ خمیس سے نجران کا فاصلہ ۲۳۰ کلومیٹر ہے۔ راستہ پہاڑی ہے۔ پہلے بلندیوں کی طرف بڑھتا ہے پھر بل کھاتا ہوا نشیب میں اترتا ہے۔ راستے میں دو تین چیک پوسٹیں ہیں۔ پہلی چیک پوسٹ پر سوال ہوا کہ کہاں جا رہے ہو بتایا کہ مختلف جگہوں کا ارادہ ہے، نجران، ریاض، تبوک، مکہ، مدینہ وغیرہ وغیرہ۔

"آخری منزل کون سی ہے؟"

"خمیس مشیط"

"وہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ الٹا پھر، واپس جاؤ"۔

سعودیہ میں شرطے یعنی پولیس کے سپاہی کے منہ سے جو نکل جائے اسے بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمارے راستے بدلتا ہم نے وضاحت کی کہ ہم خمیس مشیط بذریعہ ریاض کیوں جانا چاہتے ہیں۔ اس نے حیرت و استعجاب کے ساتھ کاغذات واپس کرتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ ایک اور چیک پوسٹ پر جب بتایا کہ بہت سے شہروں کا پروگرام ہے تو شرطہ حیرت میں مبتلا ہوا۔ بولا "افسر ہونے کے باوجود گاڑی میں دھکے کھاتے پھرو گے۔ جہاز سے چلے گئے ہوتے، سستا پڑتا"۔ اسے بڑی مشکلوں سے سمجھایا کہ ہم کسی کاروبار پر نہیں، مطالعاتی سفر پر نکلے تھے اور یہ مہنگا ہونے کے باوجود پڑتا سستا ہی ہے۔ یوں حکومت کے کارندوں سے

مذاکرات کرتے اور فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ڈھائی گھنٹوں میں ہم نجران پہنچ گئے۔

زمانہ قدیم میں نجران یمن کا حصہ تھا لیکن بیسویں صدی کے شروع میں جب عرب مختلف قبیلوں میں بٹا ہوا تھا یہاں بھی ایک کمزور سے امیر کی حکمرانی تھی۔ ملک عبدالعزیز نے جب نجد اور حجاز کو متحد کر کے سعودی سلطنت کی بنیاد رکھی تو نجران، یمن اور سعودی سلطنت کے درمیان ایک طرح کا بفرزون تھا لیکن دونوں ملکوں کے حکمران اپنی اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ امیر نجران کی وفاداریاں ان کے ساتھ ہیں۔ یمن کا حکمران امام یحییٰ، ملک عبدالعزیز سے خائف تھا۔ اسے ڈر تھا کہ ملک عبدالعزیز نجد اور حجاز میں خود کو مستحکم کرنے کے بعد کہیں یمن کو بھی تر نوالہ نہ سمجھ لے۔ شروع شروع میں ملک عبدالعزیز کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اس کے مداحوں اور مشیروں نے اسے یہ مشورہ دیا بھی کہ وہ تاج شاہی میں ایک اور ہیرے کا اضافہ کر لے لیکن اس نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی لیکن پھر امام یحییٰ نے خود ایسے حالات پیدا کر دیے کہ ملک عبدالعزیز کو جنوب کا رخ کرنا پڑا۔

ہوا یوں کہ پیش بندی کے طور پر پہلے تو امام یحییٰ نے نجران پر یمن کی ملکیت کے زبانی دعوے کئے۔ پھر وہاں کچھ فوجی دستے بھی بھیج دیے۔ کشیدگی میں اضافہ ہوا تو سفارتی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ طے کیا گیا کہ مذاکرات کے ذریعے دونوں ملکوں کے درمیان سرحدوں کا باقاعدہ تعین کیا جائے۔ نجران متنازعہ علاقہ ٹھہرا اور فریقین اس موضوع پر بحث کرنے لگے کہ کون سا حصہ کس کی ملکیت میں رہے۔ درمیان میں امیر نجران کی دبی دبی آواز بھی سنائی دی ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

لیکن یہ دور تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا ہے امیر نجران کی التجائیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں اور فریقین کے مذاکرات جاری رہے۔

اس دوران ایک پہاڑی کے بارے میں فریقین کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکے تو معاملہ امام یحییٰ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے بڑی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کہا "اس کا فیصلہ میرے بھائی ملک عبدالعزیز کریں گے"۔

عربوں کے ہاں کسی کو بھائی کہہ دینا کچھ معانی رکھتا ہے۔ ملک عبدالعزیز کو جب یہ پیغام ملا تو وہ شکار کرنے صحرا میں آئے ہوئے تھے۔ برقیہ انہیں دکھایا گیا تو وہ مسکرائے اور فوراً ہی جواب لکھوایا "میں اعلان کرتا ہوں کہ یہ پہاڑی یمن کی ملکیت ہے"۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے عالم عرب میں پھیل گئی۔ ہر کسی نے ملک عبدالعزیز کی فراست، دریا دلی اور رواداری کی تعریف کی۔ اخباروں میں اس پر کالم اور اداریے لکھے گئے لیکن ایک پہاڑی کی ملکیت کا تصفیہ نجران کے مجموعی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ مذاکرات میں تلخی در آئی۔ اسی دوران امام یحییٰ نے اپنے فوجی دستے بھی نجران بھجوا دیے جن کی شہ پاکر یمنی چرواہے اپنے اونٹ ان چراگاہوں میں لئے پھرتے تھے جن پر نجران میں موجود سعودی فوجی دستے اپنی ملکیت جتاتے تھے۔ احتجاجی مراسلوں کے تبادلے نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے تو ۱۹۳۲ء میں خالد ابن لاوی کی قیادت میں سعودی قبائلیوں نے یمنیوں پر لشکر کشی کی اور انہیں نجران سے نکال دیا۔ اس کے بعد بھی امام یحییٰ کی طرف سے اشتعال انگیزیاں جاری رہیں۔ اس نے سعودی عرب کے جنوبی حصے منطقہ عسیر پر بھی ملکیت کا دعویٰ کر دیا۔

۱۹۳۴ء کے موسم بہار کی ایک صبح تھی۔ جب ملک عبدالعزیز دربار میں داخل ہوئے تو انہوں نے پچھلی رات دیکھا ہوا ایک خواب سنایا،

"میں ایک اندھیرے کمرے میں ہوں۔ تاریکی اس قدر زیادہ ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ اچانک ایک کونے سے ایک اژدہا نمودار ہوتا ہے۔ وہ غصے سے پھنکارتے ہوئے بل کھا رہا ہے۔ وہ اپنا جبڑا کھول کر مجھ پر حملہ کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ اس کے کھلے ہوئے جبڑے سے زہر آلود، خنجر نما دو دانت نمایاں ہیں۔ مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے لیکن میں ہمت کر کے آگے بڑھتا ہوں اور اژدہے کو گردن سے دبوچ کر دیوار سے لگا دیتا ہوں۔ اژدہا میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ اسی دوران میری آنکھ کھل گئی"۔

ان دنوں امام یحییٰ، ملک عبدالعزیز کے لئے درد سر بنا ہوا تھا اس لئے درباریوں نے بلا تامل یہ رائے دی کہ خواب میں دیکھا گیا اژدہا امام یحییٰ ہی تھا۔ اس کے فوراً بعد امام یحییٰ کو ایک الٹی میٹم بھجا گیا جس میں متنازعہ علاقے کے تصفیے کے بارے میں چند شرائط کا ذکر تھا۔ لیکن اسے

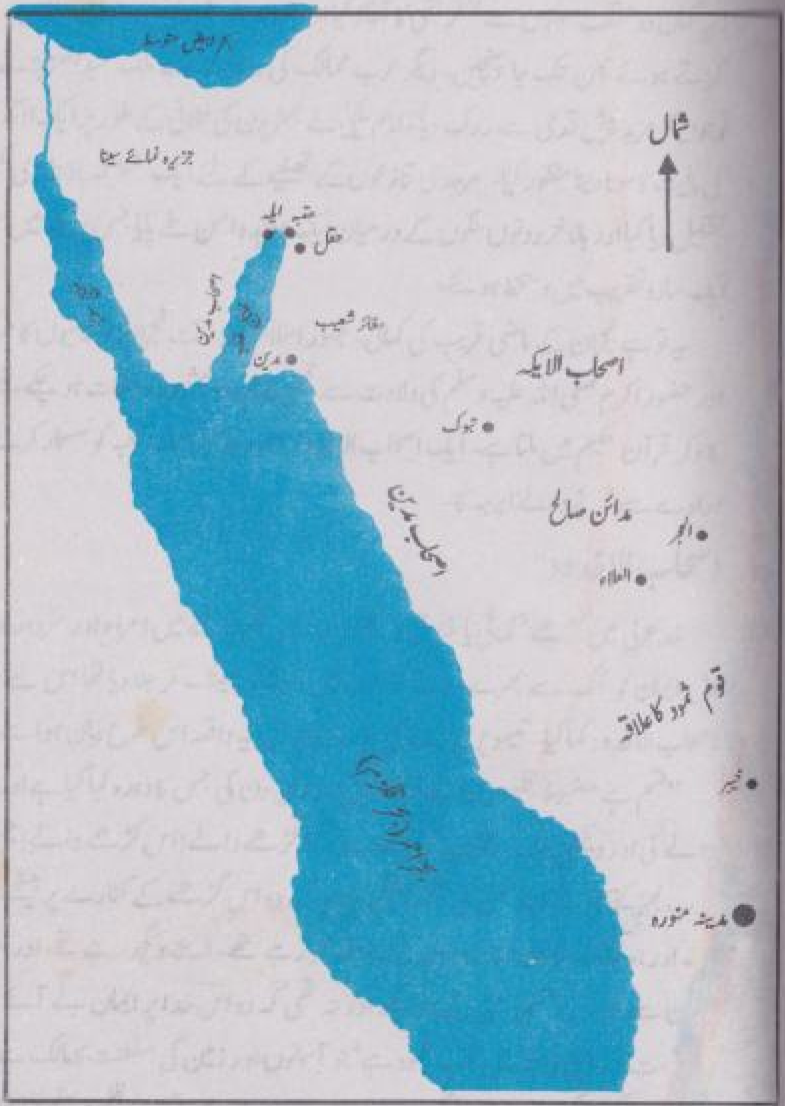

شمالی عرب میں تاریخی بستیوں کے مقام

نظر انداز کر دیا گیا چنانچہ ۵ اپریل ۱۹۳۴ء کو سعودی افواج نے شہزادہ سعود اور شہزادہ فیصل کی زیر کمان دو مختلف سمتوں سے لشکر کشی کا آغاز کیا اور بہت جلد نجران' جیزان اور الحدیدہ کو فتح کرتے ہوئے یمن تک جا پہنچیں۔ دیگر عرب ممالک کی مداخلت سے ملک عبدالعزیز نے اپنی فوجوں کو مزید پیش قدمی سے روک دیا۔ امام یحییٰ نے جھڑپوں کی تلافی کے طور پر ایک لاکھ ڈالر کی مالیت کا سونا دینا منظور کیا۔ سرحدی تنازعوں کے تصفیے کے لئے ایک مشترکہ باؤنڈری کمیشن تشکیل دیا گیا اور بالآخر دونوں ملکوں کے درمیان ایک معاہدہ امن طے پایا جس پر مکہ میں منعقد ایک سادہ تقریب میں دستخط ہوئے۔

یہ تو ہے نجران کے ماضی قریب کی کہانی۔ ظہور اسلام کے وقت نجران عیسائیوں کا مرکز تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل یہاں دو مشہور واقعات ہو چکے تھے جن کا ذکر قرآن حکیم میں ملتا ہے۔ ایک اصحاب الاخدود کا اور دوسرا خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کے ارادے سے آنے والے ابرہہ کا۔

اصحاب الاخدود

خد عربی میں گڑھے' کھائی یا خندق کو کہتے ہیں۔ زیر نظر واقعے میں امراء اور سرداروں نے اہل ایمان کو آگ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں پھینک کر جلا دیا تھا اس لئے انہیں اصحاب الاخدود کہا گیا۔ تیسویں پارے کی سورہ بروج میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے۔

"قسم ہے مضبوط قلعوں والے آسمان کی اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور دیکھنے والے کی اور دیکھی جانے والی چیز کی کہ مارے گئے گڑھے والے (اس گڑھے والے) جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی۔ جب کہ وہ اس گڑھے کے کنارے پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ وہ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے۔ اسے دیکھ رہے تھے اور ان اہل ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کچھ اور نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے' جو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا مالک ہے اور وہ خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے' یقیناً ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلائے جانے کی سزا ہے----------"

گڑھوں میں آگ جلا کر ایمان والوں کو ان میں پھینکنے کے متعدد واقعات روایات میں بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کئی مرتبہ اس طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ ہم صرف اس واقعے کی تفصیلات بیان کریں گے جو نجران سے متعلق ہے۔

یہ واقعہ سیر محمد بن اسحاق میں محمد بن کعب سے روایت کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نجران کے باشندے بت پرستی اور شرک میں مبتلا تھے۔ ان کے قریب کی آبادی میں ایک ساحر رہتا تھا جو نجران کے لڑکوں کو سحر کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد نجران اور ساحر کی بستی کے درمیان ایک زاہد و مجاہد اور صاحب کشف و کرامت عیسائی سیاح فیمیون آکر رہنے لگا۔ نجران کے جو لڑکے ساحر سے سحر کی تعلیم حاصل کرتے تھے ان میں ایک لڑکا عبداللہ بن تامر بھی تھا۔ ایک روز وہ عیسائی راہب کے خیمے میں چلا گیا۔ راہب نماز میں مشغول تھا۔ عبداللہ کو راہب کی نماز اور طریق عبادت پسند آیا اور اس کے پاس آنے جانے لگا اور اس سے اس کے دین کو سیکھنا شروع کر دیا۔ راہب سے سچی مسیحیت کی تعلیم حاصل کر کے وہ عالم دین بن گیا اور اس دین کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دیتا۔ اس کی دعا سے مریض بھلے چنگے ہو جاتے۔ نجران کے بادشاہ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو نے میری مملکت میں فساد مچا دیا اور میرے باپ دادا کے دین کی مخالفت شروع کر دی اس لئے اب تیری سزا یہ ہے کہ تجھ کو قتل کر دیا جائے۔

لڑکا کہنے لگا "اے بادشاہ! میرا قتل تیری قدرت سے باہر ہے" بادشاہ نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اس کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دو۔ سرکاری اہل کاروں نے حکم کی تعمیل کی لیکن قدرت الٰہی نے اس کو صحیح سالم رکھا۔ بادشاہ نے جھلا کر حکم دیا کہ اس کو دریا میں لے جا کر غرق کر دو لیکن دریا بھی لڑکے کو کوئی گزند نہ پہنچا سکا۔ تب لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ اگر تو واقعی مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ تو خدائے واحد کا نام لے کر مجھ پر حملہ کر۔ بادشاہ نے خدائے واحد کا نام لے کر لڑکے پر حملہ کیا تو لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ساتھ ہی عذاب الٰہی نے بادشاہ کو بھی اسی جگہ ہلاک کر دیا۔

نجران میں عیسائیت کی ترویج اور لڑکے اور راہب کے واقعے کا تذکرہ یمن کے بادشاہ ذونواس تک پہنچا تو وہ سخت آگ بگولہ ہوا۔ مذہباً وہ یہودی تھا اور عیسائیت اسے ایک آنکھ نہ

بھاتی تھی۔ وہ ایک لشکر جرار لے کر نجران پہنچا اور تمام شہر میں منادی کرا دی کہ کوئی شخص عیسائیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ یا تو ہر شخص یہودیت قبول کرے ورنہ مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اہل نجران کے دلوں میں سچا دین اس درجہ گھر کر چکا تھا کہ انہوں نے مرجانا قبول کیا مگر اپنے دین سے پھر جانا گوارا نہ کیا۔ ذونواس نے یہ دیکھا تو غیظ و غضب کے عالم میں حکم دیا کہ شہر کی گلیوں اور شاہراہوں کے کنارے خندقیں اور کھائیاں کھودی جائیں اور ان میں آگ دہکائی جائے۔ جب لشکریوں نے تعمیل کر دی تو اس نے شہریوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ جو شخص یہودیت قبول کرنے سے انکار کرے مرد ہو یا عورت یا بچہ اس کو زندہ آگ میں ڈال دیا جائے۔
چنانچہ اس حکم کے مطابق بیس ہزار کے قریب اہل ایمان کو جام شہادت پینا پڑا۔

حدیث کی کتابوں مسلم، نسائی، ترمذی اور مسند احمد میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے اسی طرح کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ اس جاں گسل اور ہولناک نظارے کو بادشاہ اور اس کے مصاحبین مسرت کے ساتھ دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت لائی گئی جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا۔ عورت بچے کی محبت میں جھجکی۔ فوراً بچے نے کہا "ماں! صبر سے کام لے اور بے خوف خندق میں کود جا اس لئے کہ بلاشبہ تو حق پر ہے اور یہ ظالم باطل پر ہیں"۔

نجران کے واقعے میں ایک شخص دوس ذو ثعلبان کسی طرح جان بچا کر بھاگ نکلا اور شام میں مقیم قیصر روم کے دربار میں پہنچ کر نجران کے حادثے کی ہوش ربا داستان سنائی۔ قیصر نے فوراً حبشہ کے بادشاہ نجاشی کو لکھا کہ وہ اس ظلم کا انتقام لے۔ حبش کی ۷۰ ہزار فوج ارباط نامی ایک جنرل کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہوئی۔ ذونواس مارا گیا۔ یہودی حکومت کا خاتمہ ہوا اور یمن حبش کی عیسائی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ یہ واقعہ ۵۲۵ء یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً پینتالیس سال پہلے پیش آیا۔

نجاشی کے جنرل ارباط نے یمن پر بیس برس حکمرانی کی۔ اس اثنا میں حبشی فوج نے بغاوت کی۔ ایک حبشی سردار ابرہہ اس باغی جماعت کا سرغنہ تھا۔ لفظ ابرہہ، ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے اور چونکہ نک کٹا تھا اس لئے الاشرم کہلاتا تھا۔ اس نے اپنے ایک غلام کے ہاتھوں جنرل ارباط کو قتل کروا دیا اور خود یمن کا گورنر بن بیٹھا۔ نجاشی کو یہ خبر پہنچی تو سخت غضب ناک ہوا اور

اس نے قسم کھائی کہ ابرہہ کا خون بہاؤں گا اور اس کے دارالحکومت کو پیروں تلے روند ڈالوں گا۔ ابرہہ نے یہ سنا تو بہت گھبرایا اور اپنے جسم سے کچھ خون نکال کر ایک شیشی میں بند کیا اور ایک تھیلے میں یمن کی خاک بھری اور دونوں چیزوں کو قاصد کے ہاتھ نجاشی کے پاس بھیجا اور اس کو لکھا کہ جس طرح ارباط آپ کا تابع فرمان تھا اسی طرح یہ غلام بھی ہمیشہ تابع اور مطیع رہے گا۔ جب سے میں نے یہ سنا ہے کہ حضور والا مجھ سے خفا ہیں' اس وقت سے سخت پریشان ہوں اور میں آپ کی قسم کو پورا کرنے کے لئے اپنا خون اور یمن کی خاک بھیج رہا ہوں کہ آپ اس خون کو یمن کی خاک پر ڈال کر پیروں سے روند دیجئے اور اپنی قسم پوری کر لیجئے۔ نجاشی نے ابرہہ کی معافی کو وقت کی مصلحت کے پیش نظر قبول کرتے ہوئے یمن پر اس کی گورنری کو منظور کر لیا۔

حبشی عیسائیوں نے نجران پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں کعبہ سے ملتی جلتی ایک عمارت بنائی تھی جسے وہ مکہ کے کعبے کی جگہ مرکزی حیثیت دینا چاہتے تھے۔ رومی سلطنت بھی اس "کعبے" کے لئے مالی امداد بھیجتی تھی۔ اسی کعبہ نجران کے پادری اپنے سرداروں کی قیادت میں ۹ ہجری میں مناظرے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس ملاقات کی تفصیل سورہ آل عمران کی آیت ۳۳ سے آیت ۷۱ میں مذکور ہے۔

ابرہہ نے جب یہ دیکھا کہ لوگ کسی طرح خانہ کعبہ سے منہ موڑ کر کعبہ نجران کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو اس نے یمن کے دارالحکومت صنعاء میں ایک اور عظیم الشان کلیسا تعمیر کروایا۔ یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زر و جواہر کو بے دریغ اس پر صرف کیا۔ یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوبصورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور عجیب و غریب نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مزین تھی۔ ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش منبروں اور سونے چاندی کی صلیبوں سے اس کو سجایا گیا تھا۔

صنعاء میں مقیم ایک حجازی نے جب یہ سنا کہ ابرہہ نے یہ کلیسا اس نیت سے بنایا ہے کہ خانہ کعبہ کے حاجیوں کا رخ اس کی جانب موڑ سکے تو اسے سخت غصہ آیا۔ اور تو کچھ شاید اس کے بس میں تھا نہیں' ایک رات موقعہ پا کر وہ کلیسا میں داخل ہوا اور وہاں رفع حاجت کر کے لوٹ آیا۔ ابرہہ کو جب اس کی خبر ہوئی اور تحقیق پر پتہ چلا کہ یہ کام کسی حجازی کا ہے تو غصے سے بے قابو ہو گیا اور قسم کھائی کہ اب کعبہ ابراہیمی کو برباد کئے بغیر چین سے نہ بیٹھوں گا۔ وہ ساٹھ ہزار فوج جس میں ۱۳ ہاتھی تھے' لے کر مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں دو ایک سرداروں نے اس کی راہ روکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ ابرہہ مکہ کے قریب پہنچ کر خیمہ زن ہوا تو اس کا ایک سردار اہل قریش کے بہت سے مویشی لوٹ کر لے گیا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بھی شامل تھے۔

ابرہہ نے ایلچی کے ذریعے اہل مکہ کے سرداروں سے بات کرنا چاہی تو عبدالمطلب جو اس وقت مکے کے بڑے سردار تھے' اس کے پاس آئے۔ وہ اس قدر وجیہہ اور شاندار شخص تھے کہ ابرہہ ان سے بہت متاثر ہوا اور تخت سے اتر کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ پھر پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میرے جو اونٹ پکڑ لئے گئے ہیں وہ مجھے واپس دے دیے جائیں۔ ابرہہ نے کہا کہ آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا مگر آپ کی اس بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا ہے کہ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر جو تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ باعظمت اور مقدس ہے' اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں اور انہی کے بارے میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔ رہا یہ گھر تو اس کا ایک رب ہے۔ وہ اس کی حفاظت خود کرے گا۔ ابرہہ نے جواب دیا وہ اس کو مجھ سے نہ بچا سکے گا۔ عبدالمطلب نے کہا آپ جانیں اور وہ۔ یہ کہہ کر وہ ابرہہ کے پاس سے اٹھ آئے۔ انہیں ان کے اونٹ واپس کر دیے گئے۔

لشکر گاہ سے واپس آ کر عبدالمطلب نے قریش والوں سے کہا کو وہ اپنے بال بچوں کو لے کر پہاڑوں پر چلے جائیں تاکہ انہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم میں حاضر ہوئے اور کعبے کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرما۔ اس وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت موجود تھے مگر یہ لوگ اس نازک گھڑی میں ان سب کو بھول گئے اور انہوں نے صرف اللہ کے آگے دست سوال دراز کیا۔ ان کی جو دعائیں تاریخوں میں منقول ہوئی ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ بتوں کی پرستش کا یہ جواز پیش کرتے رہے تھے کہ وہ ان کے وسیلے سے خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ دعائیں مانگ کر عبدالمطلب اور ان کے ساتھی بھی پہاڑوں پر چلے گئے اور دوسرے روز ابرہہ مکے میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا مگر اس کا خاص ہاتھی محمود جو آگے آگے تھا' یکایک بیٹھ گیا۔ اس کو بہت تیر مارے گئے' آنکس سے کچوکے دیے گئے۔ وہ زخمی ہو گیا مگر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اسے کسی اور سمت میں موڑ کر چلانے کی کوشش کی جاتی تو وہ دوڑنے لگتا لیکن مکے کی طرف موڑا جاتا تو فوراً بیٹھ جاتا۔ اتنے میں پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ' بحر احمر کی طرف سے نمودار ہوئے۔ ان کی چونچوں اور پنجوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں تھیں۔ انہوں نے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کر دی۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے اس کا جسم گلنا شروع ہو جاتا۔ کچھ روایتیں یہ ہیں کہ یہ چیچک کا مرض تھا اور بلاد عرب میں چیچک اسی سال دیکھی گئی۔ ابرہہ بھی اس سنگباری سے بری طرح زخمی ہوا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن راستے میں ہی مر گیا۔

یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان محسر کے مقام پر پیش آیا تھا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حج کے موقعے پر وہاں سے تیز تیز گذرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔ ان دنوں اہل عرب کسی مشہور واقعے کے حوالے سے دن اور سال شمار کرتے تھے۔ اصحاب الفیل کا واقعہ بجا طور پر قدرت خداوندی کا اتنا حیران کن اور ناقابل فراموش معجزہ تھا کہ عربوں نے اس سال کو عام الفیل کہنا شروع کر دیا۔ اس واقعے کے پچاس روز بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اور ٹھیک پچاس برس بعد سورہ فیل نازل ہوئی۔ اس وقت بے شمار ایسے آدمی مکہ میں موجود تھے جو اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ جنھوں نے خود یہ واقعہ نہیں دیکھا تھا' انہوں نے اپنے آباء و اجداد اور قریبی رشتہ داروں اور دوستوں سے اتنے تواتر سے سنا تھا کہ اس کے بارے میں کسی طرح کا کوئی شک انہیں لاحق نہ تھا۔

ہم جب نجران پہنچے تو پروگرام کے مطابق ملٹری ہسپتال گئے جہاں سے ایک پاکستانی ڈاکٹر جناب قیوم نے ہمارا رہنما ہونا تھا لیکن پتہ چلا کہ ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دکان اپنی بڑھا گئے

ڈاکٹر قیوم پاکستان جا چکے تھے۔ یونٹ سے روانگی اتنی غیر یقینی صورت حال اور افراتفری میں ہوئی تھی کہ سفر کے سلسلے میں بہت سے کام ادھورے رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک یہ

بھی تھا کہ ہم مختلف شہروں میں ان دوستوں سے رابطہ کرتے جنہیں مہینوں پہلے سے "شیر آیا' شیر آیا" کی وارننگ دے رکھی تھی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں ؎

سفر ہے شرط' مسافر نواز بہتیرے

ایک اور پاکستانی ڈاکٹر فضل قریشی صاحب نے ہمارا ہاتھ پکڑا۔ ایک حوالدار بطور گائیڈ ہمارے ساتھ کیا اور لنچ کی دعوت بھی دی۔

اصحاب الاخدود کی بستی پہنچے۔ گاڑی ایک جانب کھڑی کی اور ابھی بستی میں داخل ہوا ہی چاہتے تھے کہ "یا رفیق! یا رفیق" پکارتا حکومت کا ایک کارندہ ہمارے سروں پر آ مسلط ہوا اور اس بستی کو دیکھنے کے لئے وزارت داخلہ کا اجازت نامہ طلب کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ اجازت نامے وزارت داخلہ کے مرکزی دفاتر سے جاری ہوتے تھے جو خمیس مشیط سے تیرہ سو کلومیٹر دور ریاض میں واقع تھے۔ ہم وزارت کے نام اجازت نامے جاری کرنے کی درخواستیں تو ساتھ لے کر چلے تھے لیکن ریاض سے اجازت لے کر واپس نجران آنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم نے یہ مسئلہ سرکاری اہل کار کے سامنے پیش کیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ہم نے اس کی غیرت کو للکارا'

"سنا تھا کہ عرب بہت مہمان نواز ہوتے ہیں"۔

"وہ تو ہم ہیں۔ اس میں کیا شک ہے"

"یہ کیا مہمان نوازی ہے کہ سمندر پار سے آئے مہمانوں کو محض اس لئے دھتکار رہے ہو کہ ان کے پاس کاغذ کا ایک پرزہ نہیں ہے----- ٹھیک ہے۔ تمہارے نظام کے احترام میں ہم لوٹ جاتے ہیں لیکن یاد رکھنا کہ ہم قرآن کے حکم "سیروا فی الارض" (زمین پر چل پھر کر دیکھو..........) کے مطابق اس سفر پر نکلے تھے اور تم انسانوں کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ہمیں روک رہے ہو حالانکہ تم بھی تو سرکار کا حصہ ہو۔ اجازت دے سکتے ہو"۔

بات اس کے دل کو لگی۔ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ پھر بولا آؤ میرے ساتھ-------- لیکن بکری نے دودھ دیا بھی تو مینگنیاں ڈال کر۔ شرط یہ لگائی کہ کیمرہ استعمال نہیں ہو گا۔ ہم اس کی معیت میں بستی میں داخل ہوئے۔

ایک کشادہ سا راستہ تھا جس کے دونوں جانب مکانوں کی دیواریں تھیں۔ تھوڑے

تھوڑے فاصلے کے بعد بغلی گلیاں نکلتی تھیں۔ کچھ مکان تو منہدم ہو چکے تھے لیکن کچھ دیواریں ایسی تھیں جو پندرہ پندرہ سولہ سولہ فٹ بلند تھیں اور ٹھیک حالت میں ایستادہ تھیں۔ چنائی مٹی کے گارے، بھوسے اور کنکروں سے کی گئی تھی۔ کہیں کہیں پتھروں سے تراشے ہوئے مستطیل بلاک بھی استعمال کئے گئے تھے۔ کچھ بلاکوں پر مختلف تصویروں کے نقوش کھودے گئے تھے۔ ایک جگہ ایک گھوڑے اور اونٹ کی شکل بنی ہوئی تھی۔ کچھ اور دیواروں پر ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے سانپ، انسانی ہاتھ، صلیب اور شطرنج بورڈ کی ڈرائنگ دکھائی دی، جگہ جگہ انسانی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں جن پر آگ میں جلنے کے نشانات نمایاں تھے۔ ہڈیاں بالکل بھر بھری ہو چکی تھیں اور ذرا سا دبانے سے پچک جاتی تھیں۔ ایک جگہ ہم نے لکڑی کی ایک چھڑی سے زمین کو کریدا تو کوئلہ اور راکھ برآمد ہوئی۔ گائیڈ کا کہنا تھا کہ یہ وہ بستی تھی جو گڑھوں کی اس آگ ہی کی لپیٹ میں آگئی جو یہودیوں نے اہل ایمان کو جلانے کے لئے بھڑکائی تھی۔ لکڑی کے جلے ہوئے دروازے اور کھڑکیاں گائیڈ کی تصدیق کر رہے تھے۔ قرآن میں اس واقعے کی خبر دینے کے ساتھ ساتھ یہ لفظ بھی ارشاد ہوئے ہیں ''جن لوگوں نے مومن مردوں اور عورتوں پر ظلم و ستم توڑا اور پھر اس سے تائب نہ ہوئے، یقیناً ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلائے جانے کی سزا ہے''۔ (آیت ۱۰ سورہ البروج)

جہنم تو خود آگ ہی سے عبارت ہے۔ جہنم کے علاوہ جو جلائے جانے کی سزا کا ذکر ہے تو اس سے ایک مراد تو یہ ہو سکتی ہے جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ جنہوں نے مظلوم لوگوں کو آگ کے گڑھوں میں پھینک کر زندہ جلایا تھا، ان کی سزا کے لئے جہنم کی آگ عام آگ سے مختلف اور اس سے زیادہ سخت کوئی اور آگ ہو گی۔ اور ایک اور مراد شاید یہی دنیاوی سزا ہو کہ ان کی یہ بستی جلا کر خاکستر کر دی گئی۔ یہ بستی ۹۰۰X۸۰۰ میٹر کے رقبے میں واقع ہے۔ یہاں سے پتھروں اور رنگین شیشوں کے ایسے برتن دستیاب ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے باشندے سنگ تراشی اور شیشہ سازی کی صنعت کے ماہر تھے خوشبوؤں کی دھونی دینے کے لیے منقش بخورات استعمال کرتے تھے۔ پتھروں سے تراشے ہوئے برتنوں کی کنڈیوں اور پیندوں پر اور چاقوؤں اور خنجروں کے دستوں پر سبز نیلے، سرخ اور قرمزی رنگ کے شیشوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ نجران میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ایسی تین بستیاں ہیں اور ان سے برآمد ہونے

والی اشیاء کے تجزیے سے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ ایک ہی زمانے کی بستیاں ہیں۔

اور قارئین کرام! آیئے اب جغرافیائی طور پر تھوڑا سا آگے اور تاریخی لحاظ سے ذرا پیچھے کی طرف چلتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب جو روئے زمین پر وجود میں آئی وہ نجران کے قریب یمن میں برپا ہوئی۔ اس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہے، حیران کن بھی۔

فسانہ عاد و سبا

طوفان نوح کے بعد روئے زمین پر صرف وہی لوگ باقی بچے تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ان کی کشتی میں سوار تھے۔ بائبل اور اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر مغربی محققین یہ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں کہ آج کے تمام انسان حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں یعنی حام، سام اور یافث کی اولاد ہیں۔ بائبل کی کتاب پیدائش کے چھٹے سے نویں باب تک اس طوفان کا ذکر ہے۔ آٹھویں باب سے ایک اقتباس:-

"......... اور پانی زمین پر سے گھٹتے گھٹتے ایک سو پچاس دن کے بعد کم ہوا اور ساتویں مہینے کی سترھویں تاریخ کو کشتی اراراط☆ کے پہاڑوں پر ٹک گئی اور پانی دسویں مہینے تک برابر گھٹتا رہا اور دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو پہاڑوں کی چوٹیاں نظر آئیں اور چالیس دن کے بعد یوں ہوا کہ نوح علیہ السلام نے کشتی کی کھڑکی جو اس نے بنائی تھی، کھولی اور اس نے ایک

☆ قرآن میں کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ جودی بتائی گئی ہے (سورہ ہود۔ آیت ۴۴) بظاہر ان دو بیانوں میں تضاد نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اراراط سابقہ سوویت یونین کی ایک جمہوریہ "آرمینیا" میں ایک سلسلہ کوہستان کا نام ہے۔ جبل جودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جودی کے نام سے مشہور ہے اور عراق کے شمال میں کردستان کے علاقے میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرقی جانب واقع ہے۔ گویا بائبل میں سلسلہ کوہستان کا ذکر ہے اور قرآن نے خاص اس پہاڑ کا ذکر کیا جس پر حضرت نوح کی کشتی ٹھہری تھی۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے حضرت مسیح سے ڈھائی سو برس پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیراسس (BERASUS) نے پرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنے ملک کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں وہ کشتی نوح کے ٹھہرنے کا مقام جودی ہی بتاتا ہے ارسطو کا شاگرد ابیڈینوس (ABYDENUS) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے اور اپنے زمانے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جن میں پانی گھول گھول کر وہ بیماروں کو پلاتے ہیں۔

کوے کو اڑایا، سو وہ نکلا اور جب تک زمین پر سے پانی سوکھ نہ گیا، ادھر ادھر پھرتا رہا۔ پھر اس نے ایک کبوتری اپنے پاس سے اڑادی تاکہ دیکھے کہ زمین پر پانی گھٹا یا نہیں پر کبوتری نے پنجہ ٹیکنے کی جگہ نہ پائی اور اس کے پاس کشتی میں لوٹ آئی کیوں کہ تمام روئے زمین پر پانی تھا۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے لے لیا اور اپنے پاس کشتی میں رکھا اور سات دن ٹھہر کر اس نے کبوتری کو پھر کشتی سے اڑادیا اور وہ کبوتری شام کے وقت اس کے پاس لوٹ آئی اور دیکھا تو زیتون کی ایک تازہ پتی اس کی چونچ میں تھی۔ تب نوح نے معلوم کیا کہ پانی زمین پر سے کم ہو گیا۔ تب وہ سات دن اور ٹھہرا۔ اس کے بعد پھر اس کبوتری کو اڑایا پر وہ اس کے پاس پھر کبھی نہ لوٹی.......... تب خدا نے نوح سے کہا کہ کشتی سے باہر نکل آ، تو اور تیرے ساتھ تیری بیوی اور تیرے بیٹے اور تیرے بیٹوں کی بیویاں اور ان جانداروں کو بھی باہر نکال لا جو تیرے ساتھ ہیں۔ کیا پرندے، کیا چوپائے، کیا زمین کے رینگنے والے جاندار، تاکہ وہ زمین پر کثرت سے بچے دیں اور بار آور ہوں اور زمین پر بڑھ جائیں۔ تب نوح اپنی بیوی اور بیٹوں اور اپنے بیٹوں کی بیویوں کے ساتھ باہر نکلا"۔

قرآن حکیم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے علاوہ ان کی قوم کے کچھ اور افراد بھی ان کے ساتھ سوار تھے اور بعد کی انسانی نسلیں صرف نوح کی نہیں بلکہ ان سب لوگوں کی اولاد ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کشتی میں بٹھایا تھا۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۳ میں ارشاد ہے ذریۃ من حملنا مع نوح (تم ان لوگوں کی اولاد ہو جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا۔) سورہ مریم کی آیت ۵۸ میں ذکر ہے اولئک الذین انعم اللہ علیھم من النبین و من ذریتہ ادم و ممن حملنا مع نوح (یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ آدم کی اولاد میں سے اور ان لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا۔)

طوفان نوح عالمگیر طوفان تھا یا اس خاص علاقے میں آیا تھا جس میں حضرت نوح کی قوم آباد تھی۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا تھا۔ (پیدائش ۷:۱۸-۲۴) مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی

نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفان نوح سے بچالئے گئے تھے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا ہو' کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطے تک محدود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں وہ بتدریج تمام دنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اس نظریے کی تائید دو چیزوں سے ہوتی ہے ایک یہ کہ دجلہ و فرات کی سرزمین میں تو ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات سے' آثار قدیمہ سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے لیکن روئے زمین کے تمام خطوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا یقین کیا جا سکے۔ دوسرے یہ کہ روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفان عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں۔ یہ روایات یونان' مصر' ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں حتیٰ کہ برما' ملایا' جزائر شرق الہند' آسٹریلیا' نیوگنی اور امریکہ و یورپ جیسے دور دراز علاقوں کی پرانی روایات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشاندہی کرتی ہیں اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس واقعے کی حقیقی تفصیلات فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران جماعت ظہور پذیر ہوئی وہ قوم عاد تھی۔ سورہ اعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ واذ کروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح (اے عاد کے لوگو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تمہیں جانشین بنایا۔)

اس قوم کا اصل مسکن احقاف کا علاقہ تھا جو نجران سے متصل سعودی عرب کے جنوب مغرب میں واقع ہے اور آج کل یمن کا حصہ ہے۔ عاد حضرت نوح کی چوتھی نسل میں ایک شخص تھا جس کے قبیلے نے بڑی شہرت پائی۔ اہل عرب میں عاد کے بارے میں بے شمار افسانے زبان زد عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی۔

عربوں کے ہاں جب کسی چیز کو بہت قدیم کہنا ہوتا تو عادی کا لفظ استعمال کیا جاتا۔ آثار قدیمہ کو بھی عادیات کہا جاتا۔ وہ کسی ایسی عمارت کو دیکھتے جو بہت پرانی ہوتی اور اس پر نقش و نگار ہوتے اور اس کے مالک کا پتہ نہ ہوتا تو اسے عادیہ کہتے یعنی ایسی عمارت جو قوم عاد کے دنوں سے باقی ہے اردو میں لفظ عادت بھی اسی پس منظر سے وجود میں آیا یعنی ایسا طریقہ یا ایسی حرکت جس پر عاد کے دنوں سے عمل ہوتا چلا آ رہا ہو۔

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا' اکتائے ہوئے رہنا

مولانا سید سلیمان ندوی قوم عاد کا زمانہ ۲۲۰۰ قبل مسیح سے ۱۷۰۰ قبل مسیح تک متعین کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑی عظمت عطا کی تھی اور بے شمار وسائل سے نوازا تھا لیکن یہ وسائل انہوں نے لاحاصل مشغلوں میں کھپانے شروع کر دیے۔ عاد کا بیٹا شداد تخت نشین ہوا تو اس نے بڑی بڑی عمارتیں بنانے کے احکامات جاری کیے۔ پھر بھی مطمئن نہ ہوا تو دنیا میں ایک جنت کی تعمیر شروع کی۔ اپنے عاملوں کو لکھا کہ جس قدر سونا' چاندی' ہیرے' موتی' یاقوت' مشک' عنبر اور زعفران جمع کر سکتے ہو' جمع کرو اور دارالحکومت بھجواؤ۔ پھر اس نے ایک شہر آباد کیا جس کے اردگرد اور درمیان سے ایک نہر گزاری۔ اس کے کناروں پر قدرتی درختوں کے ساتھ ساتھ مصنوعی درخت لگوائے جو یاقوت و جواہر سے تراشے ہوئے مصنوعی پھلوں سے مزین تھے۔ سڑکوں پر فوارے لگوائے گئے جن سے مشک و عنبر سے معطر پانی پھوٹتا تھا اور اس کی پھوار سڑکوں پر چلنے والوں پر پڑتی تھی۔ اس شہر میں اس نے کئی محل تعمیر کروائے۔ عین درمیان میں نہر کے کنارے اپنے لئے ایک شاندار محل تعمیر کروایا جس کے دروازے سونے کے بنے ہوئے تھے اور ان پر یاقوت جڑے ہوئے تھے---------- لیکن شداد کو اس محل میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ جب یہ ارضی جنت بن کر تیار ہو گئی اور وہ ایک سجے سجائے گھوڑے پر سوار ہو کر اس جنت کا افتتاح فرمانے آیا تو عین دروازے پر گھوڑے سے اترتے ہوئے اس حالت میں اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی کہ اس کے قدم زمین سے لگنے نہ پائے تھے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عزرائیل علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ کیا

تمہیں کبھی کسی کی جان نکالتے ہوئے کسی پر ترس آیا- بتایا کہ ہاں ایک دفعہ مجھے ایک ایسی عورت کی روح قبض کرنے کا حکم ہوا جو سمندر میں ایک جہاز کی تباہی کے بعد لکڑی کے ایک تختے سے چمٹی تیر رہی تھی- ایک شیر خوار بچہ اس کا دودھ پی رہا تھا- عورت کی جان نکالتے ہوئے مجھے بچے پر بڑا ترس آیا لیکن مشیت ایزدی میں ہمارے احساسات کو کیا دخل- میں اپنا کام کر آیا-

"اور کبھی کسی کی جان نکال کر خوشی بھی ہوئی؟" سوال کیا گیا-

"ہاں- شداد کو اللہ تعالیٰ نے بڑے وسائل سے نوازا تھا- اس نے شکر کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے سرکشی اختیار کی- اللہ تعالیٰ کے مقابلے پر دنیا میں ایک جنت تعمیر کی- اس کی جان نکال کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اس جنت میں نہ رہ سکا جو اس نے اللہ تعالیٰ سے سرکشی اختیار کر کے بنائی تھی"-

"یہ وہی بچہ تھا جس پر کبھی تمہیں ترس آیا تھا"- بتایا گیا- اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں کون جان سکا ہے-

طاقت کے نشے میں مدہوش، قوم عاد کے لوگ اپنے علاقے الاحقاف سے نکلے اور گردوپیش کی کمزور قوموں پر چھا گئے- جب ان کی سرکشی بڑھ گئی تو اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث کیا جنہوں نے طرح طرح سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی- سورہ الشعراء میں ان کے ذکر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی خوشحالی کی کیا کیفیت تھی اور وہ کن خرابیوں میں مبتلا تھے- ارشاد ہوتا ہے-

"عاد نے رسولوں کو جھٹلایا- یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو- میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں- میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے- یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبار بن کر ڈالتے ہو- پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو- ڈرو اس سے جس نے وہ کچھ تمہیں دیا ہے جو تم جانتے ہو- تمہیں جانور دیئے، اولادیں دیں، باغ دیئے اور چشمے

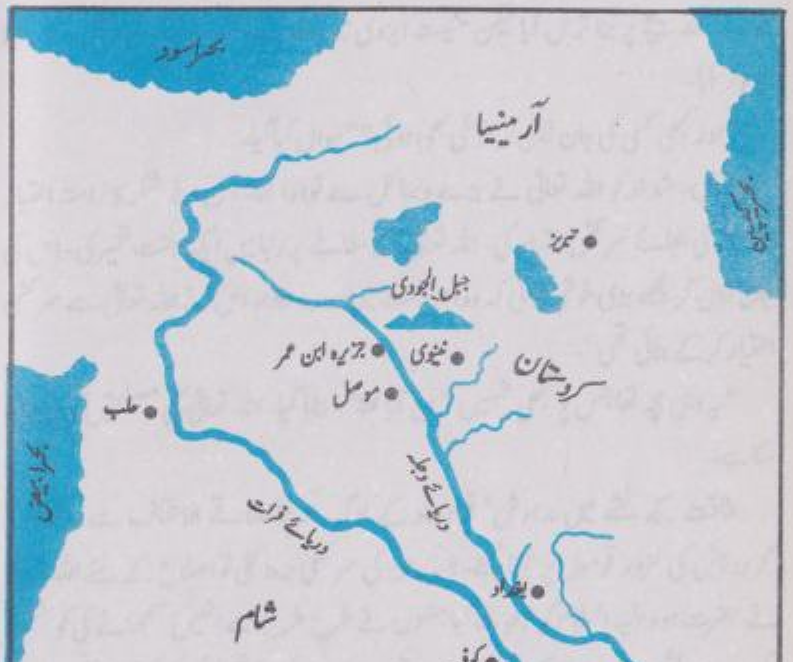

کشتی نوح کے رکنے کا مقام

دیئے۔ مجھے تمہارے حق میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے"۔ انہوں نے جواب دیا "تو نصیحت کریا نہ کر' ہمارے لئے سب یکساں ہے۔ یہ باتیں تو یوں ہی ہوتی چلی آئی ہیں اور ہم عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں"۔ آخر کار انہوں نے اسے جھٹلایا اور ہم نے ان کو ہلاک کر دیا"۔

ظاہر ہے اس کے بعد نہ وہ جنت باقی رہی جو شداد نے تعمیر کروائی تھی۔ نہ وہ باغات کہ جن کی خوشبو مشام جان کو معطر کرتی تھی۔ آج قوم عاد کے اصلی وطن الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہو گی۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ ایک لق و دق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۴۳ء میں بوریا کا ایک فوجی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ حضر موت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ ۲۵ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اس رسی کا سرا بھی گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

قوم عاد میں شداد جیسے فرعون ہی نہیں بستے تھے بلکہ نیک اور صالح لوگ بھی تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ انہی میں سے ایک شخص لقمان بھی تھا۔ لوگ انہیں حکیم لقمان کہتے ہیں اور ان سے بہت سی حکایات اور اقوال منسوب ہیں۔ کچھ روایات میں انہیں حضرت خضر کے بعد طویل ترین عمر والا شخص قرار دیا گیا ہے۔ مورخین کا کہنا ہے کہ ان کی عمر سات نسلوں تک محیط تھی۔ ان کی شخصیت عرب میں ایک حکیم و دانا کی حیثیت سے بہت مشہور تھی شعرائے جاہلیت مثلاً امراء القیس اور لبید وغیرہ کے کلام میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

اہل عرب میں بعض پڑھے لکھے لوگوں کے پاس صحیفہ لقمان کے نام سے ان کے حکیمانہ اقوال کا ایک مجموعہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ ہجرت سے تین سال

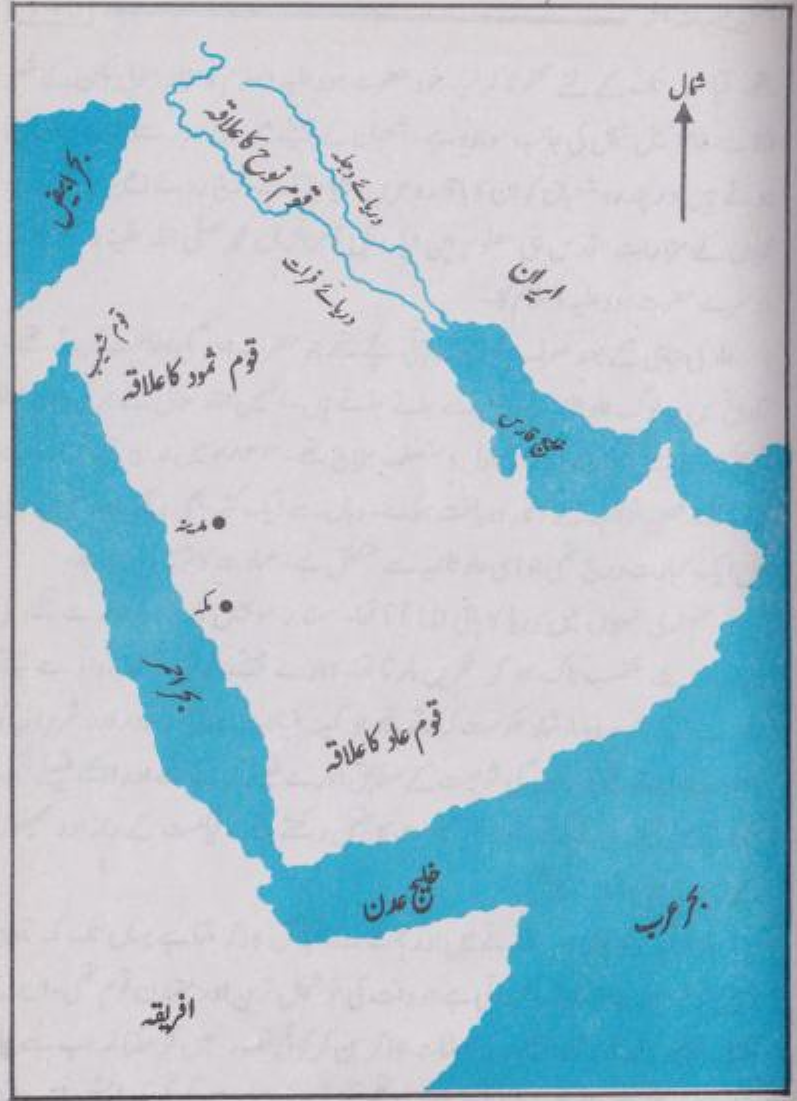

طوفانِ نوحؑ اور اِردگرد کے علاقے

پہلے مدینہ کا اولین شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متاثر ہوا وہ سوید بن صامت تھا۔ وہ حج کے لئے مکہ گئے۔ وہاں حضورؐ اپنے قاعدے کے مطابق مختلف علاقوں سے آئے ہوئے حاجیوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر دعوت اسلام دے رہے تھے۔ اس سلسلہ میں سوید نے بھی جب نبیؐ کی تقریر سنی تو اس نے کہا کہ آپ جو باتیں پیش کر رہے ہیں ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے۔ آپؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ اس نے کہا مجلہ لقمان۔ پھر آپ کی فرمائش پر اس نے اس مجلّے کا کچھ حصہ آپ کو سنایا۔ آپ نے فرمایا یہ بہت اچھا کلام ہے مگر میرے پاس ایک اور کلام اس سے بھی بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے اسے قرآن سنایا اور اس نے اعتراف کیا کہ یہ بلاشبہ مجلہ لقمان سے بہتر ہے۔ سورہ لقمان میں یوں مذکور ہے۔

"یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا۔ تو اس نے کہا' بیٹا! خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ حق یہ ہے کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے اس کی ماں نے ضعف پر ضعف اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ (اس لئے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر کر اور اپنے والدین کا شکر بجالا۔ میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔ پھر تم سب کو پلٹنا میری ہی طرف ہے۔ اس وقت میں بتادوں گا کہ تم کیسے عمل کرتے رہے ہو۔ (اور لقمان نے کہا تھا کہ) بیٹا کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو' اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے۔ بیٹا' نماز قائم کر' نیکی کا حکم دے' بدی سے منع کر اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔ اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر۔ نہ زمین پر اکڑ کر چل۔ اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ' سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے"۔

یوں اللہ تعالیٰ نے لقمان کا ذکر کہ جو اس کی بندگی اختیار کرنے والوں کی نمائندگی کرتے

تھے۔ قیامت تک کے لئے محفوظ کر لیا۔ خود حضرت ہود علیہ السلام کا مزار جنوبی یمن کے شہر مکلا سے ۱۲۵ میل شمال کی جانب موجود ہے۔ شعبان کے مہینے میں دور دور سے عرب یہاں جمع ہوتے ہیں اور پندرہ شعبان کو ان کا باقاعدہ عرس منایا جاتا ہے۔ آج روئے زمین پر صرف دو نبیوں کے مزارات مقدس ہی معلوم ہیں ایک نبی آخرالزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اور دوسرے حضرت ہود علیہ السلام کا۔

عاد کی تباہی کے بعد صرف وہی لوگ باقی بچے تھے جو حضرت ہودؑ کی اطاعت کرتے تھے۔ تاریخ میں یہ لوگ عاد ثانیہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انہیں اللہ تعالیٰ نے خوش حالی عطا فرمائی اور ایسے حکمران دیے جو عادل و منصف مزاج تھے۔ ۱۸۳۴ء میں عدن کے قریب سے ایک قلعے حصن غراب کے آثار دریافت ہوئے۔ وہاں سے ایک کتبہ بھی برآمد ہوا جس پر عربی میں ایک عبارت درج تھی جو اسی عاد ثانیہ سے متعلق ہے۔ عبارت کا ترجمہ یوں ہے۔

"ہماری نہروں میں دریا کا پانی امڈا آتا تھا۔ سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعے کی دیواروں سے غضب ناک ہو کر ٹکریں مارتا تھا۔ ہمارے چشمے خوش آئند آواز سے بہتے تھے............ ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے اور ہودؑ کی شریعت کے مطابق ہمارے فیصلے کرتے تھے اور اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے۔ قیامت کے راز اور صحیفوں کے راز پر ایمان تھا........"

عاد ثانیہ کے بعد اس علاقے میں اور بہت سے قبائل کا ذکر ملتا ہے یہاں تک کہ تاریخ ہمیں قوم سبا سے متعارف کرواتی ہے جو وقت کی خوشحال ترین اور متمدن قوم تھی۔ ان کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ اور آسائشات و عیشات کا ذکر سن کر کوئی تصور نہیں کر سکتا کہ اب سے چار ہزار برس پہلے تک انسان نے اتنی ترقی کر لی تھی کہ آج کی جدید زندگی کی آسائشیں اس وقت کی سہولتوں کے سامنے' ہیچ نظر آئیں۔ ان کی دولت کے افسانے سن سن کر اس وقت کی دو سپر پاورز' یعنی یونان اور روم والوں کے منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ قوم سبا کے لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے تھے۔ ان کے مکانوں کی چھتوں' دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت' سونے چاندی اور جواہر کا کام ہوا ہوتا تھا۔ مشہور مورخ آرٹی میڈوروس

(ARTIMIDORAS) جو ۱۰۰ قبل مسیح (یعنی سبا کے عہد آخر میں) شہر افسس (EPHESUS) کا باشندہ تھا' لکھتا ہے۔

"سبا کا بادشاہ اور اس کا ایوان مارب میں ہے جو ایک پر اشجار پہاڑ پر زمانہ خوش حالی میں واقع ہے۔ میووں کی کثرت کے سبب سے لوگ سست اور ناکارہ ہو گئے ہیں۔ خوشبودار درختوں کی جڑوں میں لیٹے پڑے رہتے ہیں۔ جلانے کی لکڑی کی بجائے دار چینی اور صندل کی خوشبودار لکڑی جلاتے ہیں"۔

یونانی مورخ اگاتھر شیڈس (AGATHERCHIDES) (۱۳۵ قبل مسیح) بیان کرتا ہے۔

"........... اندرون ملک بخورات (خوشبوؤں) دار چینی اور چھوہارے وغیرہ کے بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں۔ ان درختوں سے نہایت شیریں خوشبو پھیلتی ہے۔ درختوں کی اقسام کی کثرت تنوع کے سبب سے اس خوشبو کو کوئی نام دینا یا اس کی تعریف کرنا مشکل ہے۔ خوشبو جو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں.......... جو اشخاص اس زمین سے دور' ساحل پر سے بھی گذرتے ہیں' وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں......"

تاریخ ابن کثیر میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ اگر ایک عورت کسی موسم میں بھی سر پر ٹوکری رکھ کر باغات کے اندر سے گذر جاتی تو ہاتھ لگائے بغیر ہی اس کی ٹوکری پکے ہوئے پھلوں کے ٹپکنے سے بھر جاتی۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۵۹)

توریت میں سبا کی دولت و ثروت اور ان کے تمدن کی عظمت کے تذکرے کثرت سے ملتے ہیں۔ یسعیاہ نبی کی کتاب میں ہے'

"اے یروشلم! اونٹوں کی قطاریں تجھ پر چھا جائیں گی۔ مدین اور عیفا کی اونٹنیاں سبا سے سونا اور لوبان لے کر آئیں گی"۔

یرمیاہ نبی' بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہیں کہ'

"خدا کہتا ہے کہ جب تمہارے اعمال صحیح نہیں تو ہیکلوں میں سبا کا لوبان میرے سامنے کیوں پیش کرتے ہو۔ (۶:۲۰)"

"سبا اور عما تیرے تاجر ہیں۔ وہ عمدہ خوشبو' جواہر اور سونا تیرے بازاروں میں بیچتے ہیں"۔

(۲۷:۱۴)

انہوں نے اتنی بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کیں جو گویا اپنے وقت کے واپڈا ہاؤس یا حبیب بنک پلازا تھے۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعاء کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت (SKY SCRAPER) تعمیر کی جو قصر غمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی عرب مورخین کا بیان ہے کہ اس کی بیس منزلیں تھیں اور ہر منزل چھتیس فٹ بلند تھی۔ سب سے اوپر کی منزل نہایت بیش قیمت آبگینوں سے بنائی گئی تھی۔

قوم سبا کا عروج دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت' دوسرے تجارت۔ زراعت کو انہوں نے آبپاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعے سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظام آبپاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ (نہ ہیں) بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پہ سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنا لئے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ ہر طرف باغات نظر آتے تھے۔ قرآن حکیم میں یوں ارشاد ہے:

"بلاشبہ اہل سبا کے لئے ان کے وطن میں قدرت الٰہی کی عجیب و غریب نشانی تھی۔ دو باغوں (کا سلسلہ) دائیں اور بائیں (اور خدا نے ان کو فرمادیا تھا کہ اے سبا والو) اپنے پروردگار کی جانب سے بخشی ہوئی روزی کھاؤ اور اس کا شکر کرو کہ شہر ہے صاف ستھرا اور پروردگار ہے بخشنے والا"۔

یہ دائیں اور بائیں کے جن باغات کا ذکر کیا گیا ہے ان کا سلسلہ سینکڑوں میل تک اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ وہ خوشبودار گھنے درختوں کے سایوں تلے سے گذرتے ہوئے شمال میں فلسطین اور شام تک جا پہنچتے تھے لیکن انہیں سفر کی کلفتیں محسوس نہ ہوتی تھیں۔ اس پر شکر گذاری کا رویہ اختیار کرنے کی بجائے انہوں نے کہا "ربنا باعد بین اسفارنا" اے اللہ ہماری منزلیں طویل کردے۔ یہ کیا کہ بندہ سفر پر نکلے اور شاد کام ہی لوٹ آئے۔ اسے محسوس ہی نہ ہو کہ وہ سفر پر نکلا ہوا ہے۔

ان کے نظام آبپاشی کا سب سے بڑا مخزن آب وہ تالاب تھا جو شہر مارب کے قریب کوہ بلق

کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ ۸۰۰ قبل مسیح میں تعمیر ہوا اور شہر کی قربت کی مناسبت سے سد مارب کہلاتا تھا۔ اس کے ایک تہائی حصے کے آثار ابھی تک باقی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس بند کی تفصیلات بیان کی ہیں جن کے مطابق اس کا پہلا بانی تبع امر تھا جو آٹھویں صدی قبل مسیح کا ایک بادشاہ تھا۔ سد مارب سے جو کتبات ملے ہیں ان میں مختلف نام پڑھے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں کے بادشاہ اپنے اپنے دور میں اس کی توسیع و مرمت کرواتے رہے۔

مورخین عرب کہتے ہیں کہ قوم سبا کے انجنیئروں نے اسے ایسے تعمیر کیا تھا کہ پانی کو روکنے کے بعد موسموں کے اختلاف کے پیش نظر آبیاری کے لئے پانی کے اوپر نیچے تین درجے قائم کر دیے تھے اور ہر درجے میں تیس تیس کھڑکیاں رکھی تھیں جن کے ذریعے پانی کو کھولا اور بند کیا جاتا تھا۔ ان کے نیچے ایک بہت بڑا حوض بنایا گیا تھا جس کے دائیں بائیں دو بڑے آہنی پھاٹک تھے جن کے ذریعے حوض کا پانی تقسیم ہو کر مارب کے دونوں جانب نہروں کولوں اور جبھوں کے ذریعے حسب ضرورت کام میں آتا تھا۔ اس عظیم الشان بند کی وجہ سے تقریباً تین سو مربع میل تک دائیں اور بائیں چھواروں کے نخلستان' میوں اور پھلوں کے حسین و جمیل باغ' خوشبوؤں کے کھیت اور مرغزار' دار چینی' عود اور مختلف قسم کے خوشبودار درختوں کے گنجان باغ اس کثرت سے ہو گئے تھے کہ تمام علاقہ چمنستان اور فردوس بنا ہوا تھا۔

تجارت کے لئے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافیائی مقام عطا کیا تھا۔ یمن ایک طرف سواحل ہندوستان کے مقابل واقع ہے اور دوسری طرف سواحل افریقہ کے۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں' چین کا ریشم' انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے' مشرقی افریقہ کے زنگی غلام' بندر' شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت ٹھیک یمن میں آکر اترتے تھے خود ان کے علاقے میں لوبان' عود' عنبر' مشک' مر' قرفہ' قصب الزریرہ سلیخہ اور اسی طرح کی خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں سوداگر ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ سبا کے لوگ انہیں اونٹوں پر لاد کر بحر احمر کے کنارے خشکی خشکی حجاز سے گذر کر شام اور مصر کی منڈیوں تک پہنچاتے تھے۔ جہاں سے روم اور یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اس

راستے کو "امام مبین" کھلا راستہ اور اس سفر کا نام رحلتہ الشتاء والصیف رکھا ہے۔ ان تجارتی کاروانوں کی آمدورفت کے سبب سے یمن سے شام تک آبادیوں کی ایک قطار قائم تھی جن کے درمیان بے خوف و خطر سفر کیا جا سکتا تھا۔

اپنی عظیم الشان تجارت کے لئے وہ بحری راستے بھی استعمال کرتے تھے۔ بحری تجارت پر ایک ہزار سال تک انہی سبائیوں کی اجارہ داری رہی کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں' زیر آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس وقت اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ بحری راستے عدن اور حضر موت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ' جدہ' یثرب' العلاء' تبوک اور ایلہ سے گذرتی ہوئی پٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔

ان تمام نعمتوں کے جواب میں جب قوم سبا نے اللہ تعالیٰ سے نافرمانی اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو ان کی تجارت باقی رہی نہ زراعت۔ تجارتی راستوں پر دوسری قومیں غالب آگئیں اور زراعت اسی بند کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی جس کی تعمیر پر انہیں ناز تھا۔ ان کی ساری کی ساری انجنیئرنگ دھری کی دھری رہ گئی۔ علم ہندسہ کا فن ناکارہ ہو گیا' بند ٹوٹ گیا اور زبردست سیلاب کی طوفانی لہروں نے سارے باغات تہس نہس کر ڈالے۔ تمام وادیاں غرق آب ہو گئیں۔ جب آہستہ آہستہ پانی خشک ہوا تو پورے علاقے میں "باغوں کی جنت" کی جگہ جنگلی جھاڑیاں' کانٹے دار بیر اور ویرانی و بربادی کی تصویریں باقی رہ گئیں۔ قرآن حکیم نے اسی عبرتناک واقعے کو بیان کر کے بیدار قلب انسانوں کو یہ سبق سنایا۔

"پھر انہوں نے (قوم سبا نے) (پیغمبروں کی نصیحت سے منہ موڑ لیا تو ہم نے ان پر بند توڑ کر سیلاب بھیجا اور ان کے دونوں (طرف کے) باغوں کے بجائے بد مزہ پھلوں' پیلو اور بیری کے جھاڑ جھنکار پیدا کر دیئے۔ ناشکر گزاروں کو ہم ایسے ہی جزا دیتے ہیں اور ہم نے ان کے اور برکت والی آبادیوں (شام) کے درمیان بہت سی کھلی آبادیاں قائم کر دی تھیں اور ان میں سفر کی منزلیں مقرر کی تھیں (اور کہا تھا) چلو ان آبادیوں کی منزلوں میں دن رات' بے خوف و

خطر۔ انہوں نے کہا کہ اے ہمارے رب! ہمارے سفر دور دراز کر دے۔ انہوں نے خود اپنی جان پر ظلم کیا تو ہم نے انہیں کہانی بنا کر رکھ دیا اور انہیں پارہ پارہ کر دیا۔ اس میں عبرت کی نشانیاں ہیں شکر گزار اور صابر بندوں کے لیے"۔ (سورہ سبا۔ آیت ۲)

ملکہ سبا کے بغیر قوم سبا کا ذکر نامکمل رہے گا۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ہم عصر تھی جن کا زمانہ ۹۶۵ سے ۹۲۶ قبل مسیح متعین کیا گیا ہے۔ ملکہ سبا سے پہلے قوم سبا ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب ملکہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ قوم سبا کی اکثریت بھی مسلمان ہو گئی۔ (الناس علی دین ملوکھم) صدیوں تک انہوں نے اس امانت الٰہی کو سینے سے لگائے رکھا۔ بعد میں نہ معلوم کس وقت ان کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے چاند ستاروں کی پرستش شروع کر دی۔ المقہ (چاند دیوتا) اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اس دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اطاعت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ سارا ملک مختلف دیوتاؤں خصوصاً المقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعے پر اس کے شکریے ادا کیے جاتے تھے۔

ملکہ سبا جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے' ایک دولت مند قوم پر حکمران تھی۔ اس کے پاس تمام وہ اسباب جمع تھے جو کسی انسان کو غرور نفس میں مبتلا کر سکتے ہیں' جن چیزوں کے بل پر کوئی انسان گھمنڈ کر سکتا ہے۔ وہ ایک مشرک قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ آباؤ اجداد کی تقلید کی بنا پر اور اپنی قوم میں سرداری برقرار رکھنے کی خاطر بھی اس کے لیے شرک کو چھوڑنا مشکل تھا لیکن اس سے بھی زیادہ مشکل' دین توحید اختیار کرنا تھا لیکن جب اس پر حق واضح ہو گیا تو کوئی چیز اسے قبول حق سے نہ روک سکی کیونکہ اس کی گمراہی محض ایک مشرک ماحول میں آنکھیں کھولنے کی وجہ سے تھی۔ نفس کی بندگی اور خواہشات کی غلامی کا مرض اس پر مسلط نہ تھا' خدا کے حضور جواب دہی کے احساس سے اس کا ضمیر فارغ نہ تھا۔

اسفار یہود اور توریت میں ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ مذکور ہے۔ "سفر ایام" اور سفر ملوک میں یوں ذکر ہے۔

"جب سلیمان کا شہرہ سبا کی ملکہ تک پہنچا تو مشکل سوالوں سے وہ اس کو آزمانے آئی اور بڑی فوج اور شان و شوکت کے ساتھ یروشلم میں داخل ہوئی۔ بہت سے اونٹوں پر خوشبو کی

چیزیں' بہت سا سونا اور بیش قیمت جواہر لدے ہوئے تھے۔ وہ سلیمانؑ کے پاس آکر ٹھہری اور جو کچھ اس کے دل میں تھا' اس کی بابت اس سے گفتگو کی۔ سلیمان نے اس کے تمام سوالوں کا جواب دیا۔ سلیمان سے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی جو جواب نہ دیتا۔

سبا کی ملکہ نے جب سلیمان کی دانشمندی اور اس کے گھر کو جو اس نے بنایا تھا اور اس کے دسترخوان کے کھانوں کو اور اس کے نوکروں کی نشست و برخواست کے طریقوں کو اور ان کی پوشاک اور اس کے ساتھیوں کو اور اس سیڑھی کو جس سے وہ خدا کے مسکن پر چڑھتا تھا' دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں نے تیری دانش اور تیرے کاموں کی نسبت اپنے ملک میں جو سنا تھا وہ تحقیقی خبر تھی لیکن جب تک اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا' یقین نہیں آتا تھا لیکن جو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس کا آدھا بھی نہیں سنا تھا۔

مبارک ہیں تیرے لوگ اور مبارک ہیں تیرے نوکر جو ہمیشہ تیرے حضور کھڑے رہتے ہیں اور تیری حکمت کی باتیں سنتے ہیں۔ خداوند تیرا خدا مبارک ہو جو تجھ سے راضی ہے اور جس نے تجھ کو اسرائیل کے تخت پر بٹھایا-----

ملکہ نے ۱۲۰ قنطار سونا اور بہت سی خوشبوئیں اور قیمتی جواہر سلیمان کو دیئے۔ ملکہ نے جیسی خوشبوئیں پیش کیں' ایسی پھر کبھی نہ ملیں----- سلیمان نے سبا کی ملکہ کو جو کچھ اس نے مانگا اس سے زیادہ تحفہ دیا اور ملکہ اپنے ملازموں سمیت اپنی مملکت کو پھر گئی۔ (۲ سفر ایام باب ۹۔ ۲ ملوک باب ۱۰ بحوالہ تاریخ ارض القرآن۔ صفحہ ۲۰۹)

ترگوم (جو توریت اور تسمم کی آرامی زبان میں تفسیر ہے) کی روایت ہے۔

"سلیمان عرق انگور پی کر جب نشاط میں آتے تھے تو تمام بادشاہوں کے سامنے اپنے غلاموں کو بٹھاتے تھے اور اس وقت دنیا کی تمام زندہ مخلوقوں کو حکم دیتے تھے کہ ان کے سامنے ناچیں۔ ایک دن سلیمان نے دیکھا کہ ہدہد غائب ہے۔ (سلیمان نے حکم دیا کہ ہدہد کو حاضر کیا جائے) جب ہدہد آیا تو اس نے بیان کیا کہ تین مہینے سے وہ ادھر ادھر اڑ رہا تھا کہ کوئی ایسا ملک ملے جو اب تک حضور کے ماتحت نہیں ہے۔ آخر مشرق میں ایک ملک ملا جس پر سبا کی ملکہ حکومت کرتی ہے۔ اس ملک کی خاک سونے سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ وہاں چاندی خاک کی طرح گلیوں میں اڑتی پھرتی ہے۔ پانی وہاں جنت سے آتا ہے اور وہیں سے بن کر ہار

آتے ہیں جو لوگ پہنتے ہیں۔ اس کے ملک کے دار الحکومت کا نام قیطور ہے۔ پھر پرندے نے یہ رائے دی کہ وہ اڑ کر اس ملک کو پھر جائے گا اور وہاں کی ملکہ کو اپنے ساتھ لائے گا۔ سلیمان نے یہ تجویز پسند کی اور خط لکھ کر ہدہد کے بازو میں باندھ دیا گیا۔ ہدہد شام کے وقت جب وہ آفتاب کی عبادت کو جا رہی تھی پہنچا (یہ خط ملکہ کے حوالے کیا) ملکہ نے خط پڑھا جس میں یہ دھمکی تھی کہ فوراً میری بارگاہ میں حاضر ہو ورنہ اس کی فوج (جو جانوروں' پرندوں روحوں اور رات کے دیوؤں کی ہے) اس سے لڑنے آئے گی۔ ملکہ بہت خوفزدہ ہوئی اور اس نے بوڑھوں کی اور سرداروں کی مجلس میں مشورہ کیا لیکن یہ لوگ سلیمان سے بالکل واقف نہ تھے۔ تاہم ملکہ نے اپنے جہازوں کو بیش قیمت لکڑیوں گراں بہا جواہر اور موتیوں سے لاد کر اور چھ ہزار ایک ہی ساعت کی پیدائش اور ایک ہی قد و قامت اور ایک ہی شکل و صورت اور ایک ہی حریر سرخ کے لباس میں غلام اور لونڈیاں تحفہ بھیجیں۔ خط کے جواب میں لکھا کہ اگرچہ "قیطور" اور یروشلم کے درمیان عموماً برس کا راستہ ہے تاہم وہ تین برس میں وہاں پہنچے گی۔ سلیمان نے استقبال کے لیے ایک نوجوان کو جو صبح کی طرح خوبصورت تھا' بھیجا۔ ملکہ جب یروشلم پہنچی تو ایک شیشے کے محل میں اس سے سلیمان نے ملاقات کی۔ ملکہ نے یہ سمجھ کر کہ بادشاہ پانی میں بیٹھا ہے' پنڈلیوں سے کپڑا اٹھایا۔ سلیمان مسکرائے اور یہ دیکھ کر کہ اس کے پاؤں پر بال ہیں بولے کہ شکل تو ایک عورت کی لیکن بال مردوں کی طرح' پاؤں کے بال مردوں کی زینت ہیں لیکن عورتوں کے لیے عیب۔ ملکہ سبا نے سلیمان سے بہت سی پہیلیاں پوچھیں ------ سلیمان نے سب کے ٹھیک جواب دیئے۔"

ان عبارتوں کو پڑھنے سے یوں لگتا ہے کہ ایک ملکہ اور ایک بادشاہ کے درمیان اپنی شان و شوکت کے اظہار کا مقابلہ درپیش ہے۔ ملکہ اپنے زر و جواہر کی چکاچوند سے بادشاہ کی آنکھیں خیرہ کرنا چاہتی ہے اور اپنے ملک سے روانہ بھی ہوتی ہے۔ تو محض "نیلام گھر" میں شرکت کے لئے (......... اور وہ بہت سے سوالوں سے اسے آزمانے آئی) میزبان کے ہاں پہنچتی ہے اور متاثر ہوتی ہے تو اس کے جاہ و حشم سے اس کے شیش محل سے اور اس کے باادب خدام' خدمت گاروں' نوکروں چاکروں سے گویا اس واقعے کی اصل روح دنیاوی عز و جاہ اور مال و دولت کا مظاہرہ تھا یا دوسرے لفظوں میں وہی "ایک تھا راجہ' ایک تھی رانی" والی عام سی

کہانی ہے۔ جس میں افسانوں کا رنگ بھر دیا گیا ہے ------ اس کے مقابلے میں قرآن پڑھیں تو زبان و بیان کی عظمت اپنی جگہ لیکن پورے واقعے کی اصل روح صاف طور پر یہ نظر آتی ہے کہ خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر' تمام تر قوت قاہرہ کا مالک ہونے کے باوجود' اللہ تعالیٰ کے شکر گذار بندے کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے اسی کے پیام کا پرچار چاہتا ہے۔ ملکہ بھی اس کے اسی پیام سے متاثر ہوتی ہے۔ اور بالآخر پکار اٹھتی ہے۔ "میں نے اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کی۔" اس کا ایک ادنیٰ کارکن ایک دور دیس کی رپورٹ دیتا ہے تو جانتا ہے کہ اس کے مالک کی اصل دلچسپی کیا ہے اس لئے وہ یہ نہیں کہتا کہ وہاں چاندی بصورت خاک اڑتی ہے اور جنت سے آئے ہوئے سونے کے ہار لوگ پہنتے ہیں بلکہ یہ بتاتا ہے کہ وہ قوم اللہ کی بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے۔ قرآن میں مختلف مقامات پر اس واقعے کا ذکر ہے۔

سورۃ النمل سے اقتباس:۔

(ایک اور موقع پر) سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا "کیا بات ہے کہ میں فلاں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں ---- کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر دوں گا ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہو گی۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے آکر کہا "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمران ہے۔ اس کو ہر طرح کا ساز و سامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے" ------ شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوشنما بنا دیے اور انہیں شاہراہ (ہدایت) سے روک دیا۔ اس وجہ سے وہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں جو عرش عظیم کا مالک ہے۔

سلیمان علیہ السلام نے کہا "ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا رد عمل ظاہر کرتے ہیں"۔

ملکہ بولی "اے اہل دربار' میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمان علیہ السلام کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ"۔

(خط سنا کر) ملکہ نے کہا "اے سرداران قوم' میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو۔ میں کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں"۔ انہوں نے جواب دیا "ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے"۔ ملکہ نے کہا "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں"۔

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان علیہ السلام کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"۔

سلیمان علیہ السلام نے کہا' "اے اہل دربار' تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں۔ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا' میں اسے حاضر کر دوں گا' قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔" جس شخص کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بولا' "میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں"۔ جونہی کہ سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا' پکار اٹھا' یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے"۔

سلیمان علیہ السلام نے کہا' "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو۔ دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے"۔ ملکہ

جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی "یہ تو گویا وہی ہے۔ ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم مسلم ہو چکے تھے"۔ اس کو (ایمان لانے سے) جس چیز نے روک رکھا تھا وہ ان معبودوں کی عبادت تھی جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتی تھی کیونکہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لئے اس نے اپنے پائنچے اٹھالئے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب! (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی اور میں نے سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی"۔

ربع الخالی ---- سفر در سفر

قوم عاد کی سرزمین، ملکہ بلقیس کی سلطنت اور اصحاب الاخدود کی بستی کو دائیں ہاتھ چھوڑتے ہوئے ہم آگے بڑھے تو ربع الخالی کا عظیم صحرا ہمارے سامنے تھا۔ صحرا کا نام آتے ہی ذہن میں ریت کے ایک ایسے سمندر کا تصور ابھرتا ہے جس میں سفر کرنا دشوار اور راہ بھٹک جائیں تو منزل پر پہنچنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ سراب اور پیاس کا تصور بھی صحرا ہی سے وابستہ ہے۔ اپنے شاعروں نے صحرا جیسی ویران چیز کو بھی اپنی مطلب براری کے لیے استعمال کیا ہے اور روایتی محبوب کو گھیر گھار کر صحرا میں لا چھوڑا ہے۔

میرے خیال کے صحرا میں کھو گئے ہیں وہ
خدا کرے نہ کبھی راستہ ملے ان کو

ہمیں، خیال کے صحرا میں نہیں، بیچ بیچ کے صحرا میں سفر کرنا تھا جو دنیا کے بڑے صحراؤں میں سے ایک ہے، شمالاً جنوباً اس کی لمبائی تقریباً بارہ سو کلو میٹر ہے اور کہیں کہیں اس کی چوڑائی ساڑھے چھ سو کلو میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ کل رقبہ چار لاکھ مربع کلو میٹر کے قریب ہے جو جزیرہ نمائے عرب کا تقریباً ایک چوتھائی ہے اور اسی لحاظ سے اس کا نام ربع الخالی رکھا گیا یعنی وہ چوتھائی حصہ جو خالی ہے۔ اس کے حوالے سے ایک نمایاں ترین فیچر دہناء ہے۔ جیسے سمندر میں گرم اور سرد پانی مختلف ہوتا ہے بلکہ کہیں کہیں کھارے اور شوردار سمندر کے بیچوں بیچ میٹھے پانی کا ذخیرہ ملتا ہے۔۔ اسی طرح دہناء ہے کہ ہے تو یہ بھی ریت ہی ریت لیکن یوں سمجھ لیجئے کہ ریت کا ایک الگ دریا ہے جو ریت کے سمندر کے درمیان بہتا ہے۔ شمال میں صحرائے نفود سے شروع ہو کر ایک قوس کی شکل میں ربع الخالی سے آ کر ملتا ہے۔ کہیں کہیں اس کی چوڑائی سو کلو میٹر کے قریب ہو جاتی ہے۔ اس کی ریت نرم اور سفوف کی مانند ہوتی ہے۔ جس کے ہلال نما ٹیلوں کو ہوائیں اڑا اڑا کر مستقل جنوب کی طرف دھکیلتی رہتی ہیں گویا یہ ریت کا ایک دریا ہے جو شمال سے جنوب کی طرف بہتا ہے۔ اس کی اوپر والی سطح نم آلود محسوس ہوتی ہے۔ لیکن

پیاس کا مارا کوئی شخص اسے کھودنا شروع کرے تو پانی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اسی مناسبت سے بدو ایسے شخص کو "دہناء کی مانند" قرار دیتے ہیں جو وعدہ کر کے اسے پورا نہ کرے۔

ربع الخالی کے حوالے سے ایک انگریز ہینٹ جان فلبی کا ذکر ضروری ہے۔ یہ پیدا سیلون میں ہوا تھا۔ جوان ہوا تو کیریر کا آغاز انڈین سول سروسز میں ملازمت سے کیا۔ پنجاب میں تعینات رہا۔ عراق میں سفارتی خدمات بھی انجام دیتا رہا------ ۱۹۱۷ء میں اسے ایک برطانوی وفد کے سربراہ کے طور پر ابن سعود کے دربار میں بھیجا گیا جہاں اس نے برطانوی اثر و رسوخ بڑھانے اور برطانوی فرموں کو تیل کی تلاش کے ٹھیکے دلوانے میں اہم خدمات سرانجام دیں ----- ملازمت کے علاوہ اس نے سعودی عرب کے مختلف علاقوں کا سروے کرنے اور وہاں کے نقشے تیار کرنے میں اہم خدمات انجام دیں اس کی خواہش تھی کہ وہ ربع الخالی کو کراس کرے اور اس کے لئے وہ مسلسل حکومت سے اجازت لینے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن چونکہ راستے محفوظ نہیں تھے اور صحرا میں بسنے والے تمام قبائل نے ابن سعود کی اطاعت نہیں کی تھی، اس لیے وہ اسے ٹالتے رہے------ ۱۹۳۱ء میں خبر آئی کہ ایک اور انگریز برٹرام تھامس جو مسقط کے سلطان کے دربار سے وابستہ تھا، ربع الخالی کراس کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس نے اپنا سفر اومان کے شہر سلالہ سے شروع کیا تھا اور شمال کی طرف چلتے ہوئے پہلے وہ قطر اور پھر بحرین پہنچا------ شاہ سعود ربع الخالی کو اپنی سلطنت کا حصہ سمجھتے تھے۔ ان سے اس کی اجازت نہیں لی گئی تھی۔ انہوں نے بھی اسے محسوس کیا اور فلبی بھی اس خبر پر بڑا تلملایا۔ اس نے اصرار کر کے ربع الخالی کے سفر کی اجازت لی اور بالآخر ۱۹۳۲ء میں وہ پچیس آدمیوں کو ساتھ لے کر اس سفر پر روانہ ہوا۔ اس وقت تک وہ مسلمان ہو چکا تھا۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ مختصراً اتنا ذکر کافی ہے کہ اپنی سفارتی سرگرمیوں میں کامیابی کے لیے وہ ہر دم شاہ ابن سعود کے ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن جب وہ حج کے لیے مکہ آتے تو چونکہ خانہ کعبہ کے ارد گرد کا وہ علاقہ جو حدود حرم کہلاتا ہے، اس میں غیر مسلموں کا داخلہ منع ہے، فلبی اس عرصے میں شاہ ابن سعود سے کٹ کر رہ جاتا اور بعض اوقات اہم معاملات میں فیصلہ لینے میں تاخیر ہو جاتی۔ ایک مرتبہ اس نے شاہ ابن سعود سے اس مشکل کا ذکر کیا تو انہوں نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو وہ اسے ہر سال اپنے ساتھ لے

جایا کریں گے۔ فلبی نے بیوی سے مشورہ کرنے کی مہلت مانگی اور بعد میں بتایا کہ اس کی بیوی کو یہ تجویز منظور نہیں۔ شاہ ابن سعود نے پیشکش کی کہ اگر اس کی بیوی اسے چھوڑ دے تو وہ اسے چالیس ہزار ڈالر دینے کو تیار ہیں۔ فلبی نے نرمی سے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا اس کی بیوی اسے فروخت کرنے پر تیار نہیں ہوگی۔ تاہم تین سال بعد (۱۹۳۰ء میں) فلبی نے خود ہی مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی ------ اسے کلمہ پڑھوا کر مسلمان کیا گیا اور اسلامی نام عبداللہ فلبی رکھا گیا۔ سعودی عرب میں اسلامی تحریک کے بانی محمد بن عبدالوہاب کے ایک جانشین (محمد بن ابراہیم الشیخ) کو اس کا اتالیق مقرر کیا گیا جس نے دو ماہ تک اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کیا۔ اور ہاں ------- اسلام لانے کے بعد اس کے ختنے بھی کیے گئے اور بحالی صحت کے لیے شاہی خرچ پر اسے طائف کے پر فضا مقام پر رکھا گیا۔

تو ۱۹۳۲ء میں جب عبداللہ فلبی ربع الخالی کے سفر پر روانہ ہوا تو رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ اس نے ہفوف سے اپنے سفر کا آغاز کیا اور تین مہینوں میں وہ نجران پہنچا۔ مسافر ہونے کے ناطے اس پر روزے رکھنے کی پابندی نہ تھی لیکن اس نے رمضان کے روزے پورے کیے۔ بلکہ پورے سفر کے دوران اس نے بالکل پانی نہ پیا۔ وہ اونٹنی کے دودھ اور بغیر چینی کی چائے پر گذارہ کرتا رہا۔ پانی کی کوئی قلت نہ تھی اس کے ساتھی جانتے تھے کہ ربع الخالی میں پانی کے کنویں کہاں کہاں ہیں اور اپنی اور اپنے اونٹوں کی ضروریات کے لیے وہ وہاں سے پانی لیتے بھی رہے لیکن فلبی نے رضاکارانہ طور پر خود پر ایک پابندی عائد کر رکھی تھی جس کی رمز وہ خود ہی جانتا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ ربع الخالی کے نقشے بھی تیار کرتا رہا جو اس نے شاہ سعود کی خدمت میں پیش کیے۔ آنے والے دنوں میں ان نقشوں نے بنیاد کا کام کیا۔ اس سفر کی بدولت فلبی ہیرو بن گیا۔ شاہ ابن سعود کی طرف سے بھی اسے زبردست پذیرائی ملی اور جب وہ لندن پہنچا تو اخبارات نے بھی اسے زبردست خراج تحسین پیش کیا۔

ہمیں ربع الخالی کے سفر کے بعد لندن جانا تھا نہ صحافی ہمارے منتظر تھے۔ رمضان کا مہینہ تھا نہ اونٹوں کا سفر درپیش تھا۔ بھٹکنے کا خدشہ بھی نہیں تھا کہ ایک اچھی بھلی پکی اور چوڑی سڑک نشان منزل بھی تھی اور صحرا کی ویرانیوں کے خلاف تحفظ کی علامت بھی لیکن کیپٹن افضال کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ نجران سے گذرتے ہوئے اس نے بہت سے سٹور جھانکے۔

مختلف مشروبات سے آئس بکس بھر لیا۔ بسکٹوں کے ڈبے' ٹافیاں' سگرٹوں کی ڈبیوں کا ایک پورا ڈبہ' چیونگ گم اور جانے کیا الا بلا خرید کر اس نے ڈگی میں محفوظ کر لیں۔ کیپٹن سعید نے پچھلی سیٹ سے اچک کر ڈیش بورڈ کا جائزہ لیا اور ایک لطیفہ سنانے لگا۔

ایک آدمی ایک گاڑی خریدنے کے لئے ایک شوروم پہنچا۔ اس نے مرسیڈیز بینز کا انتخاب کیا۔ قیمت ادا کی اور اسٹیرنگ سنبھال' گاڑی لے کر چل پڑا۔ ایک دو کلو میٹر ہی گیا ہو گا کہ گاڑی رک گئی۔ اس نے بتیرے سیلف مارے' بونٹ کھول کر بیٹری چیک کی' تاروں کے کنکشن دیکھے' کوئی نقص نظر نہ آیا۔ جھنجلا کر اس نے قریبی پبلک کال آفس سے کمپنی کو فون کیا۔ ان کے ماہرین دوڑے دوڑے آئے۔ گاڑی چیک کی اور بولے آپ نے پٹرول تو ڈلوایا ہی نہیں۔ خالی گاڑی لے کر چل پڑے۔

"کیا پٹرول بالکل نہیں ہے"۔

"جی بالکل نہیں۔ ہم شوروم میں گاڑی بالکل نئی نکور کھڑی رکھتے ہیں"۔

"تو یہ یہاں تک کیسے آگئی"۔

"یہاں تک تو یہ اپنے نام کی لاج رکھنے کو چلی آئی۔ آخر غیرت بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن آپ پٹرول ڈلوا ہی لیں"۔

"اگر لطیفہ ختم ہو گیا ہو تو ہم ہنس لیں؟" کیپٹن افضال نے پوچھا۔ "نہیں۔ آپ ہنسنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بس گاڑی میں پٹرول ڈلوا لیں۔ یہ مرسیڈیز نہیں ہے کہ نام کی لاج رکھنے کو ایک دو کلومیٹر بھی چل جائے" سعید نے کہا۔

افضال لطیفے کے آغاز ہی سے اصل بات سمجھ کر کسی پٹرول پمپ کی تاک میں تھا۔ اس نے زناٹے سے گاڑی موڑی اور ایک پٹرول پمپ پر آ کھڑا ہوا۔ ٹنکی فل کروائی' ٹائروں کی ہوا پوری کی' تیل پانی چیک کیا اور پچھلی سیٹ کے مقابل کھڑے ہو کر دست بدستہ عرض پرداختہ ہوا'

"حضور! گاڑی برائے معائنہ اور سفر تیار ------- اجازت ہو تو سفر کا آغاز کیا جائے"۔

"اجازت ہے" سعید نے پوری فرعونیت سے شفقت کا مظاہرہ کیا۔

"اجازت کے بچے! سٹیرنگ سنبھال' مجھے نیند آ رہی ہے"۔ افضال نے سعید کی طرف کا

ربع الخالی اور دہنا

دروازہ کھولتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹا۔ نجران میں کھائے گئے مرغن چاول اور روست مرغ اپنا اثر دکھا رہے تھے۔ سعید خود غنودگی کے عالم میں تھا لیکن جب افضال نے اسے گھسیٹ کر باہر کھڑا کر دیا اور خود پچھلی سیٹ پر براجمان بلکہ دراز ہو گیا تو اسے سٹیرنگ سنبھالنا پڑا ---- ہماری اگلی منزل افلاج لیلیٰ تھی۔

افلاج لیلیٰ کا فاصلہ نجران سے آٹھ سو کلو میٹر کے قریب ہو گا۔ سارا سفر صحرا کے درمیان تھا۔ صحرا تو بس اب یہ نام کا رہ گیا ہے۔ سڑک نے اس کی ویرانیاں دور کر دی ہیں جس کے ساتھ ساتھ آبادیاں قائم ہو گئی ہیں اور اس کے لوازمات بھی یعنی شاپنگ سنٹر' کیفے' ریسٹورنٹ 'ہوٹل' پیٹرول پمپ' سٹور وغیرہ وغیرہ ---- یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن سعودی تو صحرا کا حلیہ بگاڑنے پر تلے ہوئے ہیں۔ صحرا کی اصل خصوصیت اس کا بے آب و گیاہ ہونا ہے یعنی جہاں پانی ہو نہ گھاس کا کوئی تنکا لیکن سعودی یہاں پانی بھی کھینچ لائے ہیں اور گھاس چھوڑ اچھی بھلی فصلیں اگانے میں مصروف ہیں۔ صحرا کی سب سے بڑی مصیبت اس کی ریت ہوتی ہے جس میں کچھ اگتا ہے نہ پنپتا ہے لیکن سعودیوں نے ملک کے دوسرے حصوں سے لا لا کر اس پر مٹی کی اچھی خاصی تہہ جما دی ہے اور آب پاشی کے لیے محوری بازو (Axial Arm) استعمال کیے ہیں۔ یہ پانچ سو میٹر لمبا ہوتا ہے اور اپنے محور پر گھومتا ہوا ایک دائرے میں فصلوں پر پانی کی پھوار برساتا رہتا ہے۔ اس ساری محنت سے سعودی عرب گندم اور دیگر اناج اگانے میں تو بلاشبہ کامیاب ہو گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس پر اٹھنے والے اخراجات فی ایکڑ پیداوار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ اگر سعودی عرب' امریکہ یا دیگر اناج پیدا کرنے والے ممالک سے گندم درآمد کرے تو اسے بہت سستی پڑ سکتی ہے۔ سعودی عرب کے دورے پر آئے ہوئے ایک امریکی وزیر کو اس ساری صورت حال پر بہت "دکھ" ہوا اور اس نے ایک بیان میں سعودی عرب کی ان کوششوں کو حماقت قرار دیا۔ سعودی عرب کے وزیر زراعت و قومی پیداوار ڈاکٹر غازی القصیبی (جو آج کل بحرین میں سعودی سفیر ہیں) نے اس کا سخت نوٹس لیا اور ایک جوابی بیان میں امریکی وزیر کو اپنے کام سے کام رکھنے کو کہا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر ملک کو اپنی ترقی کے لیے کچھ نہ کچھ قربانی تو دینا پڑتی ہے۔ سعودی عرب کو ملکی قربانی دینی پڑ رہی ہے اور ان کے لیے یہ سستا سودا ہے۔ اس پر کسی کے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھ رہے ہیں۔ اصل میں اس

معاملے میں سعودی عرب کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے۔ ربع الخالی کو زیر کاشت لانے کی کوششوں سے بہت سے لوگوں کو روزگار ملا ہے۔ قابل کاشت رقبے میں اضافہ ہوا ہے۔ ابتدائی اخراجات تو بلاشبہ زیادہ ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اخراجات کم ہوتے جائیں گے اور بالآخر فی ایکڑ پیداوار نفع آور ثابت ہو گی۔

تو ہم ربع الخالی میں سفر کر رہے تھے اور منزل افلاج لیلیٰ تھی۔ محبتوں کے مشہور زمانہ قصے والی لیلیٰ کے نام پر بسنے والا شہر اس کی کہانیوں کی طرح بڑھ رہا ہے' پھیل رہا ہے۔ افلاج کا مطلب ہے چشمے' افلاج لیلیٰ' لیلیٰ کے چشمے۔ خیال تھا کہ طویل سفر کے بعد افلاج میں قیام کیا جائے۔ اور صبح سویرے لیلیٰ اور قیس مجنوں کا گاؤں دیکھتے ہوئے ریاض چلے چلیں گے۔

پروگرام کے عین مطابق مغرب کے وقت ہم افلاج پہنچ گئے۔ سوچا قیام سے پہلے لیلیٰ اور مجنوں کے گاؤں کا حدود اربعہ دریافت کر لیں کیونکہ صبح منہ اندھیرے کوچ کا پروگرام تھا۔ اس وقت جانے کوئی بندہ ملے نہ ملے۔ مین بازار میں آئے' روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کئی لوگوں سے پوچھا کہ لیلیٰ کے گاؤں کو کون سا رستہ جاتا ہے' مجنوں کہاں کا رہنے والا تھا لیکن لوگ لیلیٰ سے واقف تھے نہ اس کے گاؤں سے وہ لیلیٰ کہ جس کی محبت امر ہو چکی تھی' جس کے قصے پوری دنیا میں پڑھے جاتے تھے' خود اپنے علاقے میں غیر معروف تھی۔

یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ خود اپنے ہاں لاعلمی اور بیگانگی کی یہی حالت ہے۔ لاہور میں چوبرجی سے روزانہ لاکھوں لوگ گزرتے ہیں۔ کتنے لوگ واقف ہیں کہ چوبرجی ان وسیع باغات کا صدر دروازہ تھا جو محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کی ادب پرور بیٹی' زیب النساء نے بڑے شوق سے بنوائے تھے۔ یہ باغات شمالاً جنوباً داتا دربار سے نواں کوٹ تک اور شرقاً غرباً چوبرجی کے پیچھے دریائے راوی تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا کل رقبہ پچیس کلومیٹر کے قریب بنتا تھا۔ چند سال پہلے تک نواں کوٹ کے پیچھے ان باغات کے کچھ آثار باقی تھے۔ روشیں تھیں' گھنے تناور درخت تھے' لکڑی کے خوبصورت منقش دروازے تھے۔ صبح شام نرم و نازک لوگ چہل قدمی کیا کرتے تھے لیکن اب یہاں کمٹی کمٹی کوٹھیاں بن گئی ہیں۔ جن پر لوہے کی سلاخوں والے گیٹ ہیں۔ جہاں پھولوں کی مہک مشام جان کو معطر کرتی تھی وہاں ایک گندہ نالہ بہتا ہے جو شہر کی گندگی کو ساتھ لئے راوی کی طرف جاتا ہے۔

چوبرجی کا صدر دروازہ اب سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے ۱۶۴۶ء (بمطابق ۱۰۵۶ھ ہجری) میں تعمیر کروایا گیا۔ پیشانی پر لکھی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ باغات زیب النساء نے (جس کا اصل نام زبیدہ بیگم تھا) میاں بائی کو بخش دیئے تھے۔ خود زیب النساء سمن آباد موڑ سے ذرا آگے ملتان روڈ کی بائیں جانب محو خواب ہے۔

اسی طرح برصغیر میں اسلامی سلطنت کا بانی شہاب الدین غوری جی ٹی روڈ پر سہاوہ کے قریب (راولپنڈی سے جہلم آتے ہوئے مین روڈ کی بائیں جانب) ابدی نیند سو رہا ہے۔ اس نے برصغیر کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ آج پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت اس لیے اسلام کے دامن پناہ میں ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کسی وقت شہاب الدین غوری کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ آج اس سے قریبی تعلق رکھنے والے بھی اس کی قبر کا کوئی اتہ پتہ نہیں رکھتے۔ جنرل شیر علی نے اس کی قبر کی تک سک درست کر کے مقبرے کی تعمیر کا اہتمام کیا اور ایک کتبہ لگوایا جس پر یہ شعر بھی درج ہے۔

اپنے بھی جس کو بھول گئے تھوڑی دیر میں
وہ شیر دفن ہے اسی مٹی کے ڈھیر میں

تو ہم نے کئی لوگوں سے لیلیٰ کے بارے میں پوچھا۔ کچھ لوگ ناراض بھی ہوئے کہ سعودی معاشرے میں کسی خاتون کے حوالے سے کوئی گھر تلاش کرنا نہ صرف معیوب ہے بلکہ لوگوں کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف بھی۔ چنانچہ ہم کبھی لیلیٰ کی بات کرتے، کبھی مجنوں کی۔ نوجوان شرارت بھری مسکراہٹوں سے پوچھتے "کون سی لیلیٰ؟" لیلیٰ کا تعارف کراتے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوتا کہ لیلیٰ حال کی کوئی دوشیزہ نہیں بلکہ ہزار بارہ سو سال پہلے انتقال فرمانے والی کوئی مرحومہ خاتون ہے تو اور حیران ہوتے کہ اب اس کی تلاش سے فائدہ؟ کئی لوگوں نے ہمدردی کا اظہار کیا'

"کیا کوئی پاکستانی تھی؟"

"اس کی میت لینے آئے ہو؟"

ہم حیران پریشان بازار میں کھڑے تھے کہ کتابوں کی ایک دکان پر نظر پڑی۔ سوچا کہ پڑھے لکھے لوگ ہوں گے، شاید کوئی لیلیٰ کا واقف مل جائے۔ جوئندہ یابندہ وہاں واقعی ایک طالب

علم مل گیا۔ عبداللہ مبارک۔ اسم با مسمیٰ۔ ہمارے لیے وہ بڑا مبارک ثابت ہوا۔ ریاض میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ تاریخ پڑھتا تھا لیکن تھوڑا بہت جغرافیہ بھی جانتا تھا۔ ویک اینڈ پر اپنے گھر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ لیلیٰ کے نام پر کسی خاص گاؤں یا قصبے کے کوئی آثار باقی نہیں ہیں۔ وہ شاید خیموں کی کسی بستی میں رہتی ہوگی جہاں سے پانی لینے مختلف چشموں پر جاتی تھی اور اسی مناسبت سے ان کا نام افلاج لیلیٰ پڑ گیا۔ البتہ قیس مجنوں کے گاؤں کے آثار باقی ہیں۔ اس نے تفصیل سے پتہ سمجھایا۔ عبداللہ نے ڈنر کی دعوت بھی دی۔ ہم نے شکریے کے ساتھ معذرت کی۔ اس نے جو معلومات مہیا کیں وہی بہت قابل قدر تھیں۔

عبداللہ سے رخصت ہو کر کچھ دیر ہم نے آوارہ گردی فرمائی۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور شب بسری کے لیے کسی ہوٹل کے متلاشی ہوئے۔ شہر کے ہوٹل خاصے مہنگے تھے۔ کسی سستے ہوٹل کی تلاش میں شہر سے باہر نکل آئے۔ ایک ہوٹل ملا۔ اوپن ایر تھیٹر ٹائپ۔ ہوٹل کے نام پر ایک بڑا سا کمرہ تو موجود تھا لیکن ہوٹل کی ساری سرگرمیاں اس کمرے سے باہر برپا تھیں۔ سڑک کنارے، کھلے آسمان تلے چارپائیاں بچھی تھیں بلکہ چارپائی جیسا مونث لفظ اور اسم تصغیر تو ان کے لیے بالکل مناسب نہیں کہ یہ عام چارپائیوں سے تین چار گنا بڑی اور زمین سے کافی بلند تھیں۔ پایے کیا تھے لکڑی کے اچھے بھلے ستون۔ چارپائی کا مذکر جانے کیا ہے، بس یہ وہی کچھ تھے۔ ان پر گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے جن سے ٹیک لگائے اکا دکا لوگ شیشے (اس کا تفصیلی ذکر پہلے گذر چکا ہے) سے شغل فرما رہے تھے۔ ہم نے ہوٹل کے مالک سے شب بسری کے پیسے چکائے اور ایک ملازم کی مدد سے چارپائیاں یا بانوں کے تخت کمرے میں ایک کونے میں لگوا لئے کہ باہر رات بھیگ چلی تھی اور موسم خاص ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ میں سفر کے لیے ایک سلیپنگ بیگ ساتھ لے کر چلا تھا۔ افضال رضائی ساتھ لایا تھا۔ سعید نے ایک نیا کمبل خریدا تھا، ریشم ایسا ملائم۔ اب جو اس نے سفید سفید چادروں پر یہ نیا نکور کمبل پھیلایا تو اس پر بڑا رشک آیا۔ افضال نے تو فوراً رضائی سے تبادلے کی تجویز پیش کی لیکن یہ انتہائی سختی سے مسترد کر دی گئی۔

ابھی ہم اپنے بستر ترتیب ہی دے رہے تھے کہ باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دیں۔ دیکھا کہ ہوٹل کے ایک ملازم کا کسی گاہک سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ دونوں اپنے عنترے (سر پر

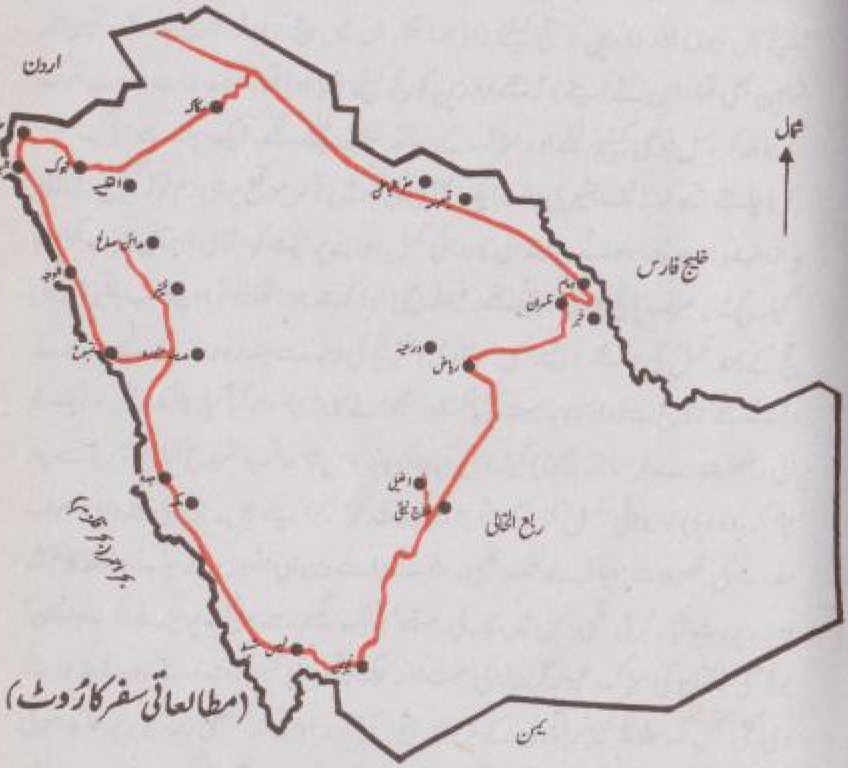

(مطالعاتی سفر کا روٹ)

استعمال کئے جانے والے رومال) اتار عقال (وہ رسی نما چیز جس سے رومال سر پر باندھتے ہیں) سے ایک دوسرے پر شانٹے برسا رہے ہیں۔ عقال کا یہ استعمال ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا۔ بڑی کثیر المقاصد چیز نظر آئی۔ کچھ لوگ انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن دونوں بپھرے ہوئے تھے اور روکنے والوں کی گرفت سے نکل نکل کر ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ ہم بستر چھوڑ چھاڑ باہر نکل آئے اور غور سے ان کے ارشادات سننے لگے کہ کسی بھی زبان میں مہارت کا دعویٰ صرف اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب آپ اس زبان کی گالیاں بھی سیکھ سکیں۔ افسوس کہ عربی گالیاں سیکھنے کا یہ شوق ادھورا ہی رہ گیا۔ ہم سراپا گوش بنے ان کے کلام پر ابھی غور ہی فرما رہے تھے۔ (مجال ہے اگر ایک لفظ بھی پلے پڑا ہو) کہ سائرن بجاتی پولیس کی دو گاڑیاں موقع واردات پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے آناً فاناً فریقین کو پکڑا اور آلہ ہائے واردات یعنی عقالوں سمیت انہیں گاڑیوں میں ڈالا اور یہ جا' وہ جا---- لوگ واپس اپنی اپنی جگہوں پر دراز ہو گئے۔ تماشائی تتر بتر ہو گئے۔ ہوٹل کا مالک بھی اپنی نشست پر بیٹھ کر شیشہ گڑگڑانے لگا۔

عجیب آدمی تھا' اس کے ملازم کو پولیس ساتھ لے گئی تھی اور وہ بیٹھا سوٹے لگا رہا تھا۔ ہم نے اس سے اظہار ہمدردی کیا اور پوچھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھنے کی بجائے اپنے ملازم کی ضمانت کا بندوبست کیوں نہیں کرتا۔

"کیا کروں؟" اس نے الٹا ہم سے پوچھا۔

"بھئی کوئی بھاگ دوڑ کرو۔ ضمانتی ڈھونڈو۔ کسی بااثر آدمی کو ساتھ لے کر تھانے جاؤ۔"

"کیوں؟"

عجیب احمق آدمی تھا۔ یا تو اسے اپنے ملازم کی کوئی پروا نہیں تھی یا پھر علاقے میں اس کی واقفیت نہیں تھی۔ لیکن دونوں باتیں غلط ثابت ہوئیں۔ ہمارے سوال جواب سے تنگ آکر اس نے بتایا کہ جھگڑے میں اس کے ملازم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ ابھی لوٹ آئے گا۔ "اتنی جلدی لوٹ آنا تھا تو بھلا پولیس اسے پکڑ کر ہی کیوں لے گئی۔" ہم نے پھر استفسار کیا۔

"ماٹش---- تحقیق کرنا پولیس کا فرض ہے۔ میرا ملازم معصوم ہے۔ ابھی لوٹ آئے گا۔"

پھر وہ شیشہ گڑگڑانے لگا۔

اپنے نظام پر اتنا بھرپور اعتماد۔ ہمارے لیے یہ ایک حیران کن بات تھی۔ اس سے پہلے بھی

ان کی پولیس اور عدالتوں کے کئی تجربے ہو چکے تھے اور ہربار خوشگوار حیرتوں کا سامنا ہوتا تھا لیکن ہم جس نظام کے پروردہ تھے اس کی یادیں ایسے ہرواقعے پر ہمیں ڈر اور خوف میں مبتلا کر دیتی تھیں۔

ایک عیدالاضحیٰ کا ذکر ہے۔ یونٹ کے افراد حج کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کئی لوگوں نے اپنے بال بچوں اور والدین کو حج کیلئے بلایا ہوا تھا۔ ان میں ہیڈ کوارٹر بیٹری کا نائک بشیر احمد شاہین بھی تھا۔ اس نے اپنے بوڑھے والدین کو حج کیلئے بلایا ہوا تھا۔ ایک رات وہ سب لوگ کھانا کھا کر چہل قدمی کیلئے نکلے اور سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک جگہ سے سڑک عبور کرنا چاہتے تھے کہ نائک بشیر کی والدہ ایک گاڑی کی زد میں آکر موقع پر ہی دم توڑ گئیں۔ انا اللہ و انا الیہ راجعون۔ حادثے کی ابتدائی کاروائی مکمل ہونے پر میت کو مقامی ہسپتال میں رکھوا دیا گیا۔ حج میں صرف پانچ چھ روز باقی تھے۔ فیصلہ یہی ہوا کہ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا اب باقی کاروائی حج کے بعد مکمل کی جائے۔ ویسے بھی سرکاری دفتر حج کی وجہ سے پندرہ روز کے لیے بند ہونے والے تھے ☆ حج سے واپسی پر میت کو پاکستان بھجوانے کا بندوبست کیا گیا۔ نائک بشیر کو ایک ماہ کی رخصت دے کر ساتھ بھجوایا گیا۔ اس کی واپسی پر کیس کا تعاقب شروع کیا۔ پولیس سے پتہ چلا کہ وہ اپنی کاروائی مکمل کر کے شریعت کورٹ کو بھجوا چکے ہیں۔ ان کی کاروائی صرف حادثے کی تفصیلات مہیا کرنے تک تھی۔ حادثے والے دن ہی انہوں نے جائے حادثہ کا نقشہ اور رپورٹ تیار کر لی تھی جس میں کار کی سمت، بریک لگنے سے سڑک پر پڑنے والے نشان، بوڑھی خاتون کی سڑک عبور کرنے کی سمت اور جگہ وغیرہ کی تفصیلات دیتے ہوئے یہ رائے دی گئی تھی کہ حادثہ تیز رفتاری کے باعث پیش آیا اور ۸۰ فیصد غلطی ڈرائیور پر عائد ہوتی ہے۔ بوڑھی خاتون سڑک زیبرا کراسنگ سے عبور نہیں کر رہی تھی اور اس نے وہ احتیاطی

☆ سعودی عرب میں سرکاری طور پر صرف دو تہوار منائے جاتے ہیں یعنی عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ جو حدیث کی رو سے مسلمانوں کے اصل تہوار ہیں۔ صرف انہی دو موقعوں پر چھٹیاں بھی ہوتی ہیں ان کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے یوم ولادت، یوم انتقال یا تخت نشینی کی یاد میں کوئی دن منایا جاتا ہے نہ چھٹی ہوتی ہے۔

تدابیر اختیار نہیں کی تھیں جو تیز رفتار ٹریفک والی سڑک پر ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں اس لیے بیس فیصد غلطی اس کی تھی۔

شریعت کورٹ سے کیس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہیں تو پتہ چلا کہ کیس وہاں سے امیر ابہا کے سیکریٹریٹ یعنی امارۃ ابہا جا چکا ہے۔ دو تین دن کے وقفے کے بعد وہاں گئے تو پتہ چلا کہ غیر ملکی ہونے کے ناتے حادثے میں فوت ہونے والی خاتون اور اس کے جائز وارث کے کوائف کی تصدیق پاکستانی سفارت خانے اور سعودی عرب کی وزارت خارجہ سے ہونا ضروری تھی اور کیس ریاض اور جدہ بھیجا جا چکا ہے۔ چند دنوں بعد شریعت کورٹ سے پتہ چلا کہ تمام لوازمات پورے ہو چکے تھے اور کیس حتمی فیصلے کے لیے قاضی مستعجلہ کو بھیجا جا چکا ہے اس کا پتہ فوری مقدمات کے جج (Speedy Trial judge) سے کیا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب کی عدالت میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے تمام شہادتوں کا جائزہ لے کر پہلے ہی پیشی کی تاریخ مقرر کر رکھی تھی۔ مقررہ تاریخ کو پیش ہوئے۔ ملزم ڈرائیور بھی موجود تھا۔ نوجوان لڑکا تھا جو وقوعے کے روز نجران یعنی ۲۴۰ کلومیٹر دور سے سیر سپاٹے کی غرض سے لانگ ڈرائیو پر نکلا تھا۔ قاضی صاحب نے معمولی پوچھ گچھ کی۔ پولیس کی شہادتوں کی روشنی میں کسی بہانے کی گنجائش نہ تھی۔ نوجوان نے اقرار جرم کیا۔ قاضی صاحب نے اسی وقت فیصلہ سنا دیا۔ ان دنوں سعودی عرب میں قتل خطا کی دیت یعنی غلطی سے کسی کو ہلاک کرنے پر معاوضے کی شرح ایک لاکھ ریال تھی۔ قاضی صاحب نے بوڑھی خاتون کے معاوضے کی شرح پچاس ہزار ریال متعین کی۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا کہ یہ نصف شرح کس بنیاد پر مقرر کی گئی تھی۔ قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا گیا تھا جس میں میراث کے بارے میں کہا گیا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے (آیت ۱۱' سورہ النساء) یا قانون شہادت کو بنیاد بنایا گیا تھا جس میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی ہے۔ چونکہ ۸۰ فیصد غلطی ڈرائیور کی اور ۲۰ فیصد غلطی خاتون کی متعین کی گئی تھی اس لیے ڈرائیور کو چالیس ہزار ریال مقتول کے وارث یعنی نائک بشیر شاہین کو ادا کرنے اور دو ماہ کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ حکم سورہ النساء کی آیت ۹۲ کے مطابق تھا جس میں کہا گیا ہے "جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا

ادا کرے ---- پھر جو غلام نہ پائے تو مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے۔"

نوجوان ڈرائیور چیک بک ساتھ لایا تھا۔ اس نے چالیس ہزار ریال کا چیک وہیں عدالت میں نائک بشیر کے حوالے کر دیا۔ عدالت سے باہر آئے تو نوجوان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم یہ سمجھے کہ اسے خطیر رقم کی ادائیگی پر افسوس ہے۔ بات چیت ہوئی تو وہ بولا "مجھے رقم کا کوئی دکھ نہیں۔ یہ خوں بہا تو ضروری تھا۔ مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔ رمضان کے روزے بمشکل پورے کرتا ہوں اور قاضی صاحب نے دو مہینوں کے روزے اور عائد کر دیئے ہیں۔"

وہ خوب سمجھتا تھا کہ قاضی کا فیصلہ قرآنی احکام کے مطابق تھا جس کی پابندی لازمی تھی۔ وہ اپنی بشری کمزوریوں سے ڈر رہا تھا۔

یہ ساری کاروائی چار مہینوں سے بھی کم عرصے میں مکمل ہو گئی۔ اس میں پندرہ دنوں کی حج کی تعطیلات اور ایک ماہ کا وہ عرصہ بھی شامل ہے جب مقدمے کا مدعی اپنی والدہ کی میت کے ساتھ پاکستان گیا ہوا تھا۔ در حقیقت بقیہ ڈھائی ماہ کی مدت بھی اس لیے زیادہ تھی کہ معاملہ دو حکومتوں کے درمیان ہونے کی وجہ سے کیس سعودی عرب کی وزارت خارجہ اور پاکستان کے سفارت خانے کو بھیجنا پڑا تھا۔ جب ضروری کاغذات مکمل ہو کر قاضی مستعجلہ کے پاس پہنچا تھا تو اس نے فیصلہ سنانے میں چار دنوں سے زائد وقت نہ لیا تھا۔

ہم اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے تھے اور ذہن میں سعودی عرب میں ہونے والے مختلف تجربات کی ایک ریل چل رہی تھی۔ ہوٹل کے مالک کی حسب توقع تھوڑی دیر بعد ہوٹل کا ملازم لوٹ آیا۔ اس نے مختصراً مالک کو تھانے میں ہونے والی کاروائی کی رپورٹ دی اور اپنے معمول کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ ذہن پھر ان واقعات کی طرف منتقل ہو گیا جن کا مشاہدہ ہم سعودی عرب میں کرتے رہے تھے۔

ایک دفعہ سڑک کنارے ایک جھگڑا دیکھا۔ فریقین بپھرے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دے رہے تھے۔ جب تک ہم گاڑی روک کر نیچے اترے اور اپنی صحافیانہ حس کے ہاتھوں مجبور "خبر" کی تفصیلات لینے قریب آئے' بہت سے لوگ بیچ بچاؤ کرنے "میدان کارزار" میں اتر چکے تھے۔ ایک سعودی کو دیکھا کہ کف اڑاتے ایک شخص کا

ہاتھ پکڑے کہہ رہا ہے'

صل علی النبیؐ۔ صل علی النبیؐ

(نبی پر درود بھیجو۔ نبی پر درود بھیجو)

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوتا ہے اور فریق ثانی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا ہے "تم اس ولد الحرام کو کیوں نہیں سمجھاتے۔ اس نے....." صل علی النبی۔ صل علی النبی۔ بیچ بچاؤ کرانے والے شخص نے اصرار کیا۔ اس نے درود پڑھا' "اللھم صل علی محمد و علی ال محمد......" اور جب نبیؐ کا ذکر اس کی زبان پر آگیا تو اس کا غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا عنترہ سر پر رکھا اور عقال لپیٹنے لگا۔ اس دوران کچھ لوگ فریق ثانی کو بھی "ٹھنڈا" کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھے۔ جب ایک نے درود پڑھا تو اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی اور درود پڑھتا ہوا مقابلے سے دستبردار ہو گیا۔ عملی زندگی میں درود کا یہ احترام اور نبیؐ کا نام لبوں پر آتے ہی اپنے جذبات کو قابو کرنے کا ایسا مظاہرہ ہم نے پہلی دفعہ دیکھا اور پھر اس کا مشاہدہ بار بار کیا اور حیران ہوتے رہے۔ سعودی عرب میں نبیؐ پاک کے نام پر جلسے ہوتے ہیں نہ جلوس نکالے جاتے ہیں۔ میلاد کی محفلیں برپا ہوتی ہیں نہ کھڑے ہو کر درود و سلام پڑھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود عام لوگ نہ صرف حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کو خوب سمجھتے ہیں بلکہ یہ تعلیمات ان کی عملی زندگی میں رچ بس گئی ہیں۔ وہ جھگڑتے ہیں تو اسی بات پر کہ جب اللہ یا اس کے رسول ﷺ سے کوئی بات ثابت ہے تو اس پر مزید بحث کیوں اور جھگڑا ختم کرتے ہیں تو اسی بات پر کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کہنا تو یہ ہے' آگے تم جانو۔

سعودی عرب میں قیام کے دوران حج کا موسم آیا تو یونٹ کے دوسرے افسروں کے ساتھ ہم بھی روانہ ہوئے۔ جدہ کے پرانے ایرپورٹ کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ عشاء کی نماز پڑھ کر باہر سڑک پر آکھڑے ہوئے اور معلم کی ان بسوں کا انتظار کرنے لگے جنہوں نے ہمیں لے کر مکہ جانا تھا۔ ہمارے ہاتھ میں چھوٹے سائز کا قرآن شریف تھا۔ جب انتظار نے طول کھینچا تو سوچا کیوں نہ مسجد میں بیٹھ کر تلاوت کر لی جائے۔ کسی ساتھی کو بتایا کہ بسیں آ جائیں تو ہمیں بلا لینا' مسجد میں بیٹھے ہیں۔ مسجد میں آئے اور قرآن شریف کھول کر تلاوت

کرنے لگے۔ محسوس ہوا کہ ایک شخص ہے جو دائیں سے چلتا ہوا ہمارے سامنے آکر رکتا ہے' پھر بائیں کو چلا جاتا ہے۔ لوٹتا ہے' ہمارے سامنے رکتا ہے اور دائیں کو نکل جاتا ہے۔ اب جو اسے غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ وہ سخت غصے کے عالم میں ہے۔ ہم یہ سمجھے کہ مسجد کا متولی ہے۔ شاید مسجد بند کر کے گھر جانا چاہتا تھا۔ ہم مسجد میں بیٹھ کر اس کی روانگی میں تاخیر کا سبب بن رہے ہیں۔ سو فیصلہ کیا کہ رکوع پورا کر لیں تو اٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اس دوران اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ ہمارے سامنے آکھڑا ہوا اور انتہائی غصے میں اس نے ہمیں بتایا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا طریقہ تو یہ تھا کہ وہ جب بھی کسی مسجد میں داخل ہوتے تھے تو اس وقت تک بیٹھتے نہیں تھے جب تک دو رکعت نماز نفل تحیۃ المسجد نہ پڑھ لیں۔ ہم نے بیٹھنے کا جواز پیش کیا۔

"کنت اقرا القرآن" (میں تو قرآن پڑھ رہا تھا) اس پر اس کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ بولا "تم اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ پارسا یا متقی ہو؟ کیا انہیں قرآن پڑھنا نہ آتا تھا جن پر نازل ہوا تھا؟ میں نے تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کی ایک حدیث سنائی ہے اور تم آگے سے بحث کرتے ہو؟" اس نے پھر حدیث کا اعادہ کیا اور بولا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا طریق کار تو یہی تھا' تمہیں بتا دیا ہے۔ عمل کرو نہ کرو تمہاری مرضی ---- اب مرضی کی گنجائش ہی کہاں باقی رہ گئی؟ ہمیں نہیں یاد کہ اس سے پہلے ہم نے کبھی تحیۃ المسجد کے نوافل پڑھے ہوں لیکن اب جب کبھی کسی مسجد میں داخل ہوں اور جماعت کھڑی ہونے میں گنجائش ہو تو ہمیں اس سیدھے سادے لیکن دین کی غیرت رکھنے والے بدو کی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ وہ اب بھی غصے کے عالم میں ٹہلتا دکھائی دیتا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ اسے عربی کے سوا کوئی اور زبان نہ آتی تھی اور اتنی دیر جو اس نے توقف کیا اور غصے میں تلملاتا رہا' شاید یہ سوچتا رہا کہ اس جاہل سے کیسے بات کروں یہ تو پاکستانی دکھائی پڑتا ہے' عربی کہاں سمجھتا ہو گا لیکن پھر شاید رسول اکرم ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے کہ بلغوا عنی ولو ایہ"۔ (تم تک مجھ سے ایک آیت بھی پہنچے تو اسے دوسروں تک پہنچا دو) وہ ہم پر عربی ہی میں برس پڑا۔ اسے کیا معلوم کہ اس کا غصہ ہم پر رحمۃ للعالمین کی رحمت کی پھوار بن کر برسا اور ایک ایسی حدیث ذہن نشین کرا گیا جو اس سے پہلے سنی تھی نہ اس پر کبھی عمل کی توفیق ہوئی تھی۔

ایک دفعہ مدینے سے مکے کی طرف آ رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہوا تو دیکھا کہ ایک بدو گاڑی کو ایک طرف کھڑا کر کے نماز کی تیاریوں میں ہے۔ ہم نے بھی گاڑی ایک طرف پارک کی اور اس بدو کے ساتھ جا ملے۔ اس نے ہمیں امامت کی پیش کش کی لیکن ہم نے تکبیر پڑھتے ہوئے اسے امام ٹھہرایا۔ مغرب کے تین فرض پڑھ کر اس نے سلام پھیرا تو پھر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ عشاء کے لیے تکبیر پڑھو۔

"عشاء کے لیے؟" ہم نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں' ہاں' عشاء کے لیے۔ عشاء کی نماز بھی ابھی پڑھ لیتے ہیں۔"

"لیکن یہ تو مغرب کا وقت ہے اور نماز کی ایک شرط یہ ہے کہ نماز کا وقت ہو جائے تب پڑھنی چاہیے"۔

"بھائی! اللہ کے رسول ﷺ کا طریق تو یہ تھا کہ جب وہ سفر پر نکلا کرتے تھے تو جمع بین الصلاتین کر لیا کرتے تھے"۔ (یعنی ظہر عصر اور مغرب عشاء کی نماز اکٹھی پڑھنا)

"لیکن..... اگر......"

"ارے! اگر مگر کیا کر رہے ہو۔ میں نے تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کا طریقہ بتایا ہے۔ دل مانتا ہے تو پڑھو تکبیر ورنہ وہ رہی تمہاری گاڑی اور وہ رہا مکے کا رستہ --- میں تو لگا ہوں عشاء کی نماز پڑھنے۔"

کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک بات بتائی بھی ہو اور اس پر عمل بھی کیا ہو۔ سو ہم نے نیت باندھی پیچھے اس امام کے اور اللہ اکبر کہہ کر عشاء کی نماز پڑھنے لگے۔

صبح آنکھ کھلی تو ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ صحرا کی راتیں ٹھنڈی ہوتی ہیں لیکن سلیپنگ بیگ بڑا کام آیا۔ گہری نیند آئی تھی اور گذشتہ دن کی ساری تھکن کافور ہو چکی تھی۔ افضال اور سعید کو آواز دی۔ افضال تو ٹس سے مس نہ ہوا البتہ سعید دوسری آواز پر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نیا نکور' ملائم' ریشمی گوٹے والا کمبل دیکھنے میں تو بھلا لگتا تھا لیکن صحرا کی سردی روکنے میں ناکام رہا تھا۔ سعید صورت پر مرمٹا تھا لیکن اب سیرت کو کوس رہا تھا۔ بندر کی بلا طویلے کے سر۔ اسے افضال پر سخت غصہ آیا جو ابھی تک خراٹے لے رہا

تھا۔ جھنجلا کر اس کی رضائی کھینچ لی۔

پہلا مسئلہ شیو کا تھا۔ ہوٹل کے حماموں اور مٹکوں میں پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ پانی کا ٹینکر تو شاید دن چڑھے آتا ہمارا پروگرام تھا کہ منہ اندھیرے ہی روانہ ہو جائیں۔ ابھی شش و پنج ہی میں مبتلا تھے کہ افضال جانے کہاں سے گرم پانی لے آیا۔ شیونگ کٹ نکالی اور افضال کی انتظامی صلاحیتوں کی داد دیتے ہوئے شیو کرنے لگے۔ ہم افضال کے اٹھنے سے پہلے ہوٹل کے تمام برتن کھنگال چکے تھے۔ ہوٹل کے آس پاس کوئی نلکا' کنواں' ندی نالہ بھی نہ تھا۔ یہ بات ابھی تک معمہ بنی ہوئی تھی کہ وہ پانی کہاں سے لایا۔ اس سے پوچھا بھی تو وہ ٹال گیا۔

"استاذی! آپ شیو کریں۔ آپ کو اس سے کیا کہ پانی کہاں سے آیا"۔

شیو شروع کی تو محسوس ہوا کہ پانی ہے ذرا مختلف قسم کا۔ ایک تو اس کی جھاگ گاڑھی گاڑھی بن رہی تھی' دوسرے چہرے پر اسے محسوس کرنے کے رنگ بھی مختلف تھے۔

"یار افضال!

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے"

سعید نے اقبال کی روح کو بے چین کرتے ہوئے افضال سے کہا "یہ کیا پانی کا صرف ایک جگ اٹھا لائے ہو۔ کہیں سے ایک بالٹی کا بندوبست کرو مجھے نیند نہیں آئی۔ نہا لوں تو ذرا تر و تازہ ہو جاؤں۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہ پانی میں کسی سمندر سے نہیں لایا۔ تم نے شعر کا استعمال بے موقع کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے شیو کا پانی لا دیا ہے۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے۔ مکھن مت لگاؤ۔ مزید پانی کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔"

"شعر میں نے ٹھیک استعمال کیا ہے۔ ہم ریت کے سمندر ہی میں سفر کر رہے ہیں۔ اقبال نے بھی یہ شعر کسی ریتلے سمندر میں سفر کرتے ہوئے خشک جھاڑیوں پر شبنم کے قطرے دیکھ کر ہی کہا ہو گا۔ سمندر کے پانی پر شبنم اول تو پڑتی نہیں' اگر پڑتی ہے تو کوئی مائی کا لال اسے اکٹھا نہیں کر سکتا۔"

دونوں میں نوک جھوک جاری رہی۔ سعید کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ پانی کے ماخذ کا پتہ چلے

تو وہ اپنے نہانے کا بندوبست کرے۔ افضال کہہ رہا تھا "دیکھو جی بھارت کا وزیراعظم اپنا پیشاب پیتا ہے اور دعوئی کرتا ہے کہ یہ صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ صحت کے لیے مفید ہو یا نہ ہو یہ بات ثابت ہے کہ کہیں سے پانی نہ مل رہا ہو تو انسان خود اپنے جسم سے پانی حاصل کر سکتا ہے۔"

"کیا آ آ آ آ"۔

ہمارے ہاتھ رک گئے۔ سخت گھن آئی اور قریب تھا کہ سعید جھاگ سے بھرا برش اور شیونگ مگ اٹھا کر افضال کے منہ پر دے مارتا کہ اس نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ جگ کا پانی وہ کچھ نہیں تھا جو ہم سمجھ رہے تھے۔

"تو پھر---؟"

"بالکل صاف پانی ہے اطمینان سے شیو کرتے رہو"۔ افضال پھر ڈھٹائی پر اتر آیا۔ سعید نے شیو مکمل کی تو دانت صاف کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ ٹوتھ پیسٹ کا ڈھکن کھول کر پیسٹ برش پر ڈالنا ہی چاہتا تھا کہ افضال چیخا'

"کیا کرنے لگے ہو"

"برش کرنے لگا ہوں"۔

"پانی کہاں ہے"

"یہ ہے نا جگ میں" نے جگ میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"یہ دانت صاف کرنے کے لیے نہیں ہے۔"

"ناپاک ہے؟"

"نہیں ناپاک بھی نہیں ہے۔" افضال نے اپنے منہ پر برش رگڑتے ہوئے کہا۔

سعید بچے کھچے پانی کا جگ لے کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں واپس آیا تو ہنس رہا تھا۔ اسے پانی کے "ماخذ" کا پتہ چل چکا تھا۔ گاڑی کی ڈگی میں آئس بکس مختلف مشروبات سے بھرا پڑا تھا۔ افضال نے سیون اپ کے پانچ چھ ٹن ایک برتن میں انڈیلے اور ہوٹل کے کچن میں گرم کر کے ہمیں "شیو کا پانی" مہیا کر دیا تھا۔ آفرین ہے بھئی۔ ایسی شاہانہ شیو ہم نے اس سے پہلے یا بعد کب کی ہوگی!

صبح کا ستارہ ابھی جھلملا رہا تھا جب ہم ہوٹل سے مجنوں کے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ افلاج لیلیٰ سے باہر نکل کر ریاض کی طرف چلیں تو بائیں جانب ایک سڑک مڑتی ہے جو "غیل" کو جاتی ہے۔ یہ موڑ مڑنے کے بعد ہم مطمئن ہو گئے کہ بس اب تھوڑی دیر میں غیل پہنچ جائیں گے کہ فاصلہ صرف پینتالیس کلومیٹر تھا۔ سعید اور اس کا کمبل موضوع گفتگو تھا۔ سعید رات کے "برفانی تجربے" کے باوجود کمبل چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ افضال کا کہنا تھا کہ اگر اس نے ضد جاری رکھی تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ کمبل کا واحد استعمال محض کفن دفن رہ جائے۔

سڑک بالکل ویران تھی اور دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتے ہوئے غیل پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگنی چاہیے تھی لیکن جب کافی دیر تک غیل نہ آیا تو تشویش ہوئی۔ ہو کا عالم تھا آدم نہ آدم زاد۔ پوچھیں تو کس سے۔ چلتے چلتے ایک ویران گاؤں جا نکلے۔ آثار بتاتے تھے کہ کبھی بھرا پرا گاؤں تھا جہاں خوش حالی کا دور دورہ ہو گا کہ بغیر چھتوں کے جو عمارتیں باقی رہ گئی تھیں ان کے ستون مضبوط بھی تھے اور نقش و نگار سے مزین بھی۔ کافی دیر ان کھنڈرات میں گھومتے رہے۔ پہلے تو اسی شبے میں مبتلا رہے کہ مجنوں کے گاؤں میں گھوم رہے ہیں لیکن پھر یاد آیا کہ افلاج لیلیٰ میں بتانے والے نے بتایا تھا کہ مجنوں کا گاؤں ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے جب کہ ان کھنڈرات کے اردگرد کسی پہاڑ کے آثار نہ تھے۔ واپس سڑک پر آئے۔

پروگرام میں ہم نے لیلیٰ کے لیے صرف ایک گھنٹہ رکھا تھا۔ قیس کی پیروی میں بس اتنی صحرا نوردی ہی گوارا تھی لیکن شاید سچی محبتوں میں وقت کی راشن بندی کبھی ہو نہیں پائی۔ جو محبتوں میں ڈوب جاتے ہیں' وقت کے دھارے ان کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ جن سے پیار ہوتا ہے ان کا ساتھ' ان کی تمنا' ان کی رفاقت' ان کی باتیں اچھی لگتی ہیں چاہے پہر بیت جائیں' چاہے صدیاں۔ انہی کی یاد' انہی کی فکر' انہی کا ذکر' سرمایہ حیات ہوتا ہے۔ اب یہ تو انسان کے ذوق پر منحصر ہے کہ اس کی محبتوں کا مرکز' اس کی چاہتوں کا محور کون ہے۔ اصل محبت تو یہی ہے کہ چاہے جانے والے کے سوا ذہن سے ہر نقش مٹ جائے' محو ہو جائے۔

کہتے ہیں صحرا میں ایک بدو نماز پڑھ رہا تھا۔ مجنوں' لیلیٰ کے فراق میں اس کے سامنے سے گذر گیا۔ اسے خبر نہ ہوئی کہ ایک نمازی مشغول عبادت ہے۔ بدو نے سلام پھیرا اور بھاگ کر

مجنوں کو جالیا' "تم میرے سامنے سے کیوں گذرے' دیکھا نہیں میں نماز پڑھ رہا تھا۔"

"تم کیسی نماز پڑھ رہے تھے۔ اللہ کے حضور حاضر تھے اور تمہیں میں نظر آ گیا۔ میں تو صرف لیلیٰ کے خیال میں گم ہوتا ہوں' مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔"

مجنوں کی محبتیں شاید ہم پر بھی نزول کر رہی تھیں کہ باوجود کوشش کے کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا کہ راہ پوچھتے۔

گھنٹوں کی آوارہ گردی کے بعد افضال نے اچانک بریک لگائی۔ دور کھیتوں میں ایک کسان کام کر رہا تھا۔ گاڑی سڑک پر چھوڑی اور پگڈنڈیوں پر چلتے اس کے پاس پہنچے۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کھانے کی دعوت دی جو ہم نے شکریے کے ساتھ مسترد کر دی اور مجنوں کے گاؤں کا پتہ پوچھا'

"ویرانہ ہے وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

"بس سچی محبتوں کی یاد میں چند لمحے وہاں گزاریں گے اور چلے جائیں گے"

کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے شانے اچکائے اور درانتی کے اشاروں سے پتہ سمجھانے لگا۔ وقت اتنا گذر چکا تھا کہ راہ گم کرنے کے مزید متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ پرانا نسخہ آزمایا اور عربوں کی روایتی میزبانی کے حوالے سے درخواست کی کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اس نے درانتی وہیں پھینکی' ہمیں سڑک کی طرف چلنے کو کہا اور خود بیٹھتے ہوئے ایک کھالے میں ہاتھ دھونے بیٹھ گیا۔ ہم سڑک پر پہنچے' مڑ کر دیکھا تو بوڑھا کسان غائب تھا۔ یا اللہ! اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ابھی اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھے کہ دور سے ایک پک اپ آتی دکھائی دی ہم اسے ہاتھ دینا ہی چاہتے تھے کہ زوردار بریک کے ساتھ وہ ہمارے قریب آ کر رکی۔ بوڑھے کسان نے کھڑکی سے منہ نکالا' بولا "میرے پیچھے پیچھے آؤ"۔ اور پھر ہوا ہو گیا۔ ہم جھپاک سے گاڑی میں بیٹھے اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ کوئی پچاس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہو گا جب پک اپ سڑک کنارے رک گئی۔ ہم بھی نیچے اتر آئے۔ کچھ دیر بعد اس نے ہمیں مجنوں کے گاؤں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ بھربھری مٹی کی بوسیدہ سی دیواریں باقی رہ گئی تھیں۔ البتہ کھجوروں کے درخت ترو تازہ تھے۔ گاؤں سے بالکل متصل ایک پہاڑ تھا جس میں ایک کھوہ نظر آ رہی تھی۔ کسان نے بتایا کہ مجنوں بس اسی کھوہ میں بیٹھا رہتا تھا۔۔۔۔۔۔ غالباً یہ سوچ کر کہ

شاید ان کھنڈرات کو دیکھ کر انہیں یہاں آنے کی "حماقت" کا احساس ہو گیا ہو گا' کسان نے اپنی پیش کش دہرائی اور کھانے کی دعوت دی۔ اس کا کھیت ریاض جانے والی سڑک سے مختلف سمت میں تھا۔ ہم نے انتہائی شکریے کے ساتھ معذرت چاہی۔ اس نے اجازت لی اور ہمیں "ہدایت" کی دعائیں دیتا رخصت ہو گیا۔ ایثار صفت' سادہ دل سیدھا سادہ کسان' احمد معجب لعان۔ اسم بامسمیٰ تھا۔ ویرانے میں اسے دیکھ کر تعجب بھی ہوا تھا اور ہمارے لیے وہ روشنی بھی ثابت ہوا تھا۔

احمد معجب چلا گیا تو افضال نے بتایا کہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس ویرانے میں دور دور کسی ہوٹل کا نام و نشان نہ تھا۔ مجنوں کے باغ میں کھجور کے درخت ایستادہ تھے۔ انہی پر چڑھ گئے۔ کھجوریں ابھی پوری طرح نہ پکی تھیں لیکن بھوک میں خوش ذائقہ لگیں۔ کون جانے کہ انہی درختوں کی کھجوریں لیلیٰ بھی کھاتی رہی ہو اور مجنوں نے بھی کتنی بار انہی سے اپنی بھوک مٹائی ہو۔

سورج اپنا نصف سے زائد سفر طے کر چکا تھا جب ہم قیس کے گاؤں سے روانہ ہوئے۔ آدھ پون گھنٹے میں واپس ہائی وے پر آ گئے۔ بائیں مڑ کر ریاض کی طرف رخ کیا۔ کچھ فاصلے پر ایک قصبہ ہے عیون۔ یہاں ایک بہت بڑی جھیل ہے۔ جو ایک گولائی میں واقع ہے۔ اس کے کنارے بالکل عمودی ہیں' کسی کنویں کی طرح۔ چند فٹ کی ڈھلوان بھی نہیں ہے۔ پانی پچاس ساٹھ فٹ نیچے ہے۔ اوپر سے جھانکتے ہوئے خوف آتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی شہاب ثاقب گرا تھا جو خود تو زمین میں دھنس گیا لیکن یہاں پانی نکل آیا۔ اس سلسلے میں ریاض میں سعودی محکمہ آثار قدیمہ میں کام کرنے والے ایک پاکستانی ڈاکٹر مجید خاں صاحب سے ملاقات بھی رہی اور خط و کتابت بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ اور علاقے کی دوسری جھیلیں شہاب ثاقب گرنے سے نہیں بنیں بلکہ قدرتی ہیں اور کئی ہزار سال سے وہاں موجود ہیں۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ اس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ قدرتی طور پر بننے والی جھیل میں کوئی دریا' ندی یا نالہ گرتا ہے تو بتدریج اپنا راستہ بناتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ راستے بدلتے رہتے ہیں اور جھیل کے اردگرد کی جگہ میں ایک تدریجی نشیب پایا جاتا ہے۔ پانی کی سطح قریبی زمین سے یک دم بہت نیچے نہیں گر جاتی جب کہ ہم جس جھیل کی بات کر رہے

ہیں اس کے کنارے بالکل عمودی اور پانی کی سطح کناروں سے پچاس ساٹھ فٹ یک لخت نیچے ہے۔ ڈاکٹر مجید خان سے ملاقات اور خط و کتابت کسی حتمی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ ان کا ایک مضمون کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ اندازے سے خط لکھا' انہیں مل گیا۔ پھر ریاض جانا ہوا تو ان سے ملاقات بھی رہی۔ بڑی دھیمی طبیعت کے آدمی ہیں۔ ڈوب کر کام کرتے ہیں۔ ہم جب پاکستان آئے تو وہ ہمپٹن ساؤ یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کرنے چلے گئے تھے۔ آج کل جانے کہاں ہیں۔ وہ یہ سطریں پڑھیں تو رابطہ کریں انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

عیون ہی کے کسی ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر روانہ ہو گئے۔ ربع الخالی کی سڑک شیطان کی آنت ثابت ہو رہی تھی کہ کسی طرح ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔

خدا خدا کر کے دلم پہنچے۔ ریاض کے جنوب مشرق میں تقریباً نوے کلومیٹر کے فاصلے پر یہ وہ جگہ ہے جہاں سعودی عرب کے موجودہ حکمران خاندان کے بانی ابن سعود نے اپنے حریف ابن رشید سے پہلی باقاعدہ جنگ لڑی۔ اس سے پہلے دونوں حریف صحرائے ربع الخالی کے کناروں پر ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ ان کے سکاؤٹوں اور گشتی دستوں میں اکا دکا جھڑپیں بھی ہوتی رہی تھیں لیکن اپنی پوری قوت کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے یہیں ٹکرائے۔ یہ ۱۹۰۲ء کے آخر کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے ابن سعود ریاض پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے لیکن ابن رشید نے انہیں درخور اعتنا ہی نہ سمجھا۔ ریاض پر قبضے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے جسے ہم آئندہ صفحات میں بیان کریں گے۔ یہاں دلم کے حوالے سے اتنا ذکر ہی کافی ہے کہ دلم کی جھڑپ کے بعد ابن رشید کو احساس ہوا کہ اس کا مقابلہ کسی لاابالی چھوکرے سے نہیں بلکہ ایک ٹھیک ٹھاک کمانڈر سے ہے۔ چنانچہ اس نے قسم کھائی کہ جب تک وہ اپنی شکست کا بدلہ لیتے ہوئے شہزادہ ابن سعود کو زیر نہ کرے گا اپنے ہیڈ کوارٹر حائل واپس نہ جائے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جب اس کے ساتھی ابن سعود کے دستوں کے حملوں کی تاب نہ لا کر شمال کی طرف پسپائی اختیار کر رہے تھے تو ان کا ایمونیشن ختم ہو چکا تھا وہ تھوڑی دیر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتے تو آج دلم کی جھڑپ مختلف لفظوں سے یاد رکھی جاتی۔

----OOOOOO----

ریاض اور درعیہ ---- آل سعود کے اہم سنگ میل

دلم سے گذر کر ہم ریاض کیا پہنچے' ایک نئی دنیا میں نکل آئے۔ سعودی عرب کا دارالحکومت ریاض' پلوں کا شہر کہلاتا ہے۔ صاف ستھری چوڑی سڑکیں جن پر ہر دم ٹریفک رواں رہتی ہے۔ مصروف سڑکوں پر پل اس طرح بنائے گئے ہیں کہ کسی چوک پر کسی گاڑی کو رکنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ریاض میں ہماری منزل ضیافۃ عسکریۃ یعنی ملٹری گیسٹ ہاؤس تھا۔ یہ گیسٹ ہاؤس سعودی فوجی حکام نے ان پاکستانی افسروں کے لئے مہیا کیا تھا جو ان کے ایک فوجی تعلیمی ادارے میں انگریزی پڑھانے پر مامور تھے۔ اس کا صرف نام معلوم تھا۔ یہ شہر کے کس حصے میں' کہاں واقع تھا' کچھ خبر نہ تھی۔ کیپٹن سعید پہلے ایک مرتبہ وہاں گئے تھے۔ لیکن حدود اربعہ بھول چکے تھے ان کا کہنا تھا کہ گاڑی لے کر مختلف شاہراہوں پر گھومتے پھرتے ہیں' شاید کوئی علامت' کوئی نشانی ایسی نظر آ جائے جس کی مدد سے وہ مطلوبہ منزل پر پہنچ سکیں۔

"تم پچھلی بار جب آئے تھے تو اس عمارت پر کوے بیٹھے ہوئے تھے؟" افضال نے وضاحت چاہی۔ سعید نے ڈانٹ پلائی۔ اصل میں افضال سعید پر طنز کر رہا تھا۔ فوج میں کسی فوجی مشق یا اصل جنگ کے دوران' کھلی جگہ میں کسی خاص جگہ کی نشاندہی کرنی ہو تو اس کا ایک باقاعدہ طریقہ ہے۔ نشاندہی کرنے والا' سیکشن کمانڈر سے لے کر بریگیڈ کمانڈر تک ہو سکتا ہے جو اپنے ماتحت یا بالا افسروں کو دشمن کے علاقے سے متعارف کروانا چاہتا ہو یا کسی خاص جگہ کے بارے میں بتانا چاہتا ہو تو اپنے بالکل قریبی علاقے میں کسی ایسے نمایاں فیچر کو چنتا ہے جس کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو سکے۔ پھر اس کے حوالے سے کسی اور عمارت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر اس سے پرے کسی اور جگہ کا حوالہ دیتا ہے اور یوں آہستہ آہستہ مطلوبہ جگہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ مثلاً اس کی ترتیب کچھ یوں ہو سکتی ہے۔

کمانڈر "سامنے گنے کا کھیت"۔

سب کہتے ہیں "seen"

"کھیت کے بائیں کنارے پر ٹیوب ویل، جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہوا ہے۔"

"seen"

"کمرے کی بائیں جانب نو بجے کی لائن میں تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر بجلی کا ایک کھمبا"۔ (ویسے سامنے بہت سے کھمبے ہو سکتے ہیں لیکن اب ایک خاص کھمبا ریفرنس پوائنٹ ہو گیا)

"seen"

اس کھمبے کے پیچھے بارہ بجے کی لائن میں تقریباً تین سو گز پیچھے درختوں کا ایک جھنڈ۔

"seen"

اس جھنڈ کے ساتھ ساتھ دائیں طرف چلیں تو ایک چھوٹی سی جھونپڑی نظر آ رہی ہے۔ جس کے درمیان میں ایک سرخ سا دھبہ ہے۔ یہ اصل میں ہماری طرف کھلنے والی ایک کھڑکی ہے جس کا پینٹ سرخ ہے"۔ دیکھنے والے دوربین استعمال کرتے ہوئے کھڑکی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر سرخ دھبہ نمایاں ہو تو وہ جواب دیں گے۔ "seen"

اصل میں یہ دشمن کی مشین گن پوسٹ ہے۔ اس پروسیجر کے درمیان اگر دیکھنے والوں کی طرف سے کسی بھی مرحلے پر Not seen کا جواب ملے تو کمانڈر پھر سے مختلف ریفرنس پوائنٹ دکھاتا ہے۔ اس طریقے کے دوران ایک اصول یہ ہے کہ متحرک پوائنٹ استعمال نہیں کئے جاتے۔ یعنی کسی چرتی ہوئے گائے، اڑتے ہوئے پرندے، گزرتی ہوئی گاڑی وغیرہ کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ کچھ دیر بعد اس کی دوبارہ نشاندہی کی ضرورت پیش آئے تو ہو سکتا ہے کہ متحرک پوائنٹ یا تو غائب ہو چکا ہو یا اپنے پہلے پوائنٹ سے کافی دور جا چکا ہو۔ (نوجوانوں کے لئے یہ ایک دلچسپ کھیل ہو سکتا ہے)

تو افضال سعید سے پوچھ رہا تھا۔

"تم پچھلی بار جب آئے تھے تو اس عمارت پر کوے بیٹھے ہوئے تھے؟"

سعید نے ڈانٹ پلائی۔ افضال کا کہنا تھا کہ سعید کو تو ڈنر کے وقت یہ یاد نہیں رہتا کہ لنچ پر کیا کھایا تھا، شہر کے رستے کیا یاد ہوں گے۔ ایک تو سفر کی تکان، اوپر سے افضال کا رواں تبصرہ۔ گیسٹ ہاؤس ہاتھ آتا تو کیوں کر۔ ہم نے ایک تجویز پیش کی۔ ہمارا بچپن کا ایک دوست دلشاد،

ریاض ہی میں مقیم تھا۔ ریڈیو، ٹیلیویژن کا مکینک تھا۔ پہلے کسی سعودی کی دکان پر ملازم تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے سعودی کو "بے دخل" کر دیا تھا اور خود دکان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ ایک لگی بندھی رقم اسے ادا کرتا تھا اور دکان کے سیاہ و سفید کا خود مالک تھا۔ ہم پہلے ایک مرتبہ اس کے ہاں جا چکے تھے اور اپنی یادداشت کے بل پر وہاں پہنچ بھی سکتے تھے۔ رہائش اس کی واجبی سی تھی۔ ہمارے لئے تو قابل قبول تھی کہ رہائش سے زیادہ بچپن کے دوست سے ملنے کی خوشی تھی۔ لیکن ساتھیوں کو شاید مایوسی ہوتی کہ انہوں نے محل نما گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کے خواب دیکھ رکھے تھے۔ طے یہ ہوا کہ وہاں چلتے ہیں۔ نہا دھو کر کچھ آرام کرتے ہیں۔ شہر کی سیر کو نکلیں گے۔ اس دوران سعید کی یادداشت نے ساتھ دیا اور گیسٹ ہاؤس کا سراغ مل گیا تو وہاں منتقل ہو جائیں گے۔

دلشاد نے کھلی بانہوں سے استقبال کیا۔ بھرپور لوازمات کے ساتھ ٹھنڈے اور گرم مشروبات پیش کئے۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے اور شہر کی سیر کو نکل گئے۔ گیسٹ ہاؤس کا سراغ بھی مل گیا۔ کئی منزلہ عمارت تھی۔ جہاں سے دور دور تک شہر اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر آتا تھا۔ شام تک وہاں شفٹ ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق دوسرے دن افضال اپنے والد کے کسی کام کے سلسلے میں شہر نکل گیا۔ ہم کیپٹن سعید کو لے کر محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائریکٹر کے دفتر گئے۔ جہاں سے مدائن صالح اور مغائر شعیب میں داخلے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا تھا۔ اس میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ دوپہر تک ہم پھر گیسٹ ہاؤس میں جمع ہو گئے۔ لنچ کے بعد درعیہ جانے کا پروگرام تھا۔

درعیہ، ریاض کے قریب ہی مٹی اور گارے کی ایک کچی بستی ہے جو چار سو سال تک خاندان سعود کی حکمرانی کے نشیب و فراز کی عینی شاہد رہی ہے۔

خاندان سعود کے آباء و اجداد میں ایک شخص تھا مانی المریدی جس کا تعلق اومان کے ایک قبیلے درا سے تھا جو اپنے تیز رفتار اونٹوں کی وجہ سے کسی حد تک آج بھی مشہور ہیں۔ وادی حنیفہ کے لوگوں نے اسے اپنے ہاں آ کر آباد ہونے کی دعوت دی تو وہ سولہویں صدی میں یہاں آیا اور اس نے ایک چھوٹی سی بستی کی بنیاد رکھی جس کا نام اپنے قبیلے کی مناسبت سے رکھا درعیہ۔ اسی کی آل اولاد میں ایک شخص تھا۔ سعود جس کے نام پر خاندان سعود کا سلسلہ نسب

چل رہا ہے۔

نسلی برتری اور دوسرے قبائل سے گہرے تعلقات کی وجہ سے خاندان سعود کو عزت کا ایک خاص مقام حاصل تھا۔ لیکن محض اس بناء پر انہیں پورے جزیرہ عرب پر حکومت کا حق نہیں مل سکتا تھا کہ اور بہت سے قبائل بھی اسی رتبہ کی عزت کے حامل تھے۔ تاہم اٹھارہویں صدی میں ایک اہم موڑ آیا جب ۱۷۴۵ء میں اسلام کے ایک عظیم مبلغ اور مصلح شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب اور درعیہ کے امیر محمد بن سعود کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ دونوں نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ عرب کو ان خرافات سے پاک کریں گے جو مذہب کے نام پر وہاں رواج پا گئی تھیں۔ طے یہ ہوا کہ خالص دین کے نفاذ اور متعلقہ امور کا اختیار محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب اور ان کے بعد ان کی اولاد کے پاس رہے گا جبکہ عنان حکومت آل سعود کے پاس رہے گی۔ اس معاہدے پر آج بھی عمل ہو رہا ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب کے جانشین آل شیخ کہلاتے ہیں اور دینی معاملات میں ان کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت کے قرب کی وجہ سے انہیں خاص اہمیت حاصل ہے۔ باہم شادیوں نے ان کے تعلق کو اور مضبوط کر دیا ہے۔ سعودی عرب کے مشہور حکمران شاہ فیصل کی والدہ بھی آل شیخ میں سے تھیں۔

محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب خالص توحید کے قائل تھے اور دین کو اس کی اصل شکل میں رائج دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ بات اسلام کے مخالفین کو بری طرح کھٹکتی تھی انہیں ہمیشہ سے یہ خطرہ لاحق رہا ہے کہ اگر مسلمانوں میں دین کی اصل روح بیدار ہو گئی تو پھر دنیا ان کے قدموں تلے ہو گی۔ محض روح اسلام کے زور پر وہ قلت تعداد و وسائل کے باوجود پوری دنیا پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب کو جن مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ان میں ایک یہ نفسیاتی پروپیگنڈا بھی تھا اور اسے فروغ دینے میں انگریزوں نے خاص کردار ادا کیا کہ محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب اور ان کے پیروکاروں کو "وہابی" کہا جانے لگا گویا انہوں نے اسلام میں کسی نئے فرقے کی بنیاد ڈالی تھی حالانکہ وہ صرف اور صرف اس بات کے قائل تھے کہ اصل دین وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کے لئے بھیجا۔ عبادات کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔ مدد صرف اسی سے مانگنی چاہیے۔

محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب اور ابن سعود نے مل کر جس جہاد کا آغاز کیا اسے زبردست کامیابی

حاصل ہوئی اور ساٹھ سال کے عرصے میں انہیں حجاز کے علاوہ مشرقی ساحلوں پر بھی تسلط حاصل ہو گیا۔ خاندان سعود کا بڑھتا ہوا اقتدار ترکوں اور انگریزوں کے لئے سخت خطرہ تھا۔ ان دنوں ترکوں کی سلطنت عثمانیہ خلافت کے حوالے سے پوری دنیا کے مسلمانوں کی نمائندہ سمجھی جاتی تھی اور اپنی اس حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں مسلمانوں کے روحانی مراکز مکہ اور مدینہ پر کنٹرول حاصل رہے۔ چنانچہ ۱۸۱۱ء میں ترکی خلیفہ نے اپنے مصر کے گورنر محمد علی کو ہدایت کی کہ وہ حجاز پر ترکوں کا اقتدار بحال کرے۔ اس کا بیٹا محمد علی پاشا سات سالوں میں اس حکم پر عمل درآمد کر سکا۔ بیس سال بعد سعودی خاندان نے پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ جو ۱۸۷۱ء تک قائم رہا۔

۱۸۷۱ء میں آل سعود کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترکوں نے مشرقی صوبے احساء پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران انہیں شمر قبیلے کے ایک نڈر، بے باک اور دلیر سردار محمد بن رشید کی صورت میں ایک حلیف بھی مل گیا جو عرصے سے سعودیوں کا حریف تھا۔ وہ شمالی علاقے حائل سے متعلق تھا۔ ۱۸۹۰ء تک محمد ابن رشید نے کئی جھڑپوں کے بعد سعودیوں کا اثر و رسوخ بالکل ختم کر کے رکھ دیا۔ سعودی خاندان کا حکمران عبدالرحمٰن ابن سعود صرف درعیہ تک محدود ہو گیا۔ وہ رشیدیوں کے رحم و کرم پر ایک اطاعت گذار گورنر بن کر رہ سکتا تھا۔ لیکن اس نے یہ گوارا نہ کیا اور اپنے بال بچوں اور چند پیروکاروں کو لے کر جلاوطن ہو گیا۔ اس وقت اس کا بیٹا عبدالعزیز صرف دس سال کا تھا۔ ہجرت کرتے ہوئے اس درماندہ قافلے کو دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا تھا کہ اس قافلے کا ایک بچہ لوٹ کر جزیرہ نمائے عرب کی مضبوط ترین اور طویل تر حکومت کی بنیاد رکھے گا۔ سعودی خاندان کی ہجرت اور ریاض واپسی کے درمیان بہت سی ایسی داستانیں پنہاں ہیں جنہیں آج سعودی عرب کے انداز ہائے حکمرانی اور خلیجی ریاستوں سے ان کے تعلقات میں گہری اہمیت حاصل ہے۔

شمر قبیلے کا سردار محمد ابن رشید اپنی وفات یعنی ۱۸۹۷ء تک نجد کا مطلق العنان حکمران رہا۔ اس نے سعودیوں سے چھینے ہوئے علاقوں میں اپنے گورنر مقرر کئے اور ترکوں کی اطاعت کے نام پر ان سے مالی امداد اور اسلحہ حاصل کرتا رہا۔

اس کی وفات پر اس کا بھتیجا عبدالعزیز الرشید تخت نشین ہوا جس کے وہم و گمان میں بھی

نہ ہو گا کہ آل سعود میں اس کا ہم نام ایک لڑکا خاموشی سے اس کے تخت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

۱۸۹۰ء میں جب آل سعود نے جلاوطنی اختیار کی تو سب سے پہلے انہوں نے بحرین میں پناہ لی۔ وہاں کے حکمران شیخ عیسیٰ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور بڑی فیاضی سے ان کی خاطر مدارات کی لیکن حکومت واپس دلانے کے لیے وہ ان کی کچھ مدد نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ چند دنوں بعد عبدالرحمٰن بن سعود نے پھر سفر اختیار کیا۔ وہ کچھ دیر قطر میں رہے۔ پھر المرہ قبیلے کے ساتھ ربع الخالی میں صحرانوردی کرتے رہے۔ جس نے نوجوان عبدالعزیز کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ پھرتے پھراتے بالآخر وہ کویت کے حکمران شیخ مبارک الصباح کے ہاں پہنچے۔
جہاں وہ دس سال تک مقیم رہے۔ (حال ہی میں کویت پر سے عراق کا قبضہ ختم کرنے کے لئے سعودی عرب نے جو بھرپور کردار ادا کیا اور امریکیوں اور دیگر ممالک کی فوجوں کو اپنی سرزمین بطور بیس (BASE) استعمال کرنے کی اجازت دی' اسے اس تناظر میں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے ورنہ مسلمان اور عرب ریاستوں کو اس کے علاوہ بھی اور بہت سے مسائل درپیش ہیں جن کے حل کے لیے کسی ملک کی طرف سے اتنا بھرپور کردار ادا نہیں کیا جاتا۔)
تو عبدالرحمٰن اور اس کا بیٹا عبدالعزیز دس سال تک کویت میں مقیم رہے۔ اسی قیام کے دوران عبدالعزیز نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ بیس سال کی عمر کو پہنچنے تک اس کا قد چھ فٹ دو انچ ہو چکا تھا۔ وہ پروقار شخصیت کا مالک تھا۔ ربع الخالی کی صحرانوردی نے اسے پہلے ہی شترسوار بنا دیا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں عبدالرحمٰن نے رشیدیوں پر بھرپور حملے کا پروگرام بنایا۔ اس نے بدو قبیلوں کے اہم سرداروں کو ساتھ ملایا اور القصیم کی طرف روانہ ہوا۔ بریدہ کے قریب سریف کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں عبدالرحمٰن اور شیخ مبارک کو بری طرح شکست ہوئی۔
عبدالعزیز الرشید نے کویت تک ان کا تعاقب کیا اور قریب تھا کہ وہ کویت پر بھی حملہ کر دیتا لیکن شیخ مبارک نے انگریزوں سے مل کر ایک گن بوٹ حاصل کر لی جس کی مدد سے رشیدیوں کے کیمپ پر گولہ باری کی گئی اور الرشید اپنے دارالحکومت حائل واپس چلا گیا۔
جنگ سریف سے پہلے یہ طے ہوا تھا کہ جب عبدالرحمٰن اور شیخ مبارک عبدالعزیز سے مڈھ بھیڑ کے لئے القصیم کی طرف بڑھیں گے تو پرنس عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن ریاض کی

طرف پیش قدمی کرے گا۔ اس کا ایک مقصد تو حریف کو دھوکے میں رکھنا تھا دوسرے یہ کہ نوجوان شہزادہ اپنے آباء و اجداد کے دارالحکومت کو واپس لینے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بھی پرکھ سکتا تھا۔ شہزادہ عبدالعزیز چھوٹی موٹی جھڑپوں میں کامیابیاں حاصل کرتا ریاض تک جا پہنچا۔ رشیدی امیر عبدالرحمان ابن ظوبیعان قلعے میں محصور ہو کر بیٹھ رہا۔ محاصرے نے طول پکڑا تو عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن نے قلعے کے نیچے سے سرنگ کھودنے کا فیصلہ کیا لیکن اسی دوران اسے اپنے والد کی شکست کی خبر موصول ہوئی۔ اس کے بعد اس کا وہاں ٹھہرنا مشکل تھا اس نے ریاض کے ممتاز شہریوں کو جمع کیا اور انہیں بتایا کہ وہ مزید کمک لینے کے لئے واپس جا رہا ہے اور عنقریب واپس آئے گا۔ اس کے بعد وہ جنوب سے ہوتا ہوا ایک لمبا چکر کاٹ کر پہلے قطر پہنچا اور بحرین ہوتے ہوئے کویت واپس آ گیا۔
اس شکست کے بعد شیخ مبارک کے ولولے ماند پڑ گئے۔ اسے سعودیوں کی فتح کی امید نہ رہی جس کا اثر یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن اور اس کے بیٹے عبدالعزیز کی آؤ بھگت میں کمی آ گئی۔ اس سے پہلے شام کی مجالس میں وہ کہیں بھی آ نکلتے تو انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا لیکن اس شکست کے بعد عبدالعزیز نے محسوس کیا کہ اس کی عزت میں واضح طور پر کمی ہو رہی ہے اور لوگ اسے وہ اعزاز نہیں دے رہے جو پہلے حاصل تھا۔ اس نے کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لئے اپنے طور پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ درعیہ اس کی پہلی منزل تھی کہ آل سعود کا دارالحکومت رہی تھی۔ اس وقت اس کے اردگرد بیس فٹ کی اونچی کچی دیوار تھی جس کے چاروں جانب بڑے بڑے دروازے تھے جو رات کو بند کر دیے جاتے۔ اندرون شہر' گلیوں کی بھول بھلیوں پر مشتمل تھا جس کے درمیان میں کھلی جگہ تھی جس میں بازار لگتا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک کشادہ مسجد تھی اور دوسری طرف وہ محل جس میں سعودی حکمران رہائش پذیر رہے تھے۔ جنگ سریف کے بعد عبدالعزیز الرشید نے یہاں کا گورنر تبدیل کر کے عجلان کو نیا حاکم مقرر کیا تھا۔ جو اس محل میں رہتا تھا۔
شہزادہ عبدالعزیز نے آخری بار شیخ مبارک سے مدد مانگی۔ اسے تیز رفتار اونٹوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس نے اپنے اصل ارادوں کا اظہار نہیں کیا کہ جنگ سریف کے بعد ریاض کی طرف کوئی مہم طفلانہ خواہش قرار دی جاتی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ صحرا کی طرف چھوٹی

موٹی مہم کا ارادہ ہے۔ شیخ مبارک نے چالیس اونٹ فراہم تو کیے لیکن یہ مریل اور دبلے پتلے اونٹ تھے۔ شہزادہ عبدالعزیز نے اپنے قریب ترین ساتھیوں کو ہمراہ لیا اور ان اونٹوں پر کویت سے روانہ ہو گیا۔ دس دنوں میں وہ ریاض کے مضافات میں پہنچ گئے۔ اس سے پہلے شہزادے نے اپنے ساتھیوں کو کچھ نہ بتایا تھا کہ کہاں کے ارادے ہیں اور کیا۔ اب اس نے انہیں اکٹھا کیا اور بتایا کہ وہ اپنے آبائی دارالحکومت کو فتح کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔ جو اس کے ساتھ رہنا چاہیں رہیں جو لوٹ جانا چاہیں انہیں جانے کی اجازت ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ چند ساتھیوں کو لے کر شہر (درعیہ) کے اندر جائے گا' اگر کامیابی ہوئی تو باقی ساتھی بھی آملیں اور صبح تک کوئی خبر نہ آئے تو جانیں بچا کر بھاگ جائیں۔

تب شہزادہ عبدالعزیز نے گنتی کے چند ساتھیوں کا انتخاب کیا اور جب رات کی تاریکی ہر سو پھیل گئی تو وہ انہیں لے کر درعیہ کی طرف بڑھا۔ لوہے کی میخوں اور رسوں کی مدد سے وہ دیوار پر چڑھے۔ شہر کے اندر بیشتر گھر اس طرح بنے ہوئے تھے کہ بیرونی فصیل ان گھروں کی عقبی دیوار بن گئی تھی۔ یہ لوگ دیوار پھاند کر جس گھر کی چھت پر اترے وہ ایک ایسے شخص کا گھر تھا جو عبدالعزیز کے والد کے محل میں ملازم رہ چکا تھا۔ اس کی بیوی نے عبدالعزیز کو گود کھلایا تھا۔ عبدالعزیز نے گھر پہچان کر اطمینان کا سانس لیا اور وہ صحن میں اتر آئے جہاں خاتون خانہ اپنی بکریوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ اس نے جب آٹھ دس آدمیوں کو یوں پراسرار طریقے سے اپنے صحن میں کودتے دیکھا تو گھبرا گئی اور پکاری "کون؟"

عبدالعزیز نے خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ خاتون کو جب پتہ چلا کہ یہ اس کے آقا عبدالرحمٰن کا بیٹا ہے جسے وہ گود کھلا چکی تھی تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو اتر آئے۔ اس نے عبدالعزیز پر واری 'صدقے ہوتے ہوئے' اپنی بکریوں کا دودھ پلانا چاہا لیکن وقت کم تھا اور صورت حال سخت گھمبیر۔ عبدالعزیز نے اصرار کیا کہ وہ اسے امیر عجلان کا پتہ بتائے۔ اس نے بتایا کہ عجلان رات قلعے کے اندر گذارتا تھا جس پر سخت پہرہ رہتا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد وہ قلعے کے مین گیٹ سے باہر نکلتا تھا اور گیٹ کے بالمقابل ایک گھر میں جاتا تھا جہاں اس کی ایک بیوی رہتی تھی۔ عجب اتفاق تھا کہ امیر عجلان کی یہ بیوی عبدالعزیز کی رضاعی بہن تھی۔ دونوں نے چھٹ پن میں ایک ہی عورت کا دودھ پیا تھا۔

عبدالعزیز اور اس کے ساتھی انتہائی خاموشی سے مختلف گلیوں سے گذرتے ہوئے محل کے قریب پہنچ گئے۔ ایک خالی مکان دیکھ کر وہ اس میں گھس گئے۔ سانسیں درست کرنے کے بعد وہ اس کی چھت پر چڑھ گئے۔ مکان ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ وہ چھتوں پر سے ہوتے ہوئے قلعے کے مین گیٹ کے سامنے عجلان کی بیوی کے گھر پہنچ گئے۔ صحن میں کودتے ہوئے ایک آدمی توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کے گرنے سے آواز پیدا ہوئی تو عجلان کی بیوی جاگ گئی اس سے پہلے کہ وہ شور مچاتی عبدالعزیز نے اسے جالیا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تنبیہہ کی۔ صبح ہونے میں کچھ دیر تھی۔ عبدالعزیز اور اس کے ساتھیوں نے امیر عجلان کی کافی سے خود اپنی میزبانی کی اور صبح اور عجلان کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ قلعہ کا بڑا دروازہ تو کافی کشادہ تھا۔ بہت سے آدمی اور اونٹ بہ یک وقت گذر سکتے تھے تاہم بغلی دروازہ اتنا چھوٹا تھا کہ ایک آدمی سر جھکا کر اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ اندر کی طرف ایک گارڈ ہوتا تھا۔ اور بآسانی ہر آنے والے کو چیک کر سکتا تھا یا غیر مطلوبہ شخص سے بآسانی نبٹ سکتا تھا۔

فجر کے بعد حسب توقع عجلان دروازے سے نمودار ہوا۔ قلعہ کے باہر کچھ گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ بجائے سیدھا اپنی بیوی کے گھر آنے کے' عجلان ان گھوڑوں کو دیکھنے لگا۔ عبدالعزیز دروازے کی درزوں سے اپنے "شکار" کو دیکھ رہا تھا۔ منصوبہ تو یہی تھا کہ گھر میں داخلے کے وقت اس پر قابو پایا جائے لیکن اسے چند فٹ کے فاصلے پر دیکھ کر شہزادہ بے تاب ہو گیا۔ نعرہ لگاتے ہوئے اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور امیر عجلان کی طرف لپکا۔ اچانک حملے کے باوجود عجلان نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور خود کو بچاتے ہوئے قلعے کے دروازے تک پہنچ گیا۔ جب وہ دروازے میں داخل ہو رہا تھا تو عبدالعزیز نے اسے ٹانگوں سے پکڑ لیا۔ اس نے اسے باہر گھسیٹنے کی کوشش کی لیکن عجلان خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا اور اندر کی طرف بھاگا۔ عبدالعزیز اور اس کے ساتھی بھی اندر داخل ہو گئے۔ عجلان نے قلعے کی مسجد میں پناہ لینے کی کوشش کی لیکن شہزادے کے کزن عبداللہ ابن جلاوی نے تلوار کے ایک وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ (غالباً اسی خدمت کے صلے میں سعودی عرب کے مشرقی صوبے الاحساء کی گورنری آج تک عبداللہ جلاوی کے خاندان کے پاس ہے)

قلعے کے محافظوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ یہ سمجھے کہ کسی نے پوری فوج کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا ہے۔ اسی دوران خود عبدالعزیز نے قلعے کے مرکزی صحن میں کھڑے ہو کر با آواز بلند اپنا تعارف کروایا اور دھمکی دی کہ امیر عجلان کی موت کے بعد کسی نے مزاحمت کی کوشش کی تو نہ صرف بیکار ہو گی بلکہ خود اس کی جان کو خطرہ ہو گا چنانچہ سب لوگ ہتھیار ڈال دیں۔ محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انہیں ان کے کمروں میں بند کر دیا گیا۔ اس حملے میں رشیدیوں کے دس آدمی مارے گئے۔ سعودیوں کا کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ بارہ سال کی جلاوطنی کے بعد شہزادہ عبدالعزیز ابن سعود نے اپنا دارالحکومت واپس لے لیا تھا۔

عبدالعزیز ابن سعود کا حریف عبدالعزیز الرشید برابر کی چوٹ تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت بھی ضرب المثل تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھا مختلف سرداروں سے محو گفتگو تھا کہ ایک صحرائی بچھو اس کے کپڑوں میں گھس گیا اور اسے ڈنک مارنے لگا۔ کوئی اور ہوتا تو درد سے چلا اٹھتا اور اپنے کپڑے پھاڑ ڈالتا لیکن وہ پورے اطمینان سے بیٹھا سرداروں سے گفتگو کرتا رہا اور بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ کسی عذاب میں گرفتار ہے۔ جب اس کے تمام مہمان رخصت ہو گئے تب وہ اپنے کمرے میں گیا اور کپڑے اتار کر بچھو کو مارا۔

درعیہ اس کے لیے کچھ زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اگر وہ فوراً ہی کوئی مہم بھیجتا تو عبدالعزیز کو قدم جمانے کی فرصت نہ ملتی لیکن اس نے دشمن کو حقیر جانا اور اس قابل نہ سمجھا کہ اس طرف فوری توجہ دیتا۔ اس سے عبدالعزیز کو موقع مل گیا کہ وہ قلعے کی دیواروں کی مرمت کروا لے اور اپنا دفاع مضبوط کر لے۔ شہر کے لوگ بھی رشیدیوں سے زیادہ خوش نہ تھے۔ انہوں نے عبدالعزیز سے بھرپور تعاون کیا اور اس کا پورا پورا ہاتھ بٹایا۔ عبدالعزیز نے پہلا کام تو یہ کیا کہ قلعے کی دیواریں مرمت کروائیں۔ وہ خود گارا اور پتھر ڈھونے میں مزدوروں کی مدد کرتا رہا۔

دیواروں کی مرمت کروانے اور ریاض کے اردگرد اپنا کنٹرول قائم کرنے کے بعد عبدالعزیز اپنے خاندان کو بھی کویت سے واپس لے آیا۔ اس کے والد عبدالرحمٰن کے لئے یہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔ جو کام وہ اپنے دوستوں کی مدد سے نہ کر سکا تھا اس کے بیٹے نے اپنی قوت بازو کے بل پر ممکن کر دکھایا تھا۔ وہ بیٹے کے حق میں حکمرانی سے دستبردار ہو گیا اور محمد رحمتہ اللہ علیہ بن عبدالوہاب کی وہ تلوار جو سعودی خاندان کے اقتدار کی علامت تھی، عبدالعزیز کے حوالے کر

دی۔ ریاض پر ڈرامائی قبضے، کویت سے آل سعود کی واپسی اور انتقال اقتدار کی عوامی تقریب نے اردگرد کے قبائلی سرداروں کو یقین دلا دیا کہ رشیدیوں کی قسمت کا ستارہ روبہ زوال ہے۔ وہ جوق در جوق آئے اور عبدالعزیز ابن سعود کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ عبدالعزیز الرشید جب اپنی فوجوں کو لے کر حائل سے نکلا اور اپنے حریف کو سبق سکھانے چلا تو عبدالعزیز کو اپنے دارالحکومت میں واپس آئے نو ماہ گذر چکے تھے اور وہ اپنی پوزیشن اتنی مضبوط کر چکا تھا کہ اپنے حریف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

صحرائی جنگ چوہے بلی کے کھیل کی طرح ہوتی ہے۔ فریقین کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے حریف کو بے خبری میں جا لے یا اسے کسی ایسی جگہ محدود کر دیں جہاں سپلائی، خاص طور پر پانی کا حصول، ممکن نہ رہے۔ کھلے صحرا میں فوجوں کا چھپاؤ ممکن نہیں ہوتا کہ خانہ بدوش قبیلوں کے ذریعے خبریں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی رہتی ہیں۔ عبدالعزیز الرشید حائل سے نکلا تو مہینوں تک اس میں اور عبدالعزیز ابن سعود میں آنکھ مچولی ہوتی رہی اور بالآخر ۱۹۰۲ء کے آخر میں دلم کے مقام پر ان میں جھڑپ ہوئی جس کا حال ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ دلم کی لڑائی کے بعد عبدالعزیز الرشید کو احساس ہوا کہ ابن سعود سے نبٹنے میں تاخیر کر کے وہ کتنی بڑی غلطی کا مرتکب ہوا ہے۔ اس نے قسم کھائی کہ جب تک وہ ابن سعود کو زیر نہ کر لے حائل واپس نہیں جائے گا۔ اس کوشش میں جان جاتی ہے تو بھلی جائے۔

اس کے بعد بھی فریقین میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ الرشید شمالی علاقوں اور کویت کی سرحدوں پر مقیم قبائل پر حملے کر کے اپنا اثر و رسوخ بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران، جیسا کہ ہوتا آیا ہے۔ بہت سے قبائل ایسے تھے جو خاموشی سے یہ جنگ دیکھ رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ کوئی ایک فریق واضح کامیابی حاصل کر لے تو اس سے دوستی کی پینگیں بڑھائیں۔ کویت کے امیر شیخ مبارک کی حالت بڑی نازک تھی۔ اپنی دس سالہ میزبانی اور رفاقتوں کے ناتے اس کی فطری خواہش تھی کہ عبدالعزیز ابن سعود کو کامیابی حاصل ہو۔ دوسری طرف وہ خود عبدالعزیز الرشید کے خلاف فوجی مہموں میں حصہ لیتا رہا تھا اور اسے بجا طور پر خدشہ تھا کہ اگر وہ کامیاب ہوا تو اسے چین سے نہ بیٹھنے دے گا۔ چنانچہ اس کی کوشش تھی کہ دونوں سے دوستی کے رشتے قائم رکھے۔ بعض اوقات وہ دونوں کو بہ یک وقت ایک ہی

مضمون کے خط ارسال کرتا۔ ایک بار کلرک نے غلطی سے خط مختلف لفافوں میں بند کر دیے جس کی وجہ سے ابن سعود کا خط الرشید کو اور الرشید کا ابن سعود کو وصول ہوا۔ ابن سعود نے شیخ مبارک کی مجبوری سمجھتے ہوئے ماضی کی رفاقتوں کی خاطر بات قہقہوں میں اڑا دی۔

شیخ مبارک کی مجبوریاں اپنی جگہ' خود ابن سعود کے دفاع کے لیے ضروری تھا کہ کویت رشیدیوں کے ہاتھ نہ لگے چنانچہ اس نے اپنی فوجیں شمال کی طرف بھیج دیں۔ ریاض کو خالی جان کر الرشید نے درعیہ پر بھرپور حملہ کیا لیکن عبدالعزیز کے والد عبدالرحمن نے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔ الرشید کو ان تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو واپس لوٹ گیا ۱۹۰۶ء تک یہ آنکھ مچولیاں جاری رہیں۔ تب الرشید نے عبدالعزیز ابن سعود کو ایک خط لکھا کہ ہم دونوں کے لئے اس طرح کی لڑائیاں باعث شرم ہیں کہ دونوں طرف سے مسلمان شہید ہو رہے ہیں۔ آؤ ہم آپس میں ڈوئل لڑتے ہیں۔ جو جیت جائے' سب کچھ اس کا۔ عبدالعزیز جیسے شجاع آدمی کے لئے اس پیش کش میں بڑی کشش تھی لیکن پھر اس نے فراست سے کام لیتے ہوئے عربی بلاغت کا سہارا لیا اور لکھا'

"الرشید کی بہادری مسلمہ ہے لیکن اس بہادری کے مظاہروں کے درمیان وہ کئی بار یہ مظاہرہ کر چکا ہے کہ اسے اپنی ذات کی کوئی پرواہ نہیں جبکہ ابن سعود ابھی زندہ رہنا چاہتا ہے۔ اور جو زندگی کی خواہش رکھتا ہو اس کے لئے یہ بعید از عقل بات ہوگی کہ ایسے شخص سے لڑے جو مرنے کی خواہش رکھتا ہو۔ تمام معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اسی نے ان جھگڑوں کا بھی حتمی فیصلہ کرنا ہے"۔

جب دونوں عبدالعزیز صحرائی جنگ میں ایک دوسرے پر بھرپور ضرب لگانے کی تاک میں تھے تو ایک دفعہ ایسا ہوا کہ عبدالعزیز ابن سعود اپنی فوجوں کے ساتھ القصیم کے شمال میں فروکش تھا جب الرشید اسے گھیرے میں لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی فوجیں پہلے تو مغرب اور شمال مغرب میں تھیں جس کا بڑا حصہ وہ تیزی کے ساتھ مشرق کی طرف لے آیا اور عنیزہ کے جنوب مشرق میں ایسے صف آرا ہوا کہ اس کی فوج ابن سعود اور ریاض کے درمیان حائل ہو گئی۔ ابن سعود کی سپلائی لائن کٹ کر رہ گئی۔ صورت حال اتنی نازک تھی کہ زیادہ تر قبائلی جانیں بچا کر بھاگ نکلے۔ ابن سعود کے ساتھ صرف دو سو جانثار باقی رہ گئے جن کے پاس

سو اونٹ اور دس گھوڑے تھے۔ ابن سعود نے قبائلی سرداروں سے مشورہ کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رشیدیوں کے کیمپ سے بچتے بچاتے ریاض کی طرف نکلنے کی کوشش کی جائے۔ اس پروگرام پر عمل کرتے ہوئے جب وہ رات کو خاموشی سے جنوب کی طرف رواں تھے تو اچانک عبدالعزیز کو ایک جانب کچھ روشنی نظر آئی۔ اس نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ رشیدیوں کا کیمپ اس کے سامنے تھا۔ دن بھر کے تھکے ماندے سپاہی سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ابن سعود انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے جلدی چلنے پر اصرار کیا۔ ایک دو بے تکلف سرداروں نے اسے پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش بھی کی لیکن ابن سعود ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور لہجے میں عزم نو۔ وہ ٹیلے پر نہیں تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑا تھا اور تاریخ اپنے فیصلے فوجوں کی تعداد پر نہیں جرات و ہمت کے مظاہروں پر رقم کرتی ہے۔ ابن سعود نے کہا "دشمن بالکل بے خبر ہے۔ ہم سے غافل ہے۔ میں جب تک قسمت نہ آزمالوں' یہاں سے حرکت نہ کروں گا"۔ ساتھیوں نے کہا بھی کہ یہ خودکشی کے مترادف ہے لیکن ابن سعود کا ارادہ غیر متزلزل تھا"۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آیا کرتے اور میں یہ موقع ضائع نہیں کر سکتا"۔ اس نے فوراً ایک منصوبہ بنایا اس کے جانثار ساتھی اس شرط پر عمل درآمد پر تیار ہو گئے کہ ابن سعود اور قبائلی سردار خود کیمپ سے دور ایک محفوظ مقام پر چلے جائیں۔

دو سو آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ وہ ٹیلوں کی آڑ لیتے' رات کے پہریداروں سے بچتے ہوئے کیمپ کی مخالف سمتوں میں پہنچ گئے۔ آدھی رات کے بعد جب روشن الاؤ مدھم پڑ گئے' ہر سو سناٹا چھا گیا تو ایک پارٹی کیمپ میں داخل ہوئی۔ کیمپ کے درمیان ایک خیمے سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ پارٹی نے پہلے اسی خیمے کا رخ کیا۔ جب وہ خیمے کے نزدیک پہنچے تو ایک شخص خیمے سے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے قہوے کی کیتلی اٹھائے ایک خادم تھا۔ پارٹی کے افراد اپنی اپنی جگہوں پر منجمد ہو گئے لیکن اس دوران ابن سعود کے علمبردار سے علم چھوٹ گیا۔ علم کے ساتھ آرائشی زنجیریں اور دھات کے چھلے وغیرہ بندھے ہوئے تھے۔ گرنے سے جھنکار پیدا ہوئی تو خیمے سے نکلنے والے شخص نے ان کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا "ایسا نہیں کرتے الفرائخ"۔ الفرائخ عبدالعزیز الرشید کے علمبردار کا نام تھا۔ اندھیرے میں وہ یہی

سمجھا کہ اس کے اپنے علمبردار سے علم گر گیا ہے۔ اس کے تحکمانہ لہجے سے سعودیوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کون ہے۔ ایک سپاہی پکارا "الرشید کو ڈھونڈنے والو! یہی تو ہے تمہارا شکار"۔ سب یکبارگی اس پر ٹوٹ پڑے اس نے بھی تلوار سونت لی اور اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ چند لمحوں میں سعودیوں کی تلواریں اس کے خون میں نہا چکی تھیں۔ شور سے بہت سے آدمی جاگ گئے لیکن اس سے پہلے کہ انہیں سمجھ آتی کیا ہوا' کیمپ کے اردگرد ٹیلوں پر متعین دستوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دیتا تھا کہ کون کس پر حملہ آور ہے۔ ان کا لیڈر قتل ہو چکا تھا کوئی نہ تھا جو صورت حال کو سنبھالا دے سکے۔ کیمپ میں موجود سپاہیوں نے اپنے دفاع کے لئے اندھا دھند فائر کھول دیا اور خود اپنے ہی ساتھیوں کو لقمہ اجل بنانا شروع کر دیا۔ اس دوران سعودی پارٹی کے افراد عبدالعزیز الرشید کے ہاتھ سے اس کی مہروالی انگوٹھی اتار کر کیمپ سے کھسک لئے۔ وہ عبدالعزیز سعود کے پاس آئے اور اسے اس انگوٹھی کا تحفہ پیش کیا۔ ابن سعود حملے کی کامیابی کی خبر سن کر خوش تو بہت ہوا لیکن اس نے الرشید کے قتل پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو کہا جب تک وہ اس کا سر نہ کاٹ لائیں وہ ان کی بات کا یقین نہ کرے گا۔

اس کے جانثار ساتھی واپس آئے تو کیمپ پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف موت کا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رشیدیوں نے اپنے ساتھی تو کجا اپنے لیڈر کی نعش بھی دفن کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ افراتفری میں وہ جانیں بچا کر حائل کی طرف بھاگ گئے تھے۔ عبدالعزیز الرشید کی نعش بے گور و کفن پڑی تھی۔ شکست واقعی یتیم ہوتی ہے سعودیوں نے عبدالعزیز کا سر کاٹا اور لے جا کر ابن سعود کو پیش کر دیا۔ روضہ مخنی میں پیش آنے والے اس واقعے کے بعد ابن سعود کی راہیں کشادہ اور قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔

☆☆☆☆☆

درعیہ سے نکلے تو ابھی کافی دن باقی تھا۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اسی دن ظہران کے لئے روانہ ہونا تھا لیکن ریاض کے جنرل سٹور' بڑی بڑی مارکیٹیں' بھرے پرے بازار' بلند و بالا عمارتیں اور چہل پہل سعید کے دل میں کھب گئی تھیں۔ اس کا جی نہ چاہتا تھا ریاض سے ہلنے کو۔ اس کا دل رکھنے کو ہم شہر کی ایک دو مارکیٹوں میں ہو بھی آئے تھے لیکن شہر صرف ان دو

مارکیٹوں کا نام تو نہیں تھا نا۔ سعید کا کہنا تھا کہ پروگرام میں "تھوڑی" سی تبدیلی کر کے ریاض میں ایک دن کا قیام بڑھا دیا جائے۔ پروگرام میں تبدیلی کے لئے دو تہائی اکثریت کی تائید ضروری تھی جو حاصل نہ ہو سکی چنانچہ مسترد کر دی گئی۔

"ایرپورٹ تو دیکھتے چلیں۔ سنا ہے دنیا کا سب سے بڑا ایرپورٹ ہے"۔

سعید نے پروگرام میں ایک اور تبدیلی پیش کی۔

"یار تم گاؤں سے اٹھ کر سیدھے شہر آ گئے ہو۔ جہاز نہیں دیکھا تم نے کبھی؟" افضال نے بھرپور مخالفت کی

"بھئی جہاز میں بیٹھ کر ہی تو سعودی عرب آیا تھا"۔ ہم نے وضاحت کی۔

"سر! پہلی دفعہ بیٹھا تھا جہاز میں۔ اس وقت ڈر کے مارے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اب دیکھنا چاہتا ہے جہاز ہوتا کیسا ہے"۔

ہم نے دل رکھنے کو سعید کا ساتھ دیا اور افضال کو حکم دیا کہ چلو ایرپورٹ کی طرف۔ اس نے سارا غصہ ایکسی لیٹر پر نکالا۔ تھوڑی دیر میں ہم ائیرپورٹ پہنچ گئے۔

یوں تو سعودی عرب کے سبھی ائیرپورٹ معیاری ہیں لیکن ریاض کے فضائی مستقر کے کیا کہنے۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے مستقروں میں ہوتا ہے۔ ہر طرف شیشے کی دیوار ایک کونے میں کھڑے ہوں تو عمارت کے آخر تک کے حصے صاف دکھائی دیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں پہلا خیال یہ آیا "ان کے ہاں ہڑتالیں وغیرہ نہیں ہوتیں؟"۔

ہمارے ہاں اس طرح کی کوئی عمارت ہو' جس کے چاروں طرف شیشے ہی شیشے لگے ہوں تو ایک جلوس کی مار ہے۔ لیکن یہ سعودی عرب تھا جہاں ابھی تک تو کسی جلسے جلوس کا رواج نہیں لیکن مجلس شوریٰ کے نام سے ایک "نیم جمہوری" ادارے کی داغ بیل پڑ گئی ہے۔ آنے والے دنوں میں اگر وہاں سے بھی توڑ پھوڑ' شور شرابے' اٹ کھڑکے کی خبریں آئیں تو کسی کو حیرت نہ ہونی چاہیے کہ ہم بیچارے مسلمان مغرب سے جمہوریت کے نام پر جو چیز مستعار لیتے ہیں اس میں یہ چیزیں ناگزیر ہیں۔

تو شیشے کی عمارتیں تھیں اور شیشوں کے دروازے' ایسے کہ گذرنے والا پاس آئے تو خود بخود کھلتے چلے جائیں "کھل جا سم سم"۔ کہنے کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ گراؤنڈ فلور پر ایک

طرف چیک ان کے کاؤنٹر ہیں۔ درمیان میں اچھلتے ہوئے فوارے جن کا پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں بہتا دکھائی دیتا ہے اور پھر غالباً گھوم پھر کر دوبارہ فوارے میں استعمال ہو جاتا ہے۔ اردگرد پھولوں کی روشیں۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لئے خودکار سیڑھیاں۔ اس منزل کی ایک جانب مسافروں کی انتظار گاہ ہے۔ جس کے قریب ہی کیفے ٹیریا ہے کہ انتظار کی لذت سے نا آشنا لوگ، چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس یا دیگر مشروبات و ماکولات سے دل بہلا سکیں اور وقت کو Kill کر سکیں۔ دوسری جانب مختلف دروازے ہیں جن پر نمایاں انداز میں نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ مسافروں کے بورڈنگ کارڈوں پر لکھا ہوتا ہے کہ انہیں کون سا گیٹ استعمال کرنا ہے ان دروازوں کے باہر ایک سرنگ نما راستہ ہے۔ جس کے آخر میں کوئی جہاز کھڑا ہوتا ہے۔

اس منزل پر کھڑے ہو کر نیچے دیکھیں تو گمان گذرتا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی بنائی ہوئی کسی جنت میں آ گئے ہیں۔ سچی بات ہے کہ ہم جب پڑھتے تھے کہ جنت میں ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نیچے نہریں بہنے سے کیا مراد ہے۔ اگر تو وہ بلوچستان کی کاریز کی کوئی شکل ہو گی۔ تو جنتیوں کو ان کا کیا فائدہ کہ وہ تو نظروں سے پوشیدہ ہوتی ہیں اور اگر ہمارے شمالی علاقوں میں بہتے ہوئے گہرے دریاؤں، خوفناک نالوں کی کوئی شکل ہو گی تو یہ تو کوئی ایسا خوش کن منظر نہ ہوا جس کا لالچ دے کر انسان کو جنت کی تلاش پر مائل کیا جا سکے لیکن چونکہ ایمان کی بنیاد تو غیب پر ہے اس لئے ہم نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی کاریگری پر بھروسہ رکھا کہ اس نے جو باغات بنائے ہوں گے یقیناً اچھے ہوں گے، خوبصورت، خوش منظر------ ریاض ایئرپورٹ کی اوپر والی منزل پر جا کر کھٹ سے ہمارے ذہن میں جو بات آئی وہ یہی تھی کہ اچھا ایسے ہوں گے وہ باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی جیسے اس فوارے کا پانی ندیوں کی صورت بہہ رہا ہے۔ یہ تو پھر انسان کا بنایا ہوا ایئرپورٹ ہے جہاں صحرا کے برعکس ایک منظر پیدا کرنے کے لئے ان لوگوں نے چھوٹا سا باغیچہ لگانے کی کوشش کی ہے تو اللہ میاں نے تو بنائے ہی باغات ہوں گے۔ دیکھیں گے تو لکھیں گے ان پر بھی۔ پتہ نہیں جنت میں پریس وریس ہوں گے کہ نہیں، کتابوں کا کاروبار ہونا تو چاہیے، آخر لاکھوں کروڑوں برس کی زندگی کیسے گذرے گی کتابوں کے بغیر۔ کوئی اخباری سلسلہ بھی چاہیے ہو گا۔ ویسے اگر ایسا ہوا تو ہمارے پبلشر عبدالوحید سلیمانی بڑے مزے میں رہیں گے۔

ان کا دنیاوی تجربہ وہاں بھی کام آئے گا۔ جبکہ ان کے والد محترم اور بڑے بڑے علماء کو بے کار رہنا پڑے گا۔ ان کے والد محترم کو اس لئے کہ وہ تو حکیم تھے اور جنت میں بیماری، مصیبت، دکھ، درد کا تو کوئی تصور نہ ہو گا اور علماء اس لئے فارغ ہوں گے کہ جنت میں تو سب نیک ہی نیک ہوں گے۔ ویسے علماء کا پتہ بھی کوئی نہیں وہ نیکوں کو مزید نیک بنانے کے لئے کلوز سرکٹ ٹی وی پر خطاب کرنا چاہیں تو انہیں کون روک سکے گا۔ خیر چینل بدلنے کی سہولت تو ہو گی نا۔

یہ ہم نے کون سی فلائٹ پکڑ لی۔ واپس چلتے ہیں ریاض ایئرپورٹ۔ تو ہم کہہ رہے تھے کہ اسے دیکھ کر یہ گمان گذرتا ہے جیسے اللہ میاں کی بنائی ہوئی جنت میں آ نکلے۔ لیکن یہ خوش فہمی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی کہ یہاں کے دربان اور کارندے جنت کے نہیں، دوزخ کے داروغے لگتے ہیں۔ چہروں پر حماقتیں، رویوں میں بے نیازی، لہجے میں تلخی اور خشونت، بات یوں کرتے ہیں جیسے لٹھ مار دیا ہو۔ سعودی ایئرلائنز غالباً دنیا کی واحد ایئرلائن ہے جس میں کنفرم ٹکٹ کو بھی پرواز سے چوبیس گھنٹے پہلے پھر کنفرم کروانا پڑتا ہے۔ پھر مسافروں کو بھگتانے کا طریقہ بھی خوب ہے۔ لندن، پیرس، فرینکفرٹ اور کراچی جانے والے سبھی مسافر ملے جلے، مختلف قطاروں میں کھڑے ہیں۔ کراچی کی پرواز کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ قطار کسی کام چور چیونٹی کی رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کراچی کا ایک مسافر ہلکا سا ایک سفری بیگ اٹھائے کاؤنٹر سے پانچویں نمبر پر کھڑا ہے۔ اس سے پہلے کے مسافروں کی منزلیں مختلف ہیں۔ کاؤنٹر پر کھڑے مسافر کا سامان زیادہ ہے لیکن وہ زائد سامان کے پیسوں کی ادائیگی سے انکاری ہے۔ تکرار جاری ہے۔ کراچی کا مسافر قطار سے نکل کر کاؤنٹر پر آتا ہے اور وقت کی کمی کا احساس دلاتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلے فلاں پرواز کے مسافر کو فارغ کر لو۔ جواب ملتا ہے "مافی مشکل۔ تم قطار میں جا کر کھڑے رہو۔ ہاں مسٹر سمسن تم پیسے نکالو"۔

سمسن چونکہ گورا ہے اس لئے اس سے تکرار بھی ہو رہی ہے۔ کوئی رفیق ہوتا اس کا اٹیچی کیس اٹھا کر الگ پٹختے اور یلا یلا کہہ کر فارغ کر دیتے۔ آخر پی آئی اے کے کارکن کہیں سے نمودار ہوتے ہیں۔ ایئرپورٹ کے داروغوں سے مذاکرات کرتے ہیں اور پھر اچانک شور اٹھتا ہے کراچی والے سب مسافر ادھر آ جائیں، اس کاؤنٹر پر۔ سعودی کارندے مسافروں کو بھگتا رہے ہیں، ساتھ بڑبڑا رہے ہیں۔

"اس سے پہلے کہاں تھے۔ دو گھنٹے پہلے آنا چاہیے"۔

ایئرپورٹ دیکھنے کے بعد ہم ملٹری گیسٹ ہاؤس واپس آئے' سامان اٹھایا' دوستوں کو الوداع کہا۔ اور ظہران کے لئے روانہ ہو گئے۔ ریاض سے ظہران کا فاصلہ تقریباً ساڑھے چار سو کلومیٹر ہے۔ ریاض سے نکلتے نکلتے ہم نے کئی بورڈ دیکھے جن پر تیر کے ذریعے صحرا کے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ شہروں میں انسان بھٹک بھی جائے تو اپنے ہم جنس انسانوں سے پوچھتا پاچھتا منزل تک پہنچ ہی جاتا ہے لیکن صحرا تو انسانوں سے خالی ہوتا ہے۔ رہنمائی کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے۔ معلوم نہیں حکام نے صحرا میں ایسے بورڈ لگائے ہیں یا نہیں جن کی مدد سے بھٹکے ہوئے مسافر شہروں کی راہ پا سکیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ صحراؤں میں ایسے نشان نہیں ہوں گے۔ عرب صحرائی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ جفاکشی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کھلے آسمان تلے' کھلی فضاؤں میں محو سفر رہنا اور تاروں بھرے آسمان کے نیچے نرم ریت پر اس طرح سونا کہ ٹھنڈی ہوا انہیں تھپکیاں دیتی رہے' انہیں اچھا لگتا ہے۔ سعودیہ کے ہر حکمران کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہی رہا ہے کہ وہ اپنے لوگوں کو خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے شہروں میں آباد کرنے پر کیسے مائل کریں۔ چونکہ حکومت کی بہت سی سکیمیں' منصوبے خاص طور پر تعلیم کے بارے میں' تبھی کامیاب ہو سکتے ہیں جب حکومت کو ایک جگہ پر رہنے والے' ٹک کر بیٹھنے والے طلبہ' میسر آئیں۔

موجودہ بادشاہت کے بانی عبدالعزیز نے ۱۹۱۲ء میں ارطاویہ کے مقام پر ایک بستی بسائی۔ بدوؤں کو اونٹوں اور بہت سے دیگر تحفے تحائف سے نوازا۔ دین کی تبلیغ کے لئے علماء مقرر کئے۔ کافی کوششوں کے بعد یہ تجربہ کامیاب ہوا اور بستے بستے بہت سی بستیاں بسنے لگیں۔ محمد رحمۃ اللہ علیہ بن عبدالوہاب سے کئے گئے معاہدے کے مطابق ان بستیوں میں دین کی تعلیم کے لئے جو علماء مقرر کئے گئے وہ آل شیخ میں سے تھے چونکہ اسلام اخوت پر زور دیتا ہے' ان بستیوں کے لوگوں نے خود کو اخوان کہنا شروع کر دیا۔ اخوان بستیوں کی شکل میں ابن سعود کو یہ اطمینان بھی میسر آیا کہ خطرے کے وقت اس کے پاس ایسی قوت موجود تھی جسے وہ اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ یہ اخوان اپنے نظریات میں حماقت کی حد تک سادہ اور متشدد تھے۔ جدید زندگی کی سہولتوں سے متنفر تھے۔ مثلاً گھڑی کو شیطان کی ایجاد سمجھتے تھے کیونکہ قرآن میں اس

کا ذکر نہ تھا۔ کار' ٹیلیفون وائرلیس اور اسی طرح کی دیگر سہولتوں کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے تھی۔ ابن سعود کو ایک جدید ریاست استوار کرنے کے لئے ان کی ضرورت تھی لیکن خود اس کی بسائی ہوئی بستیوں کے لوگ ان چیزوں کے خلاف تھے۔ اور وہ اپنے نظریات میں اتنے پختہ تھے کہ بادشاہ وقت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وہ خود ٹخنوں سے اوپر عبائیں پہنتے تھے۔ ایک دفعہ ابن سعود مطائر قبیلے کے سربراہ فیصل الدوش سے ملنے گیا تو کچھ اخوان اس کی لمبی عبا دیکھ کر مشتعل ہو گئے۔ ان کے نزدیک یہ اسراف تھا اور غرور و تکبر کی علامت۔ ایک اخوانی ایک قینچی اٹھا لایا اور عین مذاکرات کے دوران اس نے ابن سعود کی قبا نیچے سے کاٹ دی۔

مکہ میں جدید سہولتیں حاصل تھیں۔ وہاں بجلی بھی تھی اور دیگر جدید سہولتیں بھی لیکن سعودی حکومت کا دارالحکومت ریاض' ان سہولتوں سے محروم تھا۔ جب مکہ میں ٹیلیفون تک کی سہولت میسر تھی' ریاض میں یہ حال تھا کہ ڈاک کا سرکاری انتظام ایک اونٹ اور اس کے خادم پر مشتمل تھا۔ بادشاہ مختلف امیروں کے نام جو خط لکھواتے وہ اس اونٹ پر بھیجے جاتے اور اسی ہرکارے کے ذریعے جواب آتے۔ ابن سعود نے مختلف حیلوں' بہانوں اور ترکیبوں سے اخوانیوں کو رام کیا۔ مثلاً اس نے ایک بار اس بات کا اہتمام کیا کہ ٹیلیفون اپنے دربار میں رکھوایا۔ جب گھنٹی بجی تو علیک سلیک کے بعد اس نے ریسیور اخوانی رہنماؤں کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے جب اسے کان سے لگایا تو انہیں قرآنی آیات کی تلاوت سنائی دی۔ وہ مان گئے۔ کہ اگر یہ شیطان کی ایجاد ہوتی تو قرآنی آیات سنائی نہ دیتیں۔

عبدالعزیز ابن سعود یہ بستیاں بسانے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خود یہ بستیاں اس کے لئے دردسر بن گئیں۔ اخوان دین کے ٹھیکیدار بنے شہر میں گھومتے رہتے تھے اور جسے بھی اسلام کی "خلاف ورزی" کرتا پاتے' وہیں اسے دھنک کر رکھ دیتے۔ کسی کی عبا لمبی دیکھتے تو کاٹ دیتے' کسی کی بے ہنگم مونچھیں دیکھتے تو کتر دیتے۔ نمازوں کے وقت ان کی موجودگی میں کسی کی جرات نہ تھی کہ دکانوں میں بیٹھا رہے۔

۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ ۲۰ رمضان کو ابن سعود کو خبر ملی کہ اخوان بستیوں میں سے عتیبہ اور مطائر قبیلے کی ایک فوج عراق پر حملے کے لئے تیار ہے۔ یہ دونوں قبیلے پہلے بھی عراقی بارڈر پر

چھیڑ چھاڑ کرتے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عراق میں بے دین انگریزوں کا غلبہ ہے اور انہوں نے عراقیوں کو بھی دین سے دور کر دیا ہے۔ بے دین لوگوں پر حملہ اور ان کے قبیلوں کی لوٹ مار اخوانیوں کے لئے جائز تھی۔ ۱۹۲۷ء کے ایک معاہدے کے مطابق عراق اور انگریز ابن سعود کو نجد اور حجاز کا حکمران تسلیم کر چکے تھے اور ان سرحدی حملوں پر سیخ پا کر ہو کر اس سے احتجاج کرتے تھے۔ ابن سعود لاکھ کہتا کہ یہ حملے اس کے ایما پر نہیں ہوئے لیکن دونوں ملکوں کے درمیان شکوک بڑھ رہے تھے۔ مطائر اور عتیبہ قبائل کے سربراہ فیصل الدوش اور ابن بیجاد کی یہی تدبیر تھی کہ لوٹ مار کر کے مال غنیمت تو وہ لوٹتے رہیں اور بدنامی ابن سعود کے حصے میں آئے۔ (انہیں ابن سعود کے خلاف ذاتی عناد بھی تھا کیونکہ حجاز کی فتح کے بعد ان کی خواہش تھی کہ انہیں مکہ اور مدینے کا گورنر مقرر کیا جائے' جو پوری نہ ہوئی) ان حملوں سے اگر عراق کی طرف سے بھرپور رد عمل ہوتا تو خطرہ تو ابن سعود کو تھا۔ اور یہی وہ چاہتے تھے۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں مطائر اور عتیبہ قبائل کی عراق کے خلاف تیاریوں کی خبر ملی۔ ابن سعود نے فوراً اپنے امیروں کو مدد کے لئے لکھا اور اچھی خاصی فوج اکٹھی کر کے فیصل الدوش اور ابن بیجاد کی سرکوبی کے لئے روانہ ہوا۔ ۳۰ مارچ ۱۹۲۹ء کو سبلا کے مقام پر جنگ ہوئی۔ اخوان ارطاویہ کی طرف بھاگ نکلے۔ ابن سعود نے تعاقب نہ کیا البتہ بعد میں ارطاویہ کا محاصرہ کر لیا۔ فیصل الدوش کا ایک قریبی رشتہ دار فیصل ابن شیلان سر پر گھاس رکھے یہ ظاہر کرتے ہوئے آیا کہ وہ ابن سعود کے گھوڑے کے لئے گھاس لایا ہے۔ ابن سعود کے کیمپ کے باہر اس نے گھاس کا گٹھا پھینکا اور ابن سعود کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ فیصل الدوش کے اہل خانہ آئندہ روز ابن سعود کے ہاں آئیں گے۔

عربوں کی روایت کے مطابق اس کا مطلب تھا کہ فیصل الدوش نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔ دوسرے روز اس کے اہل خانہ آئے۔ انہیں عزت و تکریم سے ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا اور تین دنوں کے بعد عزت کے ساتھ رخصت کر دیا گیا۔ پھر فیصل الدوش سے ملاقات ہوئی اسے ایک سٹریچر پر ڈال کر لایا گیا۔ پتہ چلا کہ سبلا کی جنگ میں وہ بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ مذاکرات کے دوران اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے کویت کی طرف جانے دیا جائے اور زاد راہ کا انتظام کیا جائے۔ عبدالعزیز کی دور رس آنکھیں بھانپ چکی تھیں کہ زخم مہلک ہے۔

فیصل الدوش چند دنوں کا مہمان تھا۔ جب گڑ سے مریں تو زہر کیوں دیں۔ ابن سعود نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی شرائط تسلیم کر لیں اور اسے کویت بھیجنے کا بندوبست کر دیا گیا۔ چند دنوں بعد ابن بیجاد بھی گرفتار ہوا جسے پابہ زنجیر ریاض بھجوا دیا گیا۔ بعد میں وہ ابن سعود کے وظیفے پر ریاض ہی میں رہائش پذیر رہا۔

یہ تو تھا ان بستیوں کا حال جو خود عبدالعزیز ابن سعود نے آباد کی تھیں' شاہ فیصل کے دنوں میں جدہ اور ریاض میں ہزاروں کی تعداد میں فلیٹ بنائے گئے اور بدوؤں کو دعوت دی گئی کہ وہ شہری سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان فلیٹوں میں رہائش پذیر ہو جائیں۔ ان کی بہت معمولی قیمتیں رکھی گئیں اور ان کی ادائیگی کے لئے بھی بنکوں سے بلا سود قرضوں کا اہتمام کیا گیا لیکن صحرا نشینوں کو قائل نہ کیا جا سکا۔ اب تک شاہ فہد کے دنوں میں بھی یہ فلیٹ خالی پڑے ہیں۔ خود شاہ فہد سال میں ایک ماہ صحرا میں گذارتے ہیں۔ اس دوران ان کا پورا سیکریٹریٹ صحرا میں ہی منتقل ہو جاتا ہے اور تمام امور مملکت وہیں سے چلائے جاتے ہیں۔

تو خالی فلیٹوں اور الطریق الی الصحرا کے بورڈوں کو تعجب سے دیکھتے ہوئے ہم ریاض سے نکلے اور چار گھنٹوں میں ظہران پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ سے کیپٹن سعید نے ایک دوست کو فون کیا جو کچھ دیر بعد ہمیں لینے پہنچ گیا۔ یہ افسر الخبر میں جہاز شکن ایک بیڑی میں تعینات تھا۔ ظہران سے الخبر دس کلو میٹر اور دمام اٹھارہ کلو میٹر ہے۔ چند منٹوں میں ہم الخبر پہنچ گئے۔ رات وہیں بسر کی۔

ظہران' خبر اور دمام' پنڈی اسلام آباد کی طرح قریب قریب ہی واقع ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ پنڈی سے اسلام آباد جانا ہو تو مری روڈ کراس کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے ہیں جبکہ ظہران' خبر اور دمام کے درمیان چوڑی چوڑی' دو رویہ' شفاف سڑکیں ہیں۔ منٹوں میں یہاں' منٹوں میں وہاں ----- تین شہروں کا یہ مجموعہ سعودی عرب کی خوشحالی کی بنیاد ہے۔ سعودی عرب کی سب سے بڑی تیل کمپنی آرامکو یہیں واقع ہے اور لاکھوں بیرل تیل یہیں سے پوری دنیا کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ سعودی عرب سے تیل نکلنے کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔

تیل کی کہانی

صحیح ترمذی کی ایک حدیث ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت اس وقت تک برپا نہ ہوگی جب تک جزیرہ عرب لہلہاتی چراگاہوں اور بہتے دریاؤں میں نہ بدل جائے۔

تیل کی دریافت کے بعد یہ حدیث پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے لیکن چودہ سو سال تک کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آتی تھی کہ عرب کے تپتے ہوئے صحرا کیوں کر سرسبز چراگاہوں میں بدل سکتے ہیں اور پیاس کے مارے سوکھے میدانوں میں دریا کیوں کر بہہ سکتے ہیں۔ تیل کی دولت نے اسے ممکن کر دکھایا ہے۔ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ ربع الخالی جیسے وسیع و عریض صحرا کو سعودی کس طرح زرعی میدانوں میں بدل رہے ہیں۔

تیل کی تلاش عبدالعزیز ابن سعود کے عہد میں شروع ہوئی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بادشاہ کو قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ سعودی عرب سے تیل بھی نکل سکتا ہے۔ گرچہ سعودی عرب کے پڑوس میں عراق اور ایران میں مسجد السلیمان کے قریب سے ۱۹۲۷ء سے تیل نکل رہا تھا۔ سعودی عرب میں تیل دریافت کرنے کی کوششیں ۱۹۲۳ میں شروع ہوئیں۔ جب نیوزی لینڈ کے ایک باشندے میجر ہولمز سے ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کے مطابق میجر ہولمز کی کمپنی کو مشرقی صوبوں کے ان تمام علاقوں میں تیل کی تلاش کی اجازت دی گئی جہاں سے آج کل تیل نکلتا ہے۔ یہ معاہدہ بیس سالوں کے لئے تھا اور ہر سال میجر ہولمز کی کمپنی نے ابن سعود کو دو ہزار پونڈ ادا کرنے تھے۔ جیسا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے عبدالعزیز کو تیل کی کوئی امید نہیں تھی لیکن وہ اس معاہدے پر خوش تھا کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ اس کے نزدیک بیرونی کمپنیوں نے اسے دو ہزار پونڈ سالانہ ادا کر کے یہی رپورٹ دینا تھی تاکہ سعودی عرب کے ریگزاروں میں تیل نہیں ہے۔ میجر ہولمز کی کمپنی نے دو سال تک تو ادائیگی کی لیکن پھر مایوس ہو کر کام چھوڑ دیا۔ مزید تین سالوں بعد عبدالعزیز نے معاہدہ منسوخ کر دیا البتہ تین

سالوں کا سالانہ کرایہ یعنی چھ ہزار پونڈ میجر ہولمز کی کمپنی کے ذمہ قرض واجب الادا یاد رکھا۔

۱۹۳۰ء تک اس سلسلے میں مزید کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ البتہ ایک امریکی بزنس مین چارلس کرین عبدالعزیز سے ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ دسمبر ۱۹۲۶ء میں اس نے جینوا سے ایک تار بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ وہ عربوں سے دلچسپی رکھتا ہے اور اجازت ہو تو وہ ابن سعود سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہو۔ امور خارجہ کے دفتر کو ہدایت کی گئی کہ وہ نرمی سے انکار کر دیں۔ انہوں نے جوابی تار بھیج دیا کہ ہز مجسٹی آنے والے حج کے سلسلے میں مصروف ہیں۔ اگلے سال کرین نے قاہرہ سے پھر ایک تار بھیجا۔ اس میں بھی صرف ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا وجہ ملاقات نہیں لکھی گئی تھی۔ یہ تار مکہ میں اس وقت وصول ہوا جب عبدالعزیز حج کے بعد ریاض لوٹنے والے تھے۔ جواب دیا گیا کہ عبدالعزیز ابن سعود ریاض جا رہے ہیں ملاقات کے لیے یہ وقت مناسب نہیں۔ کرین بصرہ پہنچا اور وہاں سے براستہ کویت نجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ کویت میں سفر کرتے ہوئے اس پر ایک قبیلے نے حملہ کر دیا جس میں اس کا ایک ساتھی مارا گیا۔ عبدالعزیز کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے۔ تاہم کرین کی مستقل مزاجی سے متاثر ہو کر انہوں نے اسے بلا لیا۔

کرین جنوری ۱۹۳۱ء میں جدہ پہنچا۔ اس کا بڑے پرتپاک طریقے سے خیر مقدم کیا گیا۔ اسے شیخ نصیف کے محل میں ٹھہرایا گیا جو اس سے پہلے ہمیشہ بادشاہ کے لئے وقف ہوتا تھا۔ عبدالعزیز خود جدہ اس سے ملنے گئے۔ کرین مارچ تک جدہ میں مقیم رہا اور شاعری کے انداز میں اس خوشحالی کا نقشہ کھینچتا رہا جو سڑکوں، پلوں، ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں کی شکل میں قائم کئے جاتے تھے بشرطیکہ تیل نکالنے کی سہولتیں دی جائیں۔ بادشاہ اس شاعری سے قطعاً متاثر نہ ہوا۔ اس کی مالی حالت پتلی تھی اور اس کی فوری ضرورت یہ تھی کہ بیرونی قرضوں کی ادائیگی اور اپنے درباریوں کی تنخواہیں دینے کے لئے اسے نقد رقم ادا کی جائے۔ کئی دنوں کے مذاکرات کے بعد طے یہ ہوا کہ کرین امریکہ جا کر ایک سرویر (SURVEYER) کو سعودی عرب بھجوائے گا۔ اس کی تنخواہ کرین کے ذمے رہے گی تاہم سعودی عرب میں اس کے قیام و طعام اور ٹرانسپورٹ کا انتظام عبدالعزیز ابن سعود کے ذمے ہوگا۔

دو ماہ بعد ایک سول اینڈ مائننگ انجینئر کارل ٹوئچل جدہ پہنچا۔ ڈیڑھ سال کی طویل جدوجد

کے بعد اس نے رپورٹ پیش کی جس میں ظہران میں تیل کے وسیع ذخائر کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ وہ خود یہ رپورٹ لے کر بادشاہ کے پاس گیا اور کرین کی طرح بڑے شاعرانہ انداز میں بتایا کہ تیل نکل آیا تو کس طرح سعودی عرب کے ریگزار خوبصورت شہروں اور باغوں میں بدلے جاسکیں گے۔ عبدالعزیز ابن سعود کو اگرچہ اس کی باتوں پر یقین تو نہ آیا البتہ اس رپورٹ کی ایک کاپی شہزادہ فیصل کے حوالے کر دی گئی جو ان دنوں برطانیہ کے دورے پر جارہے تھے۔ یہ رپورٹ برطانوی حکام کو دکھا کر انہیں تیل تلاش کرنے کی پیشکش کی گئی لیکن ان دنوں برطانیہ 'برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ پوری دنیا پر اس کی حکومت تھی۔ ان کی سلطنت پر کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ انڈیا کی شکل میں انہیں ویسے بھی سونے کی ایک چڑیا ملی ہوئی تھی۔ یہ پیشکش نرمی سے مسترد کر دی گئی۔

شاہ سعود نے ٹوچل کو پیشکش کی کہ وہ خود ایک کمپنی بنا کر تیل نکالنے کی کوشش کرے۔ اگر تیل نکل آیا تو دس فیصد منافع اس کا' اس نے انکار کیا تو منافع کی شرح پندرہ اور پھر بیس فیصد کر دی گئی لیکن تقدیر اس پر ہنس رہی تھی۔ وہ محض سروئیر رہنے پر مطمئن تھا۔ اتنا بڑا منصوبہ چلانا شاید اس کے بس کی بات تھی نہیں۔ تاہم اس نے وعدہ کیا کہ وہ رپورٹ اپنے ساتھ امریکہ لے جائے گا اور کسی کمپنی کو آمادہ کرے گا کہ وہ سعودی عرب آکر تیل کی تلاش کرے۔ جانے کے ایک ماہ بعد اس کا خط آیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ایک کمپنی سعودی عرب میں کام پر آمادہ ہے۔ اسے آنے کی دعوت دی گئی وہ کیلی فورنیا کی ایک کمپنی سٹینڈرڈ آئل کمپنی کے ایک نمائندے ملائیڈ ہملٹن کو ساتھ لے کر پہنچا۔ عین اس وقت برطانیہ کی ایک کمپنی کا نمائندہ لونگرگ اور میجر ہولمز بھی جدہ پہنچے اور انہوں نے سعودیوں سے مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ برطانوی نمائندوں کی طرف سے ایڈوانس کی پیشکش امریکیوں کے مقابلے میں بہت کم تھی اور میجر ہولمز کو تو ویسے ہی وزیر خارجہ نے ناقابل اعتبار آدمی قرار دے دیا---- اس نے میجر ہولمز کو نہ صرف گذشتہ معاہدے کے بقایاجات چھ ہزار پونڈ یاد دلائے بلکہ مزید مذاکرات کے لئے بھی دو لاکھ ریال کے برابر رقم بطور ضمانت جمع کروانے کی شرط رکھی۔ میجر ہولمز کو یہ خدشہ بھی تھا کہ کہیں اس کی ساری رقم گذشتہ معاہدے کے کھاتوں میں ڈال کر ضبط ہی نہ کر لی جائے۔ وہ دم دبا کر بھاگ گیا اور اس طرح صرف امریکن میدان

میں رہ گئے۔ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو جدہ میں سٹینڈرڈ آئل کمپنی کے نمائندے ہملٹن اور سعودی عرب کے وزیر خارجہ سلیمان کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے مطابق کمپنی نے ابتدائی طور پر تیس ہزار پاؤنڈ کا سونا بغیر سود کے قرض دیا۔ اٹھارہ مہینوں میں انہوں نے مزید بیس ہزار پونڈ کا سونا دینا تھا۔ سالانہ کرایہ پانچ ہزار پونڈ طے پایا اور جونہی تیل تجارتی مقدار میں نکلنا شروع ہوتا کمپنی نے پندرہ ہزار پونڈ سعودی عرب کو ادا کرنے تھے۔ یہ معاہدہ ساٹھ سال کے لئے طے پایا اور اس کے بدلے کمپنی کو الحساء کے علاقوں میں تیل کی تلاش کے حقوق دے دیے گئے۔

تیل کی ابتدائی تلاش ناکام رہی اور سوائے بادشاہ کے سب لوگ مایوس ہو گئے (بادشاہ کو کبھی تیل نکلنے کی امید تھی ہی نہیں) پھر ۱۹۳۵ء میں ظہران کے ایک کنویں سے تیل نکلا جس کے تجزیے نے وسیع ذخائر کی خبر دی۔ اور ۱۹۳۸ء میں تجارتی بنیادوں پر تیل نکلنا شروع ہوا۔ سٹینڈرڈ آئل کمپنی کو پہلے کیلیفورنیا عریبین سٹینڈرڈ آئل کمپنی کہا گیا اور پھر وہ نام دیا گیا جو پوری دنیا میں مشہور ہوا یعنی عریبین امریکن آئل کمپنی (ARAMCO) امریکی جہاں بھی جاتے ہیں' پہلے رہنے کے لئے رہائشی سہولتیں مہیا کرتے ہیں اور ان کی رہائشی سہولتیں صرف چار دیواروں والے کمروں پر مشتمل نہیں ہوتیں بلکہ ٹھیک ٹھاک مکانوں میں آرام دہ فرنیچر' تھک جائیں تو دل بہلانے کو تفریح کا سامان' تیراکی کے تالاب' جمنازیم وغیرہ ان کے نزدیک ضروریات زندگی ہیں۔ پاکستان میں بھی وہ تربیلا ڈیم بنانے آئے تھے تو ڈیم بنانے سے پہلے انہوں نے ایک رہائشی کالونی تعمیر کی تھی جسے وہ جاتے ہوئے ہمارے لئے چھوڑ گئے تھے۔ ہماری تمام تر غفلتوں کے باوجود یہ کالونی ابھی تک ٹھیک ٹھاک چل رہی ہے۔

ظہران' دمام اور الخبر سے تو سونا نکلتا تھا۔ سیال سونا۔ یہاں انہوں نے کیا کچھ نہ تعمیر کیا ہو گا۔ پتہ چلا امریکیوں نے اپنے لوگوں کے لئے جو بستی تعمیر کی ہے اس کا اپنا ٹی وی سٹیشن ہے چھوٹا سا۔ کلوز سرکٹ ٹی وی پر سارے دن ان کے اپنے پروگرام چلتے ہیں۔ دمام الخبر میں ویسے بھی خلیج کے تمام ممالک کے پروگرام صاف دکھائی دیتے ہیں جہاں سے انگریزی' مصری' اطالوی اور امریکی فلمیں بغیر سنسر کے نشر ہوتی ہیں۔

ہم نے پورا ایک دن سیر سپاٹے کے لئے رکھا ہوا تھا لیکن بلند و بالا عمارتوں کے بیچوں بیچ

واقع مار کیٹوں' بازاروں اور سبزہ زاروں میں گھومتے پھرتے' کیپٹن سعید کی نیت میں پھر فتور آرہا تھا۔ اس کا دل بے ایمان ہو رہا تھا۔ اس کا بعد کا سارا سفر بے کیف سا تھا۔ شہر کی رنگینیاں اور وہ بھی امریکیوں کی قربت میں' دامن سے لپٹ رہی تھیں۔ سعید پروگرام میں تبدیلی کی قرارداد کا حشر ریاض میں دیکھ چکا تھا اس مرتبہ اس نے نئی تدبیر اختیار کی۔ ظہران کی سڑکوں پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ گاڑی کی پک اپ یک دم کم ہو گئی ہے۔ اس کے ہسٹوں میں کہیں پانی تو نہیں آرہا لیک کر کے"۔

"کیا آ آ""؟ افضال پچھلی سیٹ پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ گاڑی کو ٹھیک حالت میں رکھنا اس کی ذمہ داری تھی۔ سعید نے اپنا بیان دہرایا۔ افضال نے بے چین ہو کر گاڑی رکوائی۔ بونٹ کھول کر انجن کو تاکا' ریڈی ایٹر کا پانی دیکھا۔ نارمل تھا۔ سوئچ آن کر کے ڈیش بورڈ پر جلتی بجھتی بہت سی بتیوں کو گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر سعید سے وضاحت چاہی کہ اسے یہ شک کیوں کر ہوا کہ کولنگ کا پانی لیک ہو کر ہسٹوں میں جا رہا ہے۔ (اگر انجن کھلوا کر چیک کرواتے تو پورا ایک دن جو چاہیے تھا)

"پک اپ بہت کم ہو گئی ہے" سعید نے جھلا کر کہا۔

لیکن پانی لیک ہو رہا ہوتا تو کم ہونا چاہیے تھا۔ ریڈی ایٹر میں پانی پورا ہے۔ دوسرے ٹمپریچر کی سوئی بھی نارمل ہے۔ افضال نے سٹیرنگ سنبھال کر خود ڈرائیونگ کرنا چاہی لیکن سعید نے گاڑی نہ دی۔

سرشام جب مکینیکل ورکشاپس بند ہو رہی تھیں تو سعید نے ایک اور خرابی کا سراغ لگایا "گاڑی کی الائنمنٹ ہونے والی ہے"۔

افضال پھر چونکا "تمہیں کیسا پتہ چلا"۔

"بریک لگاؤ تو گاڑی پل (Pull) کر رہی ہے" سعید نے اطمینان سے جواب دیا۔

تم سٹیرنگ چھوڑو۔ میں چلاتا ہوں گاڑی" سعید ڈرائیو کرتا رہا۔ رات کو جب اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو سعید نے آئندہ سفر کا ایک ہولناک سا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ فاصلے طویل تھے۔ ہماری آئندہ منزل تبوک تھی اور ظہران سے تبوک کا فاصلہ دو ہزار کلومیٹر سے بھی زائد ہے۔

پروگرام کے مطابق ہم نے علی الصبح پانچ بجے روانہ ہونا تھا سعید نے جو نقشہ کھینچا اس سے ہم تو متاثر ہو گئے تھے لیکن افضال کو اس میں صاف اپنی توہین کا پہلو نظر آرہا تھا چونکہ عدم اعتماد گاڑی پر کیا جا رہا تھا اور گاڑی کو ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری اس کی تھی۔

دوسرے دن صبح سویرے افضال اٹھا۔ اس نے ٹول بکس نکالا۔ گاڑی کے پلگ' پوائنٹ' ڈسٹری بیوٹر کھولے۔ سب چیزیں صاف کر کے پھر سے جوڑیں۔ ایئر کلینز اور آئل فلٹر جو ڈگی میں موجود تھے' بدل کئے۔ باقی گاڑی کو بھی ٹھوک بجا کر دیکھا اور ٹسٹ کے لیے لے گیا۔ واپس آیا تو سخت بھنایا ہوا تھا۔ سعید ابھی تک بستر سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ افضال پھٹ پڑا۔

"تم صاف کہو پینڈو کہ تمہارا دل نہیں بھرا شہر دیکھ دیکھ کر۔ گاڑی میں کوئی خرابی نہیں"۔

"تم کیا کر رہے تھے صبح صبح گاڑی کے ساتھ"؟ سعید نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے پلگ صاف کئے ہیں' ڈسٹری بیوٹر کھول کر پوائنٹ صاف کیا ہے"۔

"بس پھر ٹائمنگ بھی خراب کر دیے ہوں گے لیکن میں تو الائنمنٹ کی بات کر رہا تھا۔ تم پلگ کھول کر کیوں بیٹھ گئے۔ کچھ پتہ نہ ہو تو کسی سے پوچھ ہی لیتے ہیں"۔

"تم کل کہہ نہیں رہے تھے کہ پک اپ کم ہو گئی ہے" افضال دہاڑا۔

"وہ بیان تو میں نے واپس لے لیا تھا"۔

سعید نے بڑی مشکلوں سے بستر چھوڑا۔ ناشتے کے بعد اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کرنے گئے جو اب تک اپنے دفتروں کو جا چکے تھے۔ تیار ہو کر نکلے تو سعید کو شہر میں ایک ضروری کام یاد آگیا۔ غرض ایک مرتبہ تاخیر ہوئی تو پھر ہوتی چلی گئی۔ چار بجے تبوک کے لئے روانہ ہو سکے۔

جگمگاتے شہر اور عبرت کی بستیاں

ہم ایک نقشہ ساتھ لے کر چلے تھے جس پر اپنے سفر کا روٹ نشان زد کیا ہوا تھا اس سے پہلے تک کا سفر مصروف شاہراہوں اور مشہور شہروں کے درمیان تھا اس لئے نقشے کی زیادہ ضرورت نہ پڑی تھی لیکن اب ایک تو وقت تنگ ہو گیا تھا' دوسرے فاصلے طویل تھے۔ شہر سے نکلتے نکلتے ایک دو موڑ بھی غلط کاٹ لیتے تو کافی وقت ضائع ہوتا چنانچہ ہم نے نقشہ افضال کی گود میں پھیلا دیا گذشتہ رات تیار کردہ سفر کے اس حصے کا تفصیلی چارٹ بھی اسے تھما دیا جس میں چھوٹے چھوٹے قصبوں کے نام بھی دیئے ہوئے تھے۔ اس حساب سے ہمارا روٹ تھا دمام' ابوحدریہ' النعیریہ' الوریعہ' القیصومہ' حفر الباطن' الشعبہ' رفحہ' لوقہ' الدویہ' العوےقلیتہ' عرعر' عرعر سے بائیں مڑ کر سکاکہ' الجوف اور تبوک

راستے کے بڑے شہر بس دو تین ہی تھے القیصومہ' حفر الباطن اور عرعر لیکن نقشے کے مطابق ان بڑے شہروں سے چھوٹے چھوٹے قصبوں کے لئے بھی سڑکیں نکلتی تھیں۔ وقت ہوتا تو کوئی حرج نہیں تھا کہ ہم آڑے ترچھے روٹوں پر آوارہ گردی کرتے لیکن یہ وقت ہم ظہران اور دمام میں ضائع کر چکے تھے۔ اب ضرورت تھی کہ صراط مستقیم پر چلتے۔ افضال نے نیوی گیٹر کے فرائض دن دن تو بڑی اچھی طرح انجام دیئے لیکن رات ہوتے ہی وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ سعید پہلے ہی روٹھے ہوئے بچے کی طرح سو گیا تھا۔ رات تھی' تنہائی تھی' فراٹے بھرتی ہوئی گاڑی اور بالکل سیدھی سپاٹ سڑک۔ جب خیال آتا کہ ہم نے دس گیارہ گھنٹے ضائع کر دیئے ہیں۔ صبح پانچ بجے کی بجائے چار بجے شام نکلے ہیں تو ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ خود بخود بڑھ جاتا۔۔۔۔۔ ہم نے کئی دفعہ نوٹ کیا کہ سپیڈ و میٹر کی سوئی گاڑی کی رفتار دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ سے بھی اوپر دکھا رہی ہے احتیاطاً ہم گاڑی آہستہ کر لیتے لیکن روکنے والا تھا نہ کوئی ٹوکنے والا۔ سڑک بالکل صاف تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر۔ اس سپیڈ پر کسی نے پیچھے سے تو ہمیں کیا کراس کرنا تھا البتہ کبھی کبھار سامنے سے کوئی گاڑی آ جاتی جس کی روشنیاں

میلوں دور سے اپنے ہونے کا اعلان کر دیتیں اور ہم سپیڈ آہستہ کر لیتے۔ چھوٹے چھوٹے قصبے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اور ایک بڑی شاہراہ پر گامزن تھے جس نے ہمیں سیدھے قیصومہ لے جانا تھا۔ قیصومہ ابھی بہت دور تھا کہ اس کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔ یہ منظر ہم نے اور کہیں نہیں دیکھا کہ میلوں دور سے کوئی شہر یوں جگمگانے لگے۔ غالباً سڑک بلندی سے اتر رہی تھی۔ لیکن اس کی ڈھلان اتنی کم تھی کہ بالکل محسوس نہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی موڑ آتا بھی تو وہ اتنا لمبا چکر کاٹ کر مکمل ہوتا کہ سٹیرنگ کو بالکل ہلکا سا اشارہ دینا پڑتا۔ سپیڈ کم کئے بغیر موڑ کاٹ لیتے۔ ایسے میں یوں لگتا کہ ہم گاڑی نہیں کوئی ہوائی جہاز اڑا رہے ہیں کیونکہ پورا قیصومہ اپنی تمام تر روشنیوں کے ساتھ موڑ کی مخالف سمت میں جھول جاتا۔ ہم موڑوں کا انتظار کرتے' بائیں کو مڑتے تو قیصومہ دائیں کو سرک جاتا اور دائیں کو مڑتے تو بائیں طرف کو حرکت کرتا دکھائی دیتا۔ کبھی سڑک نشیب میں اتر جاتی یا کوئی چھوٹا موٹا قصبہ راہ میں آ جاتا تو قیصومہ نظروں سے غائب ہو جاتا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر جھلملانے لگتا۔ ہم تاریکی کا سینہ چیرتے قیصومہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دور سے اس کی روشنیاں بڑی تیز اور جگمگاتی ہوئی لگ رہی تھیں۔ جب اس کے اندر داخل ہوئے تو بڑی مدھم مدھم سے لگیں۔ پورا شہر سویا ہوا تھا۔ اکا دکا راہ گیر نظر آئے۔ وہ شہر جس سے کتنی دیر سے ہم آنکھ مچولی کھیلتے آ رہے تھے' خود' زن سے گذر گیا۔ بھوک لگی تھی۔ فیصلہ کیا کہ ڈنر کے لئے حفر الباطن رکتے ہیں۔ نو بجے کے قریب جب ہم تقریباً چھ سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کر چکے تھے حفر الباطن پہنچے۔ مدھم مدھم روشنیوں والے ایک ہوٹل پر رکے۔ ایسے ہوٹلوں پر عموماً پلاؤ نما چاول اور روسٹ چکن ہی ملتے ہیں لیکن افضال نے بتایا کہ شوربہ بھی ملتا ہے اور بہت لذیذ ہوتا ہے۔ ہم نے بتیرا یاد کیا لیکن شوربے کی عربی یاد نہ آئی۔ پوچھا تو افضال نے کہا "سر! فکر نہ کریں۔ آخر یہ شاگرد کب کام آئیں گے"۔ اس نے ویٹر کو بلایا اور بولا "اثنین رز (دو چاول) واحد و نص دجاجۃ (ڈیڑھ چکن) ثلاثۃ شوربہ (تین شوربے)"

ویٹر سر تسلیم خم کر کے چلا گیا۔ افضال نے چمچے سے گلاس بجاتے ہوئے عربی پر مزید قدرت کا اظہار کیا "عجل۔ عجل" (جلدی کرو' جلدی) پھر داد طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ "مان گئے بھئی" ہم نے داد دی۔

"سر! شاگرد کس کے ہیں"۔ افضال نے داد ہماری طرف لوٹا دی۔ پتہ چلا کہ اس نے تو شوربہ سعودی عرب آنے کے بعد ابتدائی دنوں ہی میں دریافت کر لیا تھا۔ ہم آج چکھ رہے تھے۔ آخری دنوں میں۔ کافی لذیذ تھا۔ کھانا کھا کر چلنے لگے تو ہم نے چابیاں افضال کی طرف بڑھائیں۔

"مجھے تو چاول کھا کر نیند آتی ہے۔ خطرہ ہے" اس نے معذرت کی۔

ہم نے سعید کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ پھاڑ کر جماہی لی۔ گویا اسے بھی نیند آ رہی تھی۔ چار و ناچار ہم سٹیرنگ پر جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر میں دونوں ساتھی واقعی سو گئے۔ اور ہم پھر اکیلے رہ گئے۔ ہلکی آواز میں ٹیپ ریکارڈ آن کیا۔ ابا کے گانے چل رہے تھے۔

ٹیک اے چانس آن می

عرعر، حفرالباطن سے کوئی ساڑھے پانچ سو کلومیٹر ہو گا۔ جب تک ہم تازہ دم رہے، گاڑی چلاتے رہے لیکن جب نیند کے ہلکورے آنے لگے اور ایک دو بار آنکھیں بند ہو گئیں تو ہم نے گاڑی روک لی اور ڈرائیور کی تبدیلی پر اصرار کیا۔ پہلے تو کوئی بھی تیار نہ ہوا لیکن جب ہم نے تجویز پیش کی کہ ڈگی سے نکالو کمبل باہر اور سڑک کنارے سو جاؤ۔ صبح چلیں گے تو افضال تیار ہو گیا۔ اس نے ڈگی سے پانی نکالا، منہ پر چھینٹے مارے اور سٹیرنگ سنبھال لیا۔ ہم نے اسے وارننگ دی کہ عرعر آیا ہی چاہتا ہے اس کے فوراً بعد بائیں مڑنا ہے سکاکہ کی طرف۔ ایسا نہ ہو کہ سیدھے چلتے رہو اور اردن پہنچ جاؤ۔ ہم نے احتیاطاً خود بھی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ کچھ دیر بعد آنکھ کھلی۔ وقت دیکھا تو افضال کو سٹیرنگ سنبھالے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس سے پوچھا کہ کیا وہ بائیں طرف موڑ کاٹ چکا ہے اس نے بتایا کہ نہیں وہ ناک کی سیدھ میں چلا جا رہا ہے۔ ہمیں شک گذرا کہ موڑ گذر چکا ہے۔ اتفاق سے ایک تھانہ آ گیا۔ اس کے قریب رکے، سکاکہ کا راستہ پوچھا تو پتہ چلا کہ واقعی پیچھے رہ گیا ہے۔ واپس آئے اور افضال کو سکاکہ کے راستے پر ڈال کر اتنا غفیل ہو گئے۔

جب ہم تبوک پہنچے تو صبح کے نو بجے تھے۔ گویا دو ہزار سے زائد کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے سترہ گھنٹوں میں طے کیا تھا جس میں کھانے اور چائے کا ایک ایک وقفہ بھی شامل تھا اس دوران ہم نے باری باری نیند بھی پوری کر لی تھی اور اب یہ ممکن تھا کہ ہم تبوک میں دوستوں سے مل

ملا کر پروگرام کے مطابق شام کو مزید شمال کی طرف حقل نکل چلیں۔ ریاض سے ہم نے کیپٹن غلام محمد کو فون کر دیا تھا اور اس نے ہمارے لئے ریسٹ ہاؤس میں بڑے آرام دہ اور خوبصورت کمرے بک کروا رکھے تھے۔ ملحقہ باتھ روم بھی بڑے نفیس اور کشادہ تھے جن میں غسل کر کے ہی ساری تھکن کافور ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ تبوک میں مقیم پاکستانی بریگیڈ کا حقل میں بھی ایک ریسٹ ہاؤس ہے جہاں پاکستانی افسر اکثر پکنک کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ سو ہم نے کیپٹن غلام محمد کی معرفت وہاں کا ریسٹ ہاؤس بھی ایک رات کے لئے بک کروا لیا۔

تبوک کا پرانا نام ایکہ تھا جو ایک قبیلے کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ قبیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطورا کے بطن سے تھی وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ جو سب سے زیادہ مشہور ہوا مدیان بن ابراہیم کی نسبت سے مدیانی یا اصحاب مدین کہلایا اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک، بحر قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ دوسرا قبیلہ جن میں بنی ددان زیادہ مشہور ہیں شمالی عرب میں تیماء، تبوک اور العلاء کے درمیان آباد ہوئے اور ان کا صدر مقام تبوک تھا جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے اور ان کے علاقے بھی ایک دوسرے سے متصل تھے بلکہ بعید نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد ہوں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطورا کی ان دونوں شاخوں کا پیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی ان دو بڑی شاہ راہوں پر آباد تھے جو یمن سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں ان شاہ راہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیمانے پر رہزنی کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لئے بغیر نہ گذرنے دیتے تھے۔ بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ اسی لئے سورہ اعراف میں انہیں تنبیہ ولا تقعدوا بکل صراط توعدون

(اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو (آج ہمارے ملک میں جو لوگ مسلمان ہو کر شاہراہوں پر مسافروں کو لوٹتے ہیں یہ آیت ان کے لئے بھی ہے) بنو قطورا کی ان دونوں شاخوں کی طرف حضرت شعیب مبعوث کیے گئے تھے۔

اصحاب الایکہ کا ذکر قرآن حکیم میں سورہ الشعراء میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ "اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جبکہ شعیب نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے۔ پیمانے ٹھیک بھرو اور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اس ذات کا خوف کرو جس نے تمہیں اور گذشتہ نسلوں کو پیدا کیا ہے"۔

انہوں نے کہا "تو محض ایک سحرزدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا اور ہم تو تجھے بالکل جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دے"۔ شعیبؑ نے کہا "جو کچھ تم کر رہے ہو' میرا رب اس سے بخوبی واقف ہے"۔ پس انہوں نے اسے جھٹلایا۔ آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا"۔۔

یہ تو تھا تبوک کے ماضی کا مختصر سا بیان جب اس جگہ کو ایکہ کہتے تھے۔ یہ واقعات مختلف مفسرین کی روایت کے مطابق ۶۰۰ ق م کے زمانے کے ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفس نفیس ۹ھ میں تیس ہزار کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے یہاں تشریف لائے اور بیس روز تبوک میں قیام فرمایا آپ کو یہاں تشریف لانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل حالات جاننا ضروری ہیں۔

صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے کے لئے جو وفود عرب کے مختلف حصوں میں بھیجے گئے تھے ان میں سے ایک شمال کی طرف شام کی سرحد پر مقیم قبائل کی طرف بھی گیا تھا جو زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ انہی میں بصریٰ کا حاکم شرجیل بن عمر غسانی تھا جو قیصر روم کی طرف سے اس علاقے کا صوبیدار تھا۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

و آلہ وسلم کے ایلچی حضرت حارثہ بن عمیر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سرکش غسانی سردار کی سرکوبی کے لئے ایک مہم روانہ فرمائی جس میں تین ہزار مسلمان شامل تھے۔ اس کی قیادت حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمائی اور کہا اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ لشکر کے سردار ہونگے۔ وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ سردار لشکر ہوں گے۔ اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر مسلمان جس کو چاہیں اپنا سردار بنا لیں۔

جب یہ لشکر شام کی سرحد کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ شرجیل بن عمرو نے مسلمانوں کے مقابلے کے لئے ایک لاکھ کا لشکر جرار تیار کر رکھا ہے۔ خود قیصر روم حمص کے مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے لیکن ان خوفناک اطلاعات کے باوجود تین ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر دستہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں کی طرف سے اس جنگ میں شریک ہو رہے تھے۔ موتہ کے مقام پر مسلمان جانبازوں کا یہ دستہ شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ دنیاوی نقطہ نظر سے تو مسلمانوں کو پس جانا چاہیے تھا لیکن سارا عرب اور شرق اوسط یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کے اس مقابلے میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ ایک دن کی لڑائی کے بعد انہوں نے راہ فرار اختیار کی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے کل بارہ ساتھی شہید ہوئے جن میں وہ تینوں سپہ سالار شامل تھے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مقرر فرمائے تھے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس حال میں شہید ہوئے کہ ان کا ایک ہاتھ کٹ گیا تو انہوں نے علم دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ بھی کٹ کر گر پڑا تو کٹے ہوئے بازوؤں سے علم سینے سے لگائے رکھا۔ اسی حال میں شہید ہوئے۔ تب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ نے علم تھاما۔ وہ شہید ہوئے تو حضرت ثابت بن اقرح رضی اللہ عنہ نے جھٹ آگے بڑھ کر علم اٹھا لیا اور بلند آواز سے کہا "مسلمانو! کسی ایک شخص کے امیر بننے پر اتفاق کر لو"۔

لشکریان اسلام کی طرف سے آواز بلند ہوئی۔ رضینابک۔ ہم تمہاری امارت پر راضی ہیں لیکن انہوں نے کہا "میں یہ کام نہ کر سکوں گا۔ تم خالد بن ولید کی سرداری تسلیم کر لو"۔ اتفاق

کی آوازیں بلند ہوئیں تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے علم تھام لیا اور اس خوبی سے دشمنوں پر پے در پے حملے کیے کہ رومیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔

اسی روز سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سیف اللہ کے نام سے پکارے گئے اور اسی جنگ سے حضرت جعفر بن ابی طالب حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ جنگ کے بعد ایک صحابی نے خواب دیکھا کہ حضرت جعفر جنت میں دو بازوؤں سے اڑتے پھر رہے ہیں۔ ایک روایت ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو خدائے تعالیٰ نے دو بازو مرحمت فرمائے ہیں جن سے وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں۔

جنگ موتہ کی ہزیمت کا انتقام لینے کے لئے دوسرے سال ہی قیصر روم نے شام کی سرحد پر زبردست فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ مسلمانوں کے لئے یہ انتہائی کڑا وقت تھا۔ تحریک اسلامی بدر کے میدان اور حنین کی گھاٹیوں سے گذر کر کامیابی کی منزلوں کی طرف گامزن تھی۔ اس موقع پر ذرہ برابر بھی کمزوری دکھائی جاتی تو سارا بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔ ایک طرف عرب کی دم توڑتی ہوئی جاہلیت، جس پر حنین میں آخری ضرب لگائی جا چکی تھی۔ پھر جی اٹھتی' دوسری طرف مدینہ کے منافقین' جو ابو عامر راہب کے واسطے سے غسان کے عیسائی بادشاہ اور خود قیصر روم کے ساتھ اندرونی ساز باز رکھتے تھے' مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچاتے۔ سامنے سے قیصر' جس کا دبدبہ ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد تمام دور و نزدیک کے علاقوں پر چھا گیا تھا' حملہ آور ہو جاتا اور ان تین زبردست خطروں کی متحدہ یورش میں اسلام کی جیتی ہوئی بازی یکایک مات کھا جاتی۔ خدا کے نبیؐ نے یہ دیکھ کر کہ یہ دعوت حق کے لئے زندگی اور موت کے فیصلے کی گھڑی ہے جنگ کی تیاری کا اعلان عام کر دیا

اس سے پہلے جب کبھی آپ فوجی مہم پر روانہ ہوتے تھے تو کسی کو نہ بتاتے تھے کہ کہاں کا عزم ہے لیکن اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صاف بتا دیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

وہ ابھی سے لوٹ جائیں جنہیں زندگی ہو پیاری

گذشتہ سال خشک سالی رہی تھی۔ مالی حالت سقیم تھی' اس سال فصل اور پیداوار اچھی ہوئی تھی۔ کھجور کے خوشے پک چکے تھے۔ فصلیں تیار تھیں۔ کاٹنے کا وقت آ چکا تھا۔ غربتوں کے سدباب کا وقت تھا جب ندا آئی کہ وقت جہاد ہے۔

جن کے دل ایمان سے لبریز تھے۔ وہ بھری فصلوں کو چھوڑ کر حاضر ہو گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لا کر پیش کر دیا اور حضرت ابو بکر نے ساری پونجی نذر کر دی۔ شہؐ انبیاء نے پوچھا "کچھ گھر والوں کے لئے چھوڑ آئے ہو؟" فرمایا "ان کے لئے خدا اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کافی ہے"۔

رجب ۹ھ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ۳۰ ہزار مجاہدین کے ساتھ شام روانہ ہوئے جن میں دس ہزار سوار تھے۔ اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ اس پر گرمی کی شدت اور پانی کی قلت ------ مگر جس عزم صادق کا ثبوت اس نازک موقع پر مسلمانوں نے دیا اس کا ثمرہ تبوک پہنچ کر انہیں نقد مل گیا۔ قیصر اور اس کے سرداروں نے مرعوب ہو کر اپنی فوجیں سرحد سے ہٹا لیں۔ ایک سال پہلے کی جنگ انہیں یاد تھی کہ تین ہزار مسلمان ایک لاکھ فوج سے ٹکرا گئے تھے۔ ان تیس ہزار سرفروشوں کی قیادت تو خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ جن کی موجودگی ہر مسلمان کے لئے قوت و عزیمت کا خزانہ تھی۔ غزوہ تبوک سے اردگرد کے قبائل میں مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ انہیں عرب پر اپنی گرفت مضبوط کر لینے کا پورا موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں اس واقعے نے ان لوگوں کی کمر توڑ دی جو اب تک جاہلیت قدیمہ کے بحال ہونے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

تبوک سے حقل کا فاصلہ دو سو پچیس کلومیٹر ہے۔ ہم ساڑھے تین بجے تبوک سے روانہ ہوئے اور سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے حقل پہنچ گئے۔ معمولی سی کوشش سے گیسٹ ہاؤس بھی مل گیا جو بحر احمر کے بالکل کنارے واقع تھا۔ ایک بابا یہاں متعین تھا جسے ہمارے بارے میں خبر مل چکی تھی اور وہ خود ہمارا منتظر تھا۔ اسے رات کے کھانے کے بارے میں ہدایات دے کر ہم سمندر کی سیر کو نکل گئے۔

نقشے پر بحر احمر کے شمال میں دیکھیں تو اوپر کی جانب یہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے بالکل جیسے خرگوش کے دو کان۔ دایاں کان خلیج عقبہ کہلاتا ہے اور بایاں خلیج سویز۔ بنی اسرائیل کی زیادہ تر

تاریخ اسی علاقے سے متعلق ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری زندگی سمندر کے انہی دو بازوؤں کے درمیان اور اردگرد کے علاقے میں اپنی قوم کو فرعون سے نجات دلانے اور پھر انہیں راہ راست پر لانے کی کوششوں میں گذر گئی۔ تفہیم القرآن کے پبلشر محترم خالد فاروق مودودی کی اجازت سے تفہیم میں شائع شدہ ایک نقشہ قدرے اضافہ کے ساتھ یہاں دیا جا رہا ہے جس سے قارئین کو اس علاقے اور یہاں پیش آنے والے واقعات سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

حضرت یوسف علیہ اسلام کا قصہ تو معروف ہی ہے۔ ان کے بھائیوں نے جب انہیں ایک اندھے کنویں میں ڈال دیا تھا تو ایک قافلے کے کسی شخص نے انہیں وہاں سے نکالا اور مصر میں لے جا کر بیچ دیا۔ مختلف نشیب و فراز سے گذرتے وہ وہاں اقتدار پر فائز ہو گئے۔ ایک بار سخت قحط پڑا۔ لوگ ایک ایک دانے کو ترس گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے حسن انتظام سے غلہ ذخیرہ کر لیا تھا۔ کنعان سے ان کے بھائی بھی غلہ لینے ان کے پاس آتے۔ دوسرے تیسرے پھیرے میں پہچانے کہ تخت پر متمکن تو ان کا وہ بھائی ہے جسے وہ اندھے کنویں میں گرا گئے تھے۔ تب حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے سلوک کو درگذر کرتے ہوئے تمام بھائیوں اور اپنے والد کو مصر ہی میں بلوا لیا اور انہیں جشن میں آباد کیا۔ عرصہ دراز تک تو انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کا ہم وطن اور ان کے قریبی عزیز ہونے کے باعث عزت کی نگاہ سے دیکھا گیا لیکن پھر جہالتوں نے سر اٹھایا' قومیت کے فتنے کھڑے ہوئے اور انہیں "مہاجر" قرار دیتے ہوئے نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم غلام بن کر رہ گئی۔ ان کے تمام اہل مرد تمام دن مصریوں کے محل اور بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ پانی کھینچتے تھے' اینٹیں اور پتھر ڈھوتے تھے' گارہ بناتے تھے۔ چنائی کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

ایک مرتبہ فرعون مصر نے ایک خواب دیکھا۔ دربار میں بیان کیا تو اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر اسے یہ بتائی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہو گا جو اس کے تخت کے لئے خطرہ بنے گا۔ تب فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل کے ہاں پیدا ہونے والے تمام لڑکے قتل کئے جائیں اور لڑکیوں کو زندہ رکھا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی والدہ نے انہیں ایک پنگھوڑے میں لٹا کر دریائے نیل میں چھوڑ دیا۔ فرعون کی بیوی نے اپنے محل سے

کہ ایک دریا کے کنارے واقع تھا' پنگھوڑا دیکھا اور کنیزوں کے ہاتھوں منگوا لیا۔ بچہ خوبصورت لگا' بے اولاد تھی' اسے اپنی پرورش میں لے لیا۔ یوں فرعون ہی کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پروان چڑھے۔ ان دنوں ممفس (Memphis) فرعون کا دارالحکومت تھا۔

ایک دفعہ ایک بازار سے گذر رہے تھے کہ اپنے ایک ہم قوم کو ایک قبطی سے لڑتے ہوئے پایا۔ اس کی حمایت میں قبطی کو ایک گھونسہ رسید کیا تو وہ جان ہار بیٹھا۔ جب بات پھیلی اور خدشہ ہوا کہ موسیٰ کو قتل کے کیس میں دھر لیا جائے گا تو وہ مصر کو چھوڑ کر مدین کی طرف نکل گئے جو فرعون کی مملکت کی حدود سے باہر تھا۔ البدع پہنچے تو تھک کر چور ہو چکے تھے۔ یہ پورا واقعہ قرآن میں انتہائی اختصار لیکن خوبصورتی کے ساتھ بیان ہوا ہے سورہ قصص میں یوں وارد ہے۔

جب موسیٰ نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا "امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا"۔ --------- اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے ان عورتوں سے پوچھا "تمہیں کیا پریشانی ہے؟" انہوں نے کہا "ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں۔ اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں۔ (اس لئے ہم خود آتی ہیں اور اس دھکم پیل میں تو ہم پانی نہیں نکال سکتیں" یہ سن کر موسیٰ نے (جو ایک صحت مند اور توانا آدمی تھے۔ تبھی تو ان کے ایک پنچ سے قبطی ڈھیر ہو گیا تھا) ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا۔ پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھا اور بولا پروردگار! میرے لئے اگر تو نے کوئی خیر نازل کیا ہے تو (آج) میں اس کا محتاج ہوں (کچھ دیر نہ گذری تھی کہ) ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لئے (جانوروں کو) جو پانی پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں۔ موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا "کچھ خوف نہ کرو' اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو"۔

ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا "ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ

لیجئے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہو سکتا ہے جو قوی ہو اور امانت دار ہو"۔ اس کے باپ نے (موسیٰ علیہ السلام سے) کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم انشاء اللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا' یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دوں اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو اور جو کچھ قول و قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے"

جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کر دی اور اپنے اہل و عیال کو لے کر چلے تو طور کی جانب سے اس کو آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا' ٹھہرو' میں نے ایک آگ دیکھی ہے شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو"۔ وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا"۔ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں' سارے جہان والوں کا مالک اور تو اپنی لاٹھی (زمین پر) پھینک دے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا (ارشاد ہوا) موسیٰ پلٹ اور خوف نہ کر' تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال' چمکتا ہوا نکلے گا' بغیر کسی تکلیف کے اور خوف سے بچنے کے لئے اپنا بازو بھینچ لے۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رب کی طرف سے' فرعون کے اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لئے' وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں............"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت ملنے کے بعد مصر لوٹے۔ فرعون کے دربار میں پہنچے اور اسے خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہوئے اپنی قوم کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ عرصے تک موسیٰ اور فرعون کی کشمکش جاری رہی۔ بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام رعمیس سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلے۔ راستے میں بنی اسرائیل ہر طرف سے سمٹ کر اپنے مال اسباب سمیت ان سے آ کر ملتے چلے گئے۔ بحیرات مرہ تلخ پانی کی وہ کھاڑیاں ہیں جو آج تو خلیج سویز سے ذرا فاصلے پر واقع ہیں مگر قدیم زمانے میں سمندر یہاں تک وسیع تھا۔ بعد میں وہ سمٹا تو بحیرات مرہ الگ رہ گئیں۔

موجودہ بحیرات مرہ کے کسی مقام سے انہوں نے سمندر کو عبور کیا جو خدا کے حکم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے پر دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سمیت پار جا نکلے اور فرعون یہاں غرق ہو گیا۔ فرعون کی لاش ہزاروں برس تک ایک معمہ بنی رہی کیونکہ قرآن میں مذکور ہے کہ اس کے غرق ہوتے وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا "آج ہم تیرا بدن محفوظ کر لیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لئے نشان عبرت بنے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں (سورہ یونس آیت نمبر ۹۲) یہ آیت تو قرآن میں موجود ہے لیکن دنیا میں اس کی نعش کا کوئی سراغ نہ ملتا تھا آخر اس صدی کے آغاز میں ۱۹۰۲ء میں فرعون کی لاش حمام فرعون کے مقام پر پانی میں تیرتی ہوئی ملی۔ ہزاروں برس تک اسے مچھلیوں نے کھایا نہ کسی اور سمندری مخلوق نے منہ لگایا۔ وہ سڑی نہ گلی۔ خود مغربی محققین نے تحقیقات کر کے یہ بیان جاری کیا کہ یہ اسی فرعون کی لاش ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تعاقب کرتے ہوئے سمندر میں غرق ہوا تھا۔ آج کل اس کی لاش مصر کے ایک عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل مارہ' ایلیم' المرخہ اور فاران رفیدیم کے راستے اس مقام تک پہنچے جسے آج کل جبل موسیٰ کہتے ہیں اور جس کا قدیم نام سینا ہے' اسی کا نام طور ہے اور اسی کی وادی کو "وادی مقدس طویٰ" بھی کہا گیا ہے۔ طور کے نام سے آج کل جو بندرگاہ جزیرہ نمائے سینا میں پائی جاتی ہے اس سے مراد کوہ طور نہیں ہے بلکہ یہ طور کی بندرگاہ ہے۔

المرخہ اس علاقے کے سرے پر ہے۔ جس کا نام بائبل میں "بیابان سین" لکھا ہے یہیں سے بنی اسرائیل پر من و سلویٰ کا نزول شروع ہوا۔

رفیدیم کے قریب حورب کی وہ مشہور چٹان واقع ہے۔ جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا مارا تھا اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے لئے بارہ چشمے پھوٹ نکلے تھے دشت تیہ وہ علاقہ ہے جس میں بنی اسرائیل چالیس سال تک بھٹکتے رہے۔ عقبہ اردن کی مشہور بندگاہ ہے اور اس سے بالکل قریب اسرائیل نے ایلہ کے نام سے ایک بندرگاہ بنائی ہے۔ جس کا قدیم عبرانی نام حسیون جابر تھا۔ یہیں اصحاب السبت کا مشہور واقعہ پیش آیا۔

اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی امت میں عبادت کے لئے جمعہ کا دن مقرر فرمایا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں یہود بنی اسرائیل نے اپنی روایتی کج روی کی بناء پر حضرت موسیٰ سے یہ اصرار کیا کہ ان کے لئے ہفتے کا دن "عبادت و برکت" کا دن مقرر کیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ہدایت فرمائی کہ وہ اپنے غلط اصرار سے باز آ جائیں اور ملت ابراہیمی کے اس امتیاز کو جو خدائے برتر کے نزدیک پسندیدہ و مقبول ہے' ہاتھ سے ضائع نہ ہونے دیں۔ تاہم ان کے اصرار کے نتیجے میں جمعے کی سعادت و برکت ان سے واپس لے لی گئی اور ہفتہ ان کے لئے عبادت کا دن مقرر کیا گیا لیکن شرط یہ عائد کر دی گئی کہ وہ ہفتے والے دن سوائے عبادت کے کوئی اور کام نہ کریں گے۔ خرید و فروخت' زراعت و تجارت' شکار یہاں تک کہ ملازموں سے خدمت لینا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ قرآن عزیز نے بھی مختصر الفاظ میں اس اختلاف کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے ہفتے میں عبادت کے لئے ایک دن مخصوص کرنے کے متعلق اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا تھا۔ سورہ نحل میں ارشاد ہے "بے شک سبت کا دن ان لوگوں کے لئے (عبادت کا دن) مقرر کیا گیا جو اس کے متعلق جھگڑا کرتے تھے اور یقیناً تیرا رب ضرور قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا کہ جس کے متعلق وہ اختلاف کرتے تھے' اس میں حق کیا تھا اور باطل کیا"۔

اب ہوا یوں کہ شروع شروع میں تو بنی اسرائیل اپنے روز عبادت کی عزت و حرمت میں خدا کے عہد و پیمان پر قائم رہے مگر آہستہ آہستہ ان احکامات کی خلاف ورزی شروع کر دی اور اگرچہ شروع میں یہ خلاف ورزی انفرادی اور خفیہ طریق پر ہوتی رہی مگر آہستہ آہستہ اس نے علی الاعلان جماعتی حیثیت اختیار کر لی۔ تب خدا کے عذاب نے ان کو آ پکڑا اور وہ ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی تھی۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لئے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا اور وہ اس کو بہت محبوب مشغلہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادت الٰہی میں صرف کرتے۔ جانوروں میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے دفاع کی حس رکھی ہے چنانچہ مچھلیاں چھ روز تو پانی کی تہہ میں پوشیدہ

رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتیں بلکہ اچھل کود بھی کرتیں جنہیں دیکھ دیکھ کر یہود کے دل للچاتے رہتے۔ کچھ دنوں تک تو یہود اس حالت کو صبر آزما طریقے پر دیکھتے رہے آخر رہ نہ سکے اور ان میں سے بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے بہانے ایجاد کر لیے جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اور سبت کے دن مچھلیوں کی کثرت سے فائدہ بھی اٹھالیں۔

بعض تو یہ کرتے کہ جمعے کی شام کو سمندر کے قریب گڑھے کھود لیتے اور سمندر سے ان گڑھوں تک نالیاں بنا لیتے۔ سبت کے روز جب مچھلیاں سطح آب پر کثیر تعداد میں نمودار ہوتیں تو نالیوں کا راستہ کھول دیتے مچھلیاں پانی کے بہاؤ کے ساتھ گڑھوں میں بھی آ جاتیں۔ جب سبت کا دن گذر جاتا تو اتوار کی صبح کو وہ گڑھوں میں سے مچھلیاں پکڑ لیتے۔

بعض یہ کرتے کہ جمعے کے روز سمندر میں جال اور کانٹے لگا آتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے۔

ان حرکتوں پر ان کی قوم کے علماء حق نے سخت اعتراض کیا اور انہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن جب وہ باز نہ آئے تو انہیں بندر اور خنزیر کی شکلوں میں مسخ کر دیا گیا۔ قرآن میں سورہ بقرہ' سورہ اعراف' سورہ مائدہ' اور سورہ نساء میں اس واقعے کا ذکر ملتا ہے۔

کھجور کے درختوں تلے ایک بنچ پر بیٹھے ہم دور' ان جہازوں کو دیکھ رہے تھے جن کے صرف ہیولے سے نظر آ رہے تھے۔ اور جو اردن کی بندرگاہ عقبہ یا اسرائیل کی بندرگاہ ایلات پر لنگر انداز ہونے کے لئے کھلے سمندر میں کھڑے تھے۔ ساتھیوں کو اردگرد علاقوں کے یہ واقعات سنائے تو افضال نے ایک بڑا سا پتھر لے کر سامنے سمندر میں دے مارا۔

"بہت تہاڈی ایسی تیسی"۔

"یہ کیا بھئی افضال؟"۔

"سر! مچھلیوں کو مارا ہے"۔

"کیوں؟"۔

"انہوں نے مروا دیا بنی اسرائیل کو"۔

"کیسے؟"۔

"سر! یہ ہفتے والے دن آرام نہیں تھیں کر سکتیں؟ نہ یہ اچھل اچھل کر باہر آتیں' نہ ان کے دل للچاتے نہ وہ یہ حرکتیں کرتے"۔

"تم جب سمجھنا' الٹ ہی سمجھنا"۔ سعید نے ٹوکا۔

تم چپ رہو جی! یہ تاریخی مسائل ہیں۔ بڑے نازک' خواہ مخواہ دخل مت دو"۔ افضال نے جھڑک دیا۔

"تم تاریخی واقعات پر بات کرنے کے مجاز کب سے ہو گئے؟"

"کیوں؟ تاریخ تو میری گھڑی میں بند ہے۔ روز بدلتی ہے۔ اس طرح سے میں خود ایک تاریخ ساز شخصیت ہوں"۔ افضال نے بڑے اعتماد سے کہا۔

سعید اور افضال کی بحث اس وقت تک جاری رہی جب تک ہم واپس آکر کھانا کھا کے سو نہیں گئے۔ صبح سویرے اٹھے۔ دیکھا' سعید بستر سے غائب ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو تیز ہوا چل رہی تھی۔ سمندر کی پر شور لہریں سمٹ سمٹ کر آتی تھیں اور کنارے سے ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں۔ سعید ایک کمبل لپیٹے ایک بڑے پتھر پر بیٹھا سمندر کا نظارہ کر رہا تھا۔ افضال کو بھی اٹھایا۔ سورج طلوع ہونے تک ہم باہر ہی بیٹھے رہے۔ لہروں کی چھینٹوں میں بھیگتے رہے۔ پھر آکر بھرپور ناشتہ کیا۔ تیار ہوئے اور ریسٹ ہاؤس کے بابا کا زبانی اور کچھ عملی شکریہ ادا کرتے ہوئے مغائر شعیب کی طرف روانہ ہو گئے مغائر غار کی جمع ہے اور مغائر شعیب اصحاب مدین کی اس بستی کے آثار ہیں جہاں حضرت شعیب علیہ السلام مقیم تھے۔ مفسرین نے اصحاب مدین کا زمانہ ۲۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۰۰۰ قبل مسیح تک متعین کیا ہے۔ شمال سے آتے ہوئے مغائر شعیب سڑک کی دائیں جانب پڑتے ہیں۔ ذرا فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر وہ کنواں ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے پہلی بار آنے پر پہنچے تھے اور جہاں انہوں نے دو لڑکیوں کی بکریوں کو پانی پلایا تھا۔ اس کنویں کے قریب ہی سے نالیاں گذر کر ایک تالاب تک جاتی ملیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان نالیوں کے ذریعے تالاب میں پانی بھرتے ہوں گے تاکہ مویشی سیراب ہو سکیں۔

مغائر شعیب سے گذرتے ہوئے ہم بحر احمر کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چلے جا رہے

تھے۔ الوجہ پہنچے تو رک گئے۔ ہماری اگلی منزل مدائن صالح تھی جو الوجہ سے بائیں ہاتھ بمشکل سو سوا سو کلومیٹر ہو گی نقشے پر باقاعدہ سڑک نہ تھی جو ان دو جگہوں کو آپس میں ملاتی۔ سڑک تو ہمیں سیدھی جنوب کی طرف لئے جا رہی تھی۔ جو ینبوع سے کہیں جا کر بائیں مڑتی تھی اور مدینہ منورہ جاتی تھی۔ وہاں سے ہمیں پھر شمال کی طرف چلنا پڑتا۔ خیبر اور العلا سے ہوتے ہوئے مدائن صالح آتے۔ یہ دس گنا زیادہ فاصلہ تھا اور تقریباً ایک ہزار کلومیٹر بن رہا تھا۔ کہاوت تو یہی ہے کہ راہ راست برو گرچہ دور است (سیدھے راستے پر چل چاہے دور ہی کیوں نہ ہو) لیکن سیدھا راستہ کچھ زیادہ ہی دور لگ رہا تھا۔ ہمیں اپنی نقشہ دانی پر بھرپور اعتماد تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس جو نقشہ تھا اس میں الوجہ اور مدائن صالح کے درمیانی علاقے میں سوائے صحرا کے اور کچھ نہیں دکھایا گیا تھا۔ اس کا ایک سیدھا سادا مطلب تو یہ تھا کہ یہ سارا علاقہ غیر آباد تھا' اس میں کوئی پٹرول پمپ تھا نہ ہوٹل نہ ریستوران۔ سو سوا سو کلومیٹر کی تو بات تھی اس میں کون سا گاڑی کا پٹرول ختم ہو جانا تھا اور ڈگی میں رکھا آئس بکس ٹھنڈے مشروبات سے بھرا ہوا تھا۔ اگر راہ بھٹک بھی جاتے تو زیادہ سے زیادہ ایک دو گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی۔ لیکن ایک ہزار کلومیٹر کا "پینڈا" تو بچتا نظر آ رہا تھا۔ نقشہ پھیلاتے ہوئے ہم نے مطالعاتی دورے کی سہ فریقی اعلیٰ اختیاراتی کونسل کے سامنے اپنی تجویز پیش کی "کیوں نہ الوجہ سے بائیں مڑ جائیں۔ ہے تو صحرا لیکن وقت بچے گا" افضال اور سعید بھی آخر ہم جو تھے۔ تجویز پر عمل کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت تھی لیکن یہ متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ البتہ یہ طے پایا کہ مقامی لوگوں سے یہ معلوم کر لیا جائے کہ ریت نرم ہے یا سخت۔ ہماری گاڑی گذر جائے گی یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ریت اتنی نرم ہو کہ گاڑی اس میں دھنستی چلی جائے۔ جس سے پوچھا اس نے حیرت سے ہمیں دیکھا "کیا باؤلے ہوئے ہو؟ میاں سیدھے سیدھے رستے جاؤ"۔ "یار: تم یہ بتاؤ کہ ریت نرم ہے یا سخت؟" "ریت سخت کہاں ہوتی ہے' نرم ہی ہوتی ہے"۔

زیادہ تر لوگوں نے صحرا میں نہ گھسنے کا مشورہ دیا۔ ایک دو ایسے بھی تھے جنہیں ہمارے صحرائی راستہ اختیار کرنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہی سے تقویت حاصل کرتے ہوئے ہم نے اللہ کے بھروسے پر گاڑی کا رخ صحرا کی طرف موڑ دیا اور مین روڈ کو چھوڑ کر ریت میں اتر گئے

ابھی سو گز بھی نہ گئے ہوں گے کہ اچانک کہیں سے پولیس کی ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ شور مچا مچا کر ہمیں روکا گیا۔ اب جو تفتیش شروع ہوئی ہے تو پولیس کو یہ یقین دلانا مشکل ہو گیا کہ ہم علم کے متلاشی لوگ ہیں۔ مطالعاتی سفر پر نکلے ہیں۔ وہ ہمیں سمگلر نما کوئی چیز سمجھ رہے تھے۔ لیکن جب گاڑی کی تلاشی لینے پر کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی تو وہ خود ٹھنڈے پڑے۔ ہم نے نشان زدہ نقشے دکھا کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمارے سفر کی غرض و غایت کیا ہے۔ تب انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ اس راستے پر ریت کی ایسی ایسی دلدلیں ہیں کہ پوری کی پوری گاڑی اس میں دھنس کر غائب ہو جاتی ہے واپس سڑک پر آئے اور براستہ ینبوع مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شہر میں وارد ہوئے۔ پروگرام کے مطابق تو ہمیں شمال کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے تھا لیکن سعید کا کہنا تھا کہ جو تھوڑی بہت رات باقی رہ گئی ہے' اس میں آرام کیا جائے اور فجر کی نماز پڑھ کر آگے چلا جائے۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ ایک مرتبہ لیٹ جاتے تو اٹھا نہ جاتا اس لئے ہم نے اصرار کیا کہ سفر جاری رکھا جائے--- سعید نے ٹھہرنے کو ترجیح دی چنانچہ ایک ہوٹل میں کمرہ لیا سامان اور سعید کو وہاں چھوڑا اور ہم مدائن صالح کی طرف روانہ ہو گئے۔ خیبر اور العلا سے گذرتے ہوئے جب ہم مدائن صالح پہنچے تو دھوپ اچھی طرح پھیل چکی تھی۔

مدائن صالح' اہل ثمود کی ایک بستی ہے۔ یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جسے عاد کے بعد عروج عطا کیا گیا۔ قرآن مجید میں یہ بات سورہ الاعراف آیت ۷۴ سے واضح ہوتی ہے "تمہیں عاد کے بعد جانشین بنایا گیا"۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ قوم عاد کی تباہی کے بعد جو لوگ باقی بچے انہوں نے شمال کا رخ کیا۔ ان میں سے کچھ لوگ موجودہ مدائن صالح کی جگہ پر آ کر آباد ہوئے اور ترقی کرتے کرتے خوش حالی کی اعلیٰ ترین بلندیوں تک جا پہنچے مگر اس کی تمدنی ترقی نے بھی بالآخر وہی شکل اختیار کر لی جو عاد کی ترقی نے کی تھی یعنی معیار زندگی بلند سے بلند تر اور معیار آدمیت پست سے پست تر ہوتا چلا گیا۔ ایک طرف میدانی علاقوں میں عالی شان قصر اور پہاڑوں میں مکان بن رہے تھے دوسری طرف معاشرے میں شرک و بت پرستی کا زور تھا اور زمین ظلم و ستم سے

لبریز ہو رہی تھی۔ قوم کے بدترین مفسد لوگ اس کے لیڈر بنے ہوئے تھے۔ اونچے طبقے اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں سرشار تھے۔

مدائن صالح کو ایک نظر دیکھنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ ان میں امیر اور غریب کا فرق بہت زیادہ تھا۔ ایک طرف تو بڑے بڑے، کھلے کمروں والے ایسے ایسے مکان ہیں کہ پورے پہاڑ میں بس ایک ہی گھر تراشا گیا ہے۔ اس کے دائیں بائیں کا پہاڑ خالی پڑا ہے۔ اور اوپر دو ڈھائی سو فٹ تک پہاڑ کو کاٹ کر اور رگڑ رگڑ کر ہموار کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں امارت کے مزید اظہار کے لئے گھروں کے اوپر والے حصے پر پھول بوٹے اور نقش و نگار بھی بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس ان چودھریوں، نوابزادوں اور خان صاحبوں کے محلات سے ہٹ کر ذرا فاصلے پر جو گھر بنے ہوئے ہیں وہ صاف کیوں، کمینوں کے گھر لگتے ہیں ساتھ ساتھ بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے، ڈربے نما، بس پہاڑ کے اندر اتنے تراشے گئے کہ ان میں گزارہ کر سکیں۔ باہر سے وہی بے ہنگم پہاڑ کہیں کہیں کوئی بیل نظر آئی۔ یوں لگتا تھا کہ اصل سنگ تراش اور ماہر کاریگر تو یہی تھے لیکن ان کی ساری توانائیاں، سب کاریگری اپنے بڑوں کے بڑے گھر بنانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ اس شہر خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہو گی۔ نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گذرا کرتے تھے۔ اور بچہ بچہ ان کی تباہی و بربادی کے حال سے واقف تھا۔ نبی ﷺ غزوہ تبوک کے موقع پر جب ادھر سے گذرے تو آپ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثار قدیمہ سے ہر صاحب بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپ نے ایک کنویں کی نشان دہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ اور مسلمانوں کو ہدایت کی کہ صرف اسی کنویں سے پانی لینا، باقی کنووں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپؐ نے بتایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لئے آتی تھی۔ وہ مقام آج بھی فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔

سورہ شعراء آیت (۱۵۴ تا ۱۵۸) سے معلوم ہوتا ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا جو حضرت صالح علیہ السلام کے نبی ہونے پر کھلی دلیل ہو چنانچہ معجزے کے طور پر اونٹنی کا ظہور ہوا لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ معجزے کے بعد کوئی حجت باقی نہیں رہ

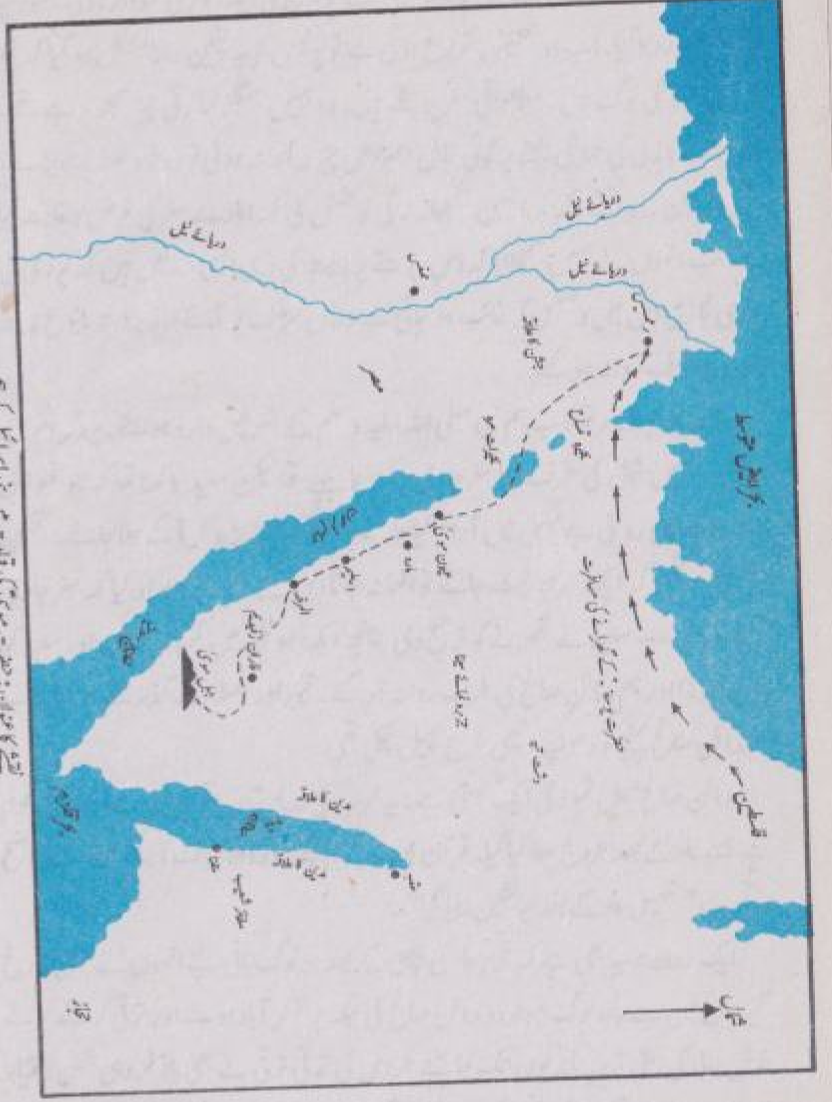

نقشہ جس میں حضرت موسیٰ کی قیادت میں بنی اسرائیل کی ہجرت

جاتی۔ پھر بھی لوگ احکام الٰہی سے روگردانی کریں تو اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے چنانچہ اونٹنی کی معجزانہ پیدائش کے بعد حضرت صالح نے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی معلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں پر چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ اکیلی پانی پئے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پئیں گے اور تم نے اسے بری نیت سے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ چنانچہ کافی مدت تک یہ لوگ اس کی آزادانہ چلت پھرت' اس کے کھیتوں کے چرنے اور اس بات کو کہ ایک دن تنہا وہ پانی پئے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پئیں' بادل نخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کردیا۔ سورہ اعراف میں ہے۔

"پھر انہوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور پوری سرکشی کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گذرے اور صالح سے بولے کہ اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے تو لے آوہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے۔ آخرکار ایک دہلا دینے والی آفت نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے کے پڑے رہ گئے۔ اور صالحؑ یہ کہتے ہوئے ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ "اے میری قوم میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی مگر تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں"۔

مدائن صالح سے مدینہ منورہ واپس پہنچے تو ظہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ ہم وضو کر کے مسجد میں چلے گئے۔ تکبیر کے وقت سعید کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ پچھلی صف میں وہ نظر پڑا اور ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔ کیپٹن سعید خوش لباس شخص تھا۔ ہر وقت پتلون قمیص میں ملبوس نظر آتا۔ پتلون کی کریز تلوار کی دھار کی طرح شارپ ہوا کرتی۔ کبھی کبھار شلوار قمیص پہن لیا کرتا مگر کم' بہت ہی کم۔ اور اب وہ ایک توپ پہنے کھڑا تھا۔ ڈھیلا ڈھالا' بغیر استری شدہ چغہ۔ مسجد سے باہر آئے تو اس کا خوب ریکارڈ لگایا۔

"یہ تنبو کہاں سے چرایا؟" افضال نے استفسار کیا۔

"شاپنگ کی ہے" سعید نے فخر سے بتایا۔

"اتنا مقدس شہر ہے اور دنیا جہاں کی نعمتیں یہاں ملتی ہیں۔ تمہیں اور کچھ نہیں ملا"۔

"اس میں کیا حرج ہے؟"۔

"کوئی حرج نہیں۔ چلو اسے اتار کر ڈگی میں رکھو۔ آئندہ میلے کپڑے اس میں رکھا کریں گے"۔ افضال نے فیصلہ سنایا۔

سعودی عرب میں ہمارے قیام کی مدت ختم ہوا چاہتی تھی مدینہ منورہ میں حاضری کا یہ آخری موقع تھا اس لئے رخصت کی اجازت لینے کے لئے اہتمام سے مسجد نبوی میں گئے۔ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہوئے۔ ہم جس مطالعاتی سفر پر نکلے تھے اس کی ابتدا بھی یہی تھی' انتہا بھی۔ ابتدا یوں کہ جو تاریخی بستیاں دیکھنے نکلے تھے ان کے بارے میں صحیح صحیح اطلاعات خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فراہم کی تھیں۔ آپؐ ہی نے بتایا تھا کہ ان بستیوں کو سیر و تفریح کی غرض سے نہ دیکھا جائے بلکہ عبرت کے نمونے کے طور پر یاد رکھا جائے۔ غزوہ تبوک کے موقعے پر جب آپ مدائن صالح سے گذرے تو آپ نے چہرے پر کپڑا لٹکا لیا' ناقہ کو تیز فرما دیا اور صحابہ کرام کو تاکید فرمائی کہ کوئی شخص ان کے کسی مکان میں داخل نہ ہو' سوائے اس کنویں کے جہاں سے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی پانی پیتی تھی' کہیں سے پانی نہ لیا جائے' جن حضرات نے لاعلمی سے پانی لے لیا تھا یا اس سے آٹا گوندھ لیا تھا' ان کو حکم ہوا کہ وہ پانی گرا دیں اور وہ آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور وہاں سے تیز تیز گذر جائیں ------ اور انتہا یوں کہ مختلف بستیوں کے حوالے سے جن انبیاء کرام کا ذکر آیا وہ وہی پیغام لے کر آئے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ ہر آنے والا پیغمبر اپنی امت' اپنی قوم کو اپنے بعد ایک نبی کے آنے کی بشارت دیتا رہا اور یہ سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر ختم ہوا اس لئے آپ نے خود کو خاتم النبین قرار دیا۔

سیروا فی الارض کے قرآنی حکم کا منشا یہی ہے کہ نبی خاتم النبین کی ہدایات کی روشنی میں رب کائنات کی معرفت حاصل کی جائے۔ انسان کے نفس اور کائنات میں جو نشانیاں بکھری ہوئی ہیں' ان کی مدد سے خدا کو پہچانا جائے اور اس نے جو پیغام اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں کی رہنمائی کے لئے رہتی دنیا تک بھیجا' اسے سمجھا جائے' پھیلایا جائے۔

جنٹل مین بسم اللہ

جنٹل مین الحمدللہ

جنٹل مین اللہ اللہ

کے بعد کرنل اشفاق حسین

کے شگفتہ قلم سے

جنٹل مین! سبحان اللہ

قیمت

۲۲۵/-

ادارہ مطبوعات سلیمانی
رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور